راجہ گدھ

بانو قدسیہ

☆

یہ تیسرے پیریڈ کا واقعہ ہے

ایم اے کی ساری کلاس حاضر تھی۔لڑکیاں ہم سے اگلی قطار میں بیٹھی تھیں۔۔۔۔

۔ان چولستانی ہرنیوں میں وہ سب سے آخری تھی۔۔۔۔ اکتوبر کا دن تھا جس طرح

بھٹی سے نکل کر مکئی کے دانے سفید پھولے ہوئے بڑے اور ٹھنڈے نظر آتے ہیں

ایسے ہی اکتوبر کا یہ دن تھا، بڑا پھولا ہوا اور سفید۔۔۔اس سے پہلے کے تمام دن بھٹی

دیدہ گرم تھے۔لیکن یہ دن سفید سفید دھوپ میں کچھ پھولا پھولا بڑا بڑا نظر آتا تھا۔

کچھ دنوں میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ گھڑیوں کے تابع نہیں رہتے اپنی گنجائش اور

سمائی کے مطابق گزرتے ہیں

پروفیسر سہیل نے نئی کار جیسی اس لڑکی کی طرف نظریں اٹھا کر سوال کیا۔"اپنا

تعارف کرائیے!"

داخلے کے دن سے لے کر اب تک ہم اس کے نام کے متعلق کئی قیافے لگا چکے

تھے۔چولستانی ہرنی اٹھی اس نے کرسی پر ایسے بازو رکھا جیسے موٹر سائیکل کے سہارے

کھڑی ہو۔

"سر میرا نام سیمی شاہ ہے، میں نے کنیرڈ کالج سے بی اے کیا ہے اور میرے

سبجکٹ سائیکولوجی اور ہسٹری تھے۔"

پہلی مرتبہ تمام طلبا اپنے آپ کو باقی کلاس سے باضابطہ طور پر متعارف کرا رہے

تھے، اس سے پہلے فرزانہ، انجیلا، طیبہ اور کوثر تعارف کرا چکی تھیں۔لیکن یہ تمام لڑکیاں

چہرے مہرے اور لباس سے ایسی لگتی تھیں، جنہوں نے اخباری کاغذوں پر چھپے ہوئے

نوٹس رٹ رٹ کر بی اے کیا ہو۔کوثر کے علاوہ ان لڑکیوں کی جنرل نالج اور علمی

استعداد کورس کی کتابوں تک محدود تھی۔

کوثر حبیب اور سیمی شاہ ہماری کلاس کی آنکھیں تھیں۔جگمگاتی روشن۔۔۔ذہین

سے بھری ہوئی۔ لیکن کوثر حبیب متاثر کرنے سے پہلے بیک گیئر لگاتی تھی۔ پسپا کرنے سے پہلے خود ہار جانے کی عادی تھی۔ اس کے جسم اور ذہن کی بناوٹ ہی ایسی تھی، جیسے بہت خوبصورت بلب روشن ہو، لیکن بار بار بجلی کا فیوز اڑ جانے کی وجہ سے روشنی میں تواتر نہ رہے

اور سیمی شاہ؟۔۔۔۔

وہ گلبرگی معاشرے کی پیداوار تھی۔ اس وقت اس نے موری بند جینز کے اوپر وائل کا سفید کرتہ پہن رکھا تھا۔ گلے میں حمائل مالا نما لاکٹ ناف کو چھو رہا ہے۔ کندھے پر لٹکنے والے کینوس کے تھیلے میں غالباً نقدی، لپ سٹک، ٹشو پیپر تھے۔ ایک ایسی ڈائری تھی، جس میں کئی فون نمبر اور برتھ ڈے کے دن درج تھے ایک دو ایسے قیمتی پن بھی شاید موجود ہوں گے جن میں سیاہی نہ ہونے کی وجہ سے وہ بال پوائنٹ مانگ کر لکھا کرتی تھی اس کے سیاہ بالوں پر سرخ رنگ غالب تھا۔ اکتوبر کے سفید دن کی روشنی میں اس کے بال آگ پکڑنے ہی والے تھے۔ وہ بالکل میرے سامنے تھی اور اگر میں چاہتا تو اس کے کندھوں پر سلیقے سے جمے ہوئے بالوں کو چھو سکتا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح اس کے کرتے کے نیچے سے اس کی باڈس کا الاسٹک، ہک اور اوپر جانے والی طنابوں کو دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گیا۔

بھری پستول سے کبھی میں اس طرح خائف نہیں ہوا۔

لڑکوں کی قطار میں پہلا لڑکا آفتاب تھا

جب سیمی شاہ اپنا تعارف کروا چکی تو آفتاب اٹھا، امریکی فلموں کا چڑھتا سورج آہستہ آہستہ۔۔۔۔۔ موسیقی اور لے کے ساتھ۔۔۔۔۔ روشن کرتا ہوا۔۔۔۔۔ گرمی پھیلاتا ہوا۔۔۔۔۔ اس سکس ملین ڈالر مین نے بھاری آواز میں کہا۔۔۔۔۔ "میرا نام آفتاب بٹ ہے سر۔ میں اس کالج کا ہی اولڈ سٹوڈنٹ ہوں آپ مجھے خوب جانتے ہیں سر۔"

پروفیسر سہیل نے اپنی آنکھوں پر سے چشمہ اتار کر کہا ۔۔۔ "لیکن تمہارے ہم جماعت شاید تمہیں نہیں جانتے۔"

آفتاب نے پہلے لڑکیوں کی قطار پر کرنیں ڈالیں پھر ڈسکس پھینکنے والوں کی طرح تھوڑا پاؤں پر گھوما اور لڑکوں کو مخاطب کر کے بولا ۔۔۔ "پچھلے سال میں یونین کا صدر تھا۔ بی اے میں میرے سبجکٹ سایکالوجی اور سوشیالوجی تھے۔ میں اگر خود پسندی اور فلموں کا شوقین نہ ہوتا تو شاید بی اے میں ٹاپ کرتا۔ لیکن مجھے فسٹ نہ آنے کا کچھ خاص افسوس بھی نہیں ہوا کیونکہ جو لڑکی پنجاب میں فسٹ آئی ہے وہ مجھ سے نوٹس لے کر پڑھتی رہی ہے ویسے میری Reputation والدین کے خوف سے اور اللہ کے فضل سے اچھی ہے۔"

ساری کلاس ہنس دی۔ لڑکوں میں سے کسی دل جلے نے نعرہ لگایا۔ "میاں مٹھو میاں مٹھو ۔۔۔"

تعارف جاری رہا ۔۔۔

پانچ لڑکیوں اور پندرہ لڑکے جب تعارف کروا چکے تو فضا حالات زندگی اور ناموں سے بوجھل ہو چکی تھی۔ شاید اس کے بعد کلاس ختم ہو جاتی اور جمائیاں شروع ہوتیں لیکن اس کے بعد ڈاکٹر سہیل نے میز پر سے چاک اٹھایا۔ بلیک بورڈ پر ایک بڑا سا سر بڑی بڑی مونچھیں چھوٹے دھڑ اور بڑے بڑے بوٹوں والا ایک کامک فگر بنایا۔ پھر اس کی آنکھوں پر چوکور فریم کی عینک پہنائی۔ فریاد کے انداز میں پھیلے ہوئے بازو کھینچے ۔۔۔ اور نیچے لکھا۔

"اٹ از می ۔۔۔ ڈاکٹر سہیل ۔۔۔ میں آپ کو شاید سوشیالوجی پڑھاؤں گا۔"

بلیک بورڈ پر تصویر بنانے والا پروفیسر ہم سے بمشکل پانچ چھ سال بڑا تھا لیکن کہیں اس کے پاس ایک ایسا ہنٹر موجود تھا جو شیروں کو سدھارنے والے استعمال کرتے

ہیں اسے کبھی کورس پڑھانا نہ آیا۔ لیکن وہ ذہنوں کا جوڈو کھیلنا جانتا تھا۔ نظریات کی کشتی کرانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ اپنے شاگردوں کی کھوپڑیاں کھولنا اور خالی پا کر انہیں جوں کی توں بند کر دینا اسے جی سے پسند تھا۔ الی ہوئی زبانیں آزاد کرا کے طوطے کی طرح باتیں کرانا اور ریڈیو کی مسلسل زبان بولنے والوں کو چپ کرانے کا فن بھی صرف اسے آتا تھا خوب آزادی برتتا اور ہر طرح کی آزادی دیتا۔ کوئی بات کبھی اسے شاک نہ کر سکی سوشیالوجی کے ساتھ ساتھ اسے دنیا کا ہر سبجکٹ آتا تھا۔ اسی لیے اس کی موجودگی میں فضا تعلیمی تصنع سے ہمیشہ پاک رہتی اور طالب علم ایک دوسرے کی تشخص میں زیادہ غلطیاں نہ کرتے۔

پروفیسر سہیل نے اپنی گدی پر دایاں ہاتھ رکھا اور میز پر ذرا سا چنتر اجما کر بولا۔" میں عمر اور تجربے میں آپ لوگوں سے بہت بڑا نہیں ہوں لیکن چونکہ میری شادی نہیں ہوئی اس لیے مجھے پیار کرنے کے لیے صرف کتابیں ملی ہیں۔ ابھی تک میرا Passion کتابیں ہیں۔ کلاس میں کبھی کبھی آپ لوگ کچھ ایسے سوال کریں گے جن کا جواب مجھے نہیں آتا ہوگا۔ اور میں بدقسمتی سے اتنا متکبر ہوں کہ سب کچھ برداشت کرتا ہوں کسی اور کی علمی برتری برداشت نہیں کر سکتا اس لیے I warn you جب تک آپ میری کلاس میں رہیں ہمیشہ مجھے گرو سمجھیں۔ میرے علم کو زیادہ مانیں کبھی کبھی یہ بالکل Shallow ہوگا آپ خود بات کی تہہ کو بہتر سمجھتے ہوں گے لیکن مجھے اس بات کا احساس دلا کر آپ کو نقصان ہوگا۔ میری چھاتی چھوٹی ہو جائے گی میں اپنی Whishkers منوا دوں گا اور میری بلٹ ڈھیلی ہو جائے گی۔ کون کون چاہتا ہے کہ میں احساس کمتری میں مبتلا ہو جاؤں ہاتھ اٹھائیے۔۔۔۔" سوائے آفتاب کے کسی نے ہاتھ نہ اٹھایا۔

"بھلا کیوں مسٹر آفتاب آپ کیوں چاہتے ہیں کہ میں احساس کمتری میں مبتلا ہوں۔"

”سر اس لیے کہ آپ پہلے سے احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔صرف ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔“

قہقہوں میں سب سے اونچا قہقہہ پروفیسر سہیل کا تھا۔

اب کمرے میں تثلیث بن گئی لڑکیوں کی قطار کے آخر میں یمی شاہ لڑکوں کی ٹکڑی کے سرے پر آفتاب بٹ۔۔۔۔اور ان دونوں کے نقطۂ اتصال پر پروفیسر سہیل۔۔ گفتگو ان تینوں کے درمیان جاندار سرکٹ کی طرح چلنے لگی۔

ہنسی کے ختم ہونے پر پروفیسر سہیل پھر گویا ہوا۔۔۔۔”میرے پاس فی الحال موٹر سائیکل ہے کسی لڑکے کو ضروری کام ہو تو وہ مجھ سے چابی مانگ سکتا ہے۔لیکن جو وعدے کے مطابق موٹر سائیکل واپس نہیں کرے گا وہ دوبارہ اپنے اس حق کو استعمال نہیں کر سکتا اگر کوئی لڑکی بس سٹاپ پر کھڑی ہو اور ہاتھ دے کر مجھے روکے میں سے لفٹ دوں گا لیکن اگر وہ مجھے موٹر سائیکل موڑنے کو کہے گی تو میں اسے اتار دوں گا۔ ۔۔۔اب آپ سب مجھے بتا سکتے ہیں کہ آپ کے پاس کیا کچھ ہے؟۔۔۔۔جو آپ دوسروں کے ساتھ Share کر سکتے ہیں اور کس حد تک۔۔۔۔“

”پن۔۔۔۔“ ایک طرف سے آواز آئی۔

”سائیکل۔۔۔کبھی کبھی۔۔۔۔۔“

”ٹشو پیپر۔۔۔۔ہمیشہ“

”نوٹس۔۔۔۔امتحان کے بعد۔۔۔۔“

”لپ سٹک۔۔۔۔۔“ یمی شاہ بولی۔

”فلائنگ کس۔۔۔۔۔“ آفتاب نے جواب دیا۔

”گڈ ویری گڈ۔۔۔۔مجھے پتا چلا کہ ہماری کلاس سوشیالوجی کی کلاس کا جی این پ کافی ہے اور ہم اس اعتماد کر کے آسانی سے آگے چل سکتے ہیں۔بائی دی وے کیا آپ لوگ کچھ سمجھتے ہیں فرد اور معاشرے کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟ فرد کی آواز بڑی

ضروری چیز ہے۔۔۔۔لیکن کیا کبھی یہ بھی ممکن ہو گا کہ معاشرہ بھی اپنی تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہو جائے اور پھر بھی قائم رہے۔۔۔۔؟"

اب پروفیسر کی شکل بوڑھی ہو گئی۔۔۔اپنے موٹر سائیکل جتنی پرانی۔۔۔۔

ہمیں معلوم بھی نہ ہو سکا کہ لیکچر شروع ہو گیا ہے۔

پروفیسر سہیل بڑی چابک دستی سے فرد اور معاشرے کے باہمی ربط کو زیر بحث لا رہا تھا۔لیکن کچھ ایسے باری باری گیند ہم سب کے کورٹ میں پہنچتا کہ ہم اپنی پوری ذہنی قوت کے ساتھ اسے پروفیسر کے کورٹ میں لوٹا دیتے۔دیکھتے دیکھتے چہرے تمتمانے لگے۔آوازیں تیکھی ہو گئیں۔ہاتھ ہوا میں چلنے لگے۔لڑکیاں جو نمازیں نیت کر بیٹھیں ہوئی تھیں سوئے کے ساتھ برف توڑتی نظر آنے لگیں۔بات فرد اور معاشرے سے ہو کر اب دور جا نکلی تھی۔اور ہم سویڈن تھائی لینڈ، روڈیشیا، میکسیکو، یوگینڈا کے مختلف معاشروں کا تقابل کرتے کرتے کبھی فرد کی محرومی کے متعلق سوچ رہے تھے اور کبھی معاشرے کی بے چارگی پر افسوس کر رہے تھے۔

پھر سیمی شاہ اٹھی اور بولی۔۔۔۔"سر آپ کا کیا خیال ہے اگر معاشرہ Ideal ہو تو کیا کوئی فرد کبھی خودکشی کر سکتا ہے؟"

پروفیسر نے اپنے چھتے جیسے سر میں انگلیاں ڈبوئیں پھر سوال کو لڑکوں کی قطار میں پھینک دیا۔لڑکوں کی قطار سے جب کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا تو پروفیسر نے کہا"دراصل خودکشی ایک Symptom ہے کسی معاشرے کے اندر اگر کوئی ہیرومیٹر فٹ کیا جائے تو خودکشی اس کا آخری درجہ حرارت ہو گا۔افسوس مس شاہ ابھی کوئی آدرشی سوسائٹی ایسی نہیں بن سکی اس لیے ہم تجربہ نہیں کر سکتے لیکن خیال کیا جاتا ہے کہ سوسائٹی کا پریشر پاگل پن کو جنم دیتا ہے اور یا پاگل پن ہی خودکشی کا باعث ہے۔"

اس کے بعد وہ ذرخائم کے حوالے سے دیر تک بات کرتا رہا۔ہم سب ایسی عمر میں تھے جب خودکشی سے ایک روحانی اور رومانی وابستگی پیدا ہو جاتی ہے ایسی

وجوہات کا جائزہ لیا گیا جن کی وجہ سے فرد خودکشی پر مائل ہوتا ہے۔ اقتصادی معاشرتی شخصی، ذاتی وجوہات ۔۔۔ بالآخر بار خودکشی سے کھسک کر دماغی امراض اور پاگل پن کی طرف مڑ گئی۔ کیونکہ خودکشی نتیجہ تھی وجہ نہیں تھی۔ اصلی وجہ وہ دیوانہ پن تھا جس کی بنا پر انسان کئی احمقانہ اقدامات اٹھانے پر مجبور ہوتا ہے۔

انجیلا شروع سے آخر تک خاموشی سے بیٹھی رہی۔ پروفیسر سہیل کے ساتھ ساتھ فرزانہ طیبہ اور کوثر بہت گرم جوشی سے بحث میں حصہ لے رہی تھیں۔ لیکن یہاں پر ان کی بولتی بند ہو گئی۔

سہیل پروفیسر بولا ۔۔۔ "آپ لوگوں نے فرد اور معاشرے کی کشمکش کو بہت خوبی سے سمجھا ہے اور بہت سے صحیح نتیجے اخذ کیے ہیں۔ مس فرزانہ ٹھیک کہتی ہیں کہ معاشرے کا پھندا جب فرد کی گردن پر بہت تنگ ہونے لگتا ہے تو کبھی کبھی فرد موت سے پہلے خود اپنے فیصلے سے مر جاتا ہے۔ کوثر نے خودکشی کی ان گنت وجوہات کو ایسے بیان کیا ہے کہ اس میں ایک نئی دریافت کی سی تازگی پیدا ہو گئی۔ لیکن اب میں آپ لوگوں کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ میں خودکشی کا فعل جسے آپ سب متفقہ طور پر پاگل پن پر ۔۔۔ وجہ پر نتیجے پر نہیں پاگل پن کی اصلی وجہ کیا ہے ۔۔۔ یاد رکھیے پاگل پن جس قدر ششدر کرنے والی حالت ہے اسی طرح پاگل پن پیدا کرنے کی وجہ کو بھی حیران کن ہونا چاہیے۔"

اب ہماری لڑکوں کی ٹیم اس بحث میں لنگوٹے کس کر داخل ہوئی۔

"پاگل پن کی دو وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو Functional وجہ ہو سکتی ہے مثلاً کہ بچہ پیدائشی طور پر نامکمل ہو ۔۔۔ دوسری وجہ نفسیاتی ہو سکتی ہے۔"

"اور پھر او مجھے ان وجوہات کے علاوہ شاید کوئی اور وجہ بھی ہو۔"

اب تک آفتاب نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکالا تھا۔ یہ کشمیری بچہ سفید رنگ کی پیکنگ میں بر تھ ڈے گفٹ کی طرح سجا سجایا پڑا تھا۔ آفتاب کی یہ عادت بعد میں

ہمیں پتہ چلی کہ جہاں مسکراہٹ سے کام چل جاتا وہاں وہ ایک لفظ نہ ضائع کرتا۔ جہاں لفظ سے عندیہ پورا ہو جاتا وہاں وہ جملے کو استعمال نہ کرتا۔ جہاں مختصر بات کافی ہوتی وہاں وہ لمبی بحث میں نہ پڑتا۔ وہ عموماً پوائنٹس میں بات کرنے کا عادی تھا۔

انگلیوں پر گنتا جاتا۔۔۔۔ایک۔۔۔۔نمبر دو۔۔۔۔نمبر تین۔۔۔۔اور زیادہ وقت اسے نمبر تین سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہ ہوتی۔ ایم اے کی کلاس میں آفتاب کی سب سے لمبی گفتگو تھی۔

آفتاب اٹھا اس نے اپنے دونوں بازو صلیب کی طرح اٹھائے آدھی آستین والی قمیض میں اس کے دونوں بازو سنہری گھاس سے اٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کھڑکی سے آنے والی روشنی اس کی براؤن آنکھوں میں چمکتے شہد جیسی روشنی پیدا کر رہی تھی اور اس وقت وہ اولمپک کھیلوں میں آگ مشعل اٹھانے والے کھلاڑی کی طرح خوبصورت، کنوارہ اور مقدس نظر آ رہا تھا۔ شاید ایک لمحے میں نے اس کی طرف دیکھنے کی غلطی کی اور دیوانی ہو گئی۔

"پاگل پن ہمیشہ نا آسودہ آرزوؤں سے پیدا ہوتا ہے سر۔۔۔۔اور نا آسودہ آرزوئیں ان Taboos سے جنم لیتی ہیں۔ جو ہر کلچر میں موجود رہتی ہیں۔ جس کلچر میں ماموں زاد بہن سے شادی نہیں ہو سکتی وہاں ماموں زاد بہن کے عشق لاحاصل سے دیوانگی پیدا ہو سکتی ہے۔"

"فرائیڈ سے مستعار لینے کا شکریہ۔۔۔۔" میں نے قینچی جیسی تیکھی انگریزی میں کہا۔"

"محترمہ۔۔۔۔پاگل پن کی یہ وجہ میں نے Repression سے نہیں لی۔۔۔۔ میں جس پاگل پن کا ذکر کر رہا ہوں وہ میر تقی میر کا پاگل پن ہے۔۔۔۔فرہاد کا پاگل پن ہے۔۔۔۔پروفیسر سہیل تو دیوانے پن کی ایک سائیڈ دکھا رہے تھے خودکشی اور

سوت میں دوسری سائیڈ پیش کر رہا ہو جہاں پہنچ کر دیوانہ پن مقدس ہو جاتا ہے۔ ماؤنٹ ایورسٹ فتح کر لیتا ہے دودھ کی نہریں بہا دیتا ہے۔''

کسی لڑکے نے پیچھے سے نعرہ لگایا۔۔۔۔''بیٹھ جاؤ جناب فرہاد صاحب۔''

آفتاب نے پیچھے قہر کی نظر ڈالی اور بیٹھ گیا۔

''Thats a point'' پروفیسر سہیل کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

''یعنی ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پاگل پن دو قسم کا ہے۔۔۔۔ایک مثبت ایک منفی۔۔۔۔ویری گڈ۔۔۔۔اب اس مہینے آپ سب کی یہ Assignment ہو گی کہ آپ مجھے ایک نہ ایک وجہ ایسی بتائیں جس سے فرد میں پاگل پن پیدا ہوتا ہے۔۔۔۔یہ وجہ جبلی نہیں ہونی چاہیے۔Enviromental نہیں ہونی چاہیے۔۔۔۔کوئی آفاقی نظریہ لیکن بالکل نئی وجہ ہونی چاہیے۔ میں سب سے زیادہ سے بھرے جواب پر سب سے زیادہ نمبر دوں گا۔''

کلاس میں شور مچ گیا۔

''سر دیوانے پن کی صرف ایک وجہ ہے ماحول۔۔۔۔ماحول۔۔۔۔ماحول''

ایک طرف سے آواز آئی۔

''سر انسان میں پیدائشی نقص ہوتا ہے Biological''

''Repression سر۔۔۔۔''

''مانے نہ مانے کوئی۔۔۔۔اصلی پاگل پن کی صرف ایک وجہ ہے۔۔۔۔صرف ایک وجہ عشق لاحاصل۔۔۔۔عشق لاحاصل۔۔۔۔عشق لاحاصل۔۔۔۔''

جھنڈا اڑانے کی انداز میں آفتاب کرسی پر چڑھ کر چلایا۔

''آرڈر آرڈر۔۔۔۔'' پروفیسر سہیل نے کہا۔''دوستو میری Increment کا سوال ہے اگر تم لوگ ایسے شور مچاؤ گے تو کالج والے میری رپورٹ کر دیں گے۔ پرنسپل صاحب کے پاس۔۔۔۔اور میری تبدیلی مظفر گڑھ کر دیں گے۔''

اس کے بعد بحث بے پتوار کی کشتی بن کر چلنے لگی۔

کلاس کے کسی ذہین نوجوان نے گروپ شادی اور حشیش کا قصہ چھیڑ دیا۔ پھر مغرب کی آزادروی سی بات نیگرو مسئلے کی طرف گئی۔ سویڈن میں اے بینا کے رفیوجی مسائل، ریڈ انڈین اور ان کے جادوگروں کی باتیں تونا آبادیت اور جمہوریت کے بکھیڑے جاپان اور اس کی انڈسٹریل کامیابی۔۔۔۔روس کا پلٹتا ہوا کمیونسٹ نظام، جو بھی بات کسی کو معلوم تھی اس نے کی۔۔۔۔لیکن سیمی شاہ کو کرسی پر کھڑے آفتاب کے عشق لاحاصل نے سر کرلیا۔ وہ گلبرگ کی ساختہ تھی۔ اس کی ساری عمر کونونٹ سکولوں اور کالجوں میں گزری تھی۔ اپنے خالی اوقات میں وہ انگریزی موسیقی سنتی، ٹائم اور نیوز ویک پڑھتی، ٹی وی پر امریکی سیریز دیکھتی اس کی واڈروب میں گنتی کے شلوار قمیض تھے، وہ شیمپو ہیئر سپرے، ٹشو پیپر، کوون، اور سینٹ سپرے کے بل بوتے پر سنگار کرتی تھی۔ اس نے کبھی لوٹے باٹی سے غسل نہ کیا تھا۔ ببل برش اور شاور سے نہانے والی اس دختر گلبرگ کو نہ جانے کیا ہوا کہ ایک کشمیری بچے سے وہ بھی اندرون شہر کے رہنے والے سے جب وہ عشق لاحاصل کا نعرہ لگا رہا تھا مات کھا گئی۔ اس سے پہلے سیمی شاہ اور آفتاب کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے۔ ایڈمیشن فیس داخل کرواتے وقت برآمدے میں آتے جاتے۔ لیکن اس تیسرے پیریڈ میں ان دونوں کی نگاہوں میں پہلے استعجاب ابھرا۔ پھر پہچان پیدا ہوئی اور ایک ہی سیشن میں سب کچھ اعتراف میں بدل گیا۔ کلاس کے بعد وہ دونوں اٹھے ایک انجانی قوت کے تحت ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ باہر پہنچ کر سیمی شاہ کچھ کہے بغیر آفتاب کی موٹر سائیکل پر بیٹھ گئی۔ آفتاب نے سوال نہ کیا کہ اسے کہاں جانا ہے اور وہ دونوں کسی فلمی منظر کی طرح آہستہ آہستہ سڑک پر فیڈ آؤٹ کر گئے۔ تعارفی تقریب میں تین افراد نے میرا پڑا کیا۔

آفتاب جسم کے اعتبار سے بالکل یونانی تھا۔۔۔ اگر وہ کلاس میں موجود نہ ہوتا تو

شاید میرا چراغ روشن سب سے روشن ہوتا۔ ایک خاص قسم کا بغض، حسد اور اللہ واسطے کا بیر میرے دل میں اس کے خلاف پیدا ہو گیا۔

دوسرا دھکا مجھے پروفیسر سہیل سے لگا اس سے پہلے کورس کی کتابوں سے نوٹ بنا کر رکھے ہوئے تھے ہر سال وہ ان ہی مختصر ناچوں کے بل بوتے پر پڑھاتے آ رہے تھے۔ اور پنشن ملنے تک ان کی تعلیمی استعداد بڑھنے کے امکانات صفر تھے جو نظریات انہوں نے سروس کے شروع میں مرتب کیے۔ ان کو بدلنا یا ان میں ترمیم کرنا ممکن نہ تھا۔

سکول میں ہم ماسٹر غلام رسول کی پرورش میں رہے۔ ان کی ڈاڑھی زبان کی گھن گرج اور وہ میز کبھی تبدیل نہ ہوئی جس پر وہ کلاس میں آتے ہی اپنی چھڑی رکھتے تھے۔ ان کی ڈاڑھی ہمیشہ کاسنی مائل سیاہ خضاب سے چمکتی نظر آتی جس طرح تھانیدار ملزم کو لمبا ڈال کر ماں بہن کی گالیاں دیتے ہیں ایسے ہی وہ ہمیں بنچ پر کھڑے کر کے ہماری عزت افزائی کرتے تھے۔ ان کی آواز کا والیوم ۔۔۔۔ کنٹرول خراب تھا اور صرف اونچے سروں پر کام کر سکتا تھا۔ گرمیاں سردیاں ان کی وہی بل دار سیاہ چھڑی میز پر نظر آتی۔ چھڑی تک ہماری رسائی نہ تھی۔ اس لیے ہم میز سے بدلے لیا کرتے تھے۔ پرکار سے کھود کھود کر نقطوں کی شکل میں اس کی چاروں ٹانگوں پر گئی گالیاں کندہ تھیں۔ لیکن یہ میز بدسلوکی کے باوجود اور ماسٹر صاحب کی ہمدردی بددعاؤں کے باوصف کبھی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ اگر ان کے منہ سے نکل جاتا کہ جنگ آزادی ۱۹۴۷ء میں ہوتی تھی۔ تو پھر تمام کتابوں کی تصدیق کے باوجود اپنی رائے بدلنے پر رضامند نہ ہوتے، ان کی اس اٹل خاصیت کی وجہ سے ان کے تمام شاگردوں ڈرپوک گھنے اور بزرگ دشمن تھے۔ ماسٹر غلام رسول مغل بادشاہوں کی شان میں کوئی گستاخی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ بابر سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک تمام شاہ ان کے ہیرو تھے۔ اگر ان کے عہد حکومت یا ذات میں کوئی کوتاہی کسی کو نظر

ہتی تو وہ جب اٹھتے۔ نکتہ چینی کرنے والے کو دلائل دے کر قائل کرنے کی ان میں صلاحیت نہ تھی۔ ایسے میں ان کا والیم کنٹرول کھلتا جاتا اور وہ دلیل کی جگہ چنگھاڑ سے اگلے کو قائل کر لیتے۔

نویں جماعت کے شروع میں کہیں سے تو زک جہانگیری میرے ہاتھ چڑھ گئی۔ میں سارا دن ہم جماعت کو اس کے واقعات سناتا نہ تھکتا۔ گو میں ماسٹر غلام رسول کی ذہنیت سے واقف تھا لیکن نئی نئی جوانی رہی تھی انا پھن اٹھانے کھڑی تھی میں نے ہم جماعتوں پر اپنا رعب ڈالنے کے لیے ایک روز کلاس میں جرائت سے کہا۔ "ماسٹر جی آپ نے تو زک جہانگیری پڑھی ہے۔"

"جب تو ابھی تھوڑا سوتا پھرتا تھا۔ تب میں نے اس کو پڑھا تھا، بیٹھ جا اور زیادہ علمیت نہ بگھار کر کلاس میں۔"

"ماسٹر جی ۔۔۔۔" میں نے ذرا سی ارکوشش کے بعد کہا۔

"کیا ہے؟"

"اس میں کچھ ایسے واقعات درج ہیں جن کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ بادشاہ جہانگیر کچھ ایسا رحمدل نہیں تھا۔"

ماسٹر غلام رسول نے چاک کا ٹکڑا ازیل میز پر مارا۔

"نور جہاں سے شادی کی ۔۔۔۔ یہ رحم دلی نہیں؟ کوئی بادشاہ کسی وہا جو سے شادی کرتا ہے؟ اس کو کمی تھی کنواریوں کی بول بتا رحمدلی نہیں تو اور کیا ہے۔ بتا؟"

ماسٹر جی اور میں مختلف پیمانوں سے رحم دلی کو ناپتے تھے۔

"جہانگیر نے ایک ملزم کو ۔۔۔ ماسٹر جی بکرے کی کھال میں بند کروا کے اوپر ملزم تھا نا ں کوئی بے گناہ تو نہیں تھا۔ سزا ہمیشہ بہتری کے لیے دی جاتی ہے اب میں تم کو مارتا ہوں تو کیا اس کا فائدہ مجھے ہوتا ہے بتاؤ ۔۔۔۔ ساری سزا ملزم کے فائدے کے لیے ہوتی ہے۔"

"لیکن ماسٹر جی جو بکری کی کھال میں سلوا دیا گیا اس کو کیا فائدہ ہوا؟"

"بیٹھ جا۔۔۔۔ بیٹھ جا اور بحث نہ جاتا کر اپنے بڑے بھائی مختار کی طرح۔۔۔۔ مطلب ہو نہ ہو بحث چلا جا رہا ہے، بولے جا رہا ہے خیر سے مونچھیں آ جائیں سدھی پڑی تو بات کریں گے جہانگیر اعظم کی۔"

وہ سکندر اعظم کی طرح ہر مغل بادشاہ کے ساتھ اعظم لگانے کے عادی تھے پنی مونچھوں کے سلسلے میں میں پہلے ہی کچھ شرمسار رہتا تھا اس لیے میں چپ چاپ بیٹھ گیا لیکن حیست بگھ رنے والے لڑکے نے میرے اندر کہیں بغاوت کر دی۔

تعلیم و تدریس کی بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ عام استاد عموماً اوسط درجے کا شخص ہوتا ہے اور وہ ذہنی جسمانی اور جذباتی طور پر لکیر کے فقیر قسم کی باتیں سوچتا ہے اسے ضبط و نظم سے مڈل کلاس لوگوں سے، اور پڑھا کو طلبا کو پڑھانے سے پیار ہوتا ہے لیکن سارا دن وہ بڑی قد آور شخصیتوں اور ان کے کارناموں کی تعلیم دیتا ہے۔ ایسے لوگ جنہوں نے کبھی معاشرے کے ساتھ مطابقت نہ کی۔ عام ترین ہوتے ہوئے وہ ایسے لوگوں کی تعلیم عام کرتا ہے جن کی سطح پر وہ سوچ بھی نہیں سکتا اس کا اپنا کردار بچوں کو عام بنانے پر مصر رہتا ہے اور اس کی تعلیم بچوں کو خاص ہونے پر اکساتی رہتی ہے۔ سکول سے بھاگ جانے والے بچوں کی جگہ سکول میں نہیں ہوتی لیکن ایسے ہی باغی بچوں کو بنچ پر کھڑا کر کے ہمیشہ ان عظیم شخصیتوں کی روشن مثالیں دی جاتی ہیں جو خود سکولوں سے بھاگے تھے۔ ہر غلام رسول بچوں کو جنہیں جینیس۔۔۔۔ کی کتابیں پڑھا کر عام بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور یہی تعلیم کا سب سے بڑا المیہ ہے خاص لوگوں کی تعلیم اور عام لوگوں کی داداگیری میرے دل کی بنچ پر بھی ماسٹر غلام رسول کئی قد آور شخصیتیں کھڑی تھیں اس درخت جیسی ہوگئی جسے زیبائش کے لیے جاپان میں پال جاتا ہے، جو سالوں پرانا ہوتا ہے لیکن جس کا قد ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔

میں اسی لیے اس قدر محتاط تھا کہ کبھی کبھی بے عمل ہو جاتا۔

تجربے کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن عملی زندگی میں بھی سیدھے راستوں کی بجائے میں پگڈنڈیوں پر آوارہ کتوں کی طرح سرگرداں رہتا۔ مجھے کسی ایسے گرو کی تلاش تھی، جو مجھے کھینچ تان کر اپنے علم جتنا بڑا کر دے لیکن سکول کے بعد ایک اور ماسٹر غلام رسول مل گئے۔

ان سے میری ملاقات بی اے کے پہلے سال میں ہوئی۔ پروفیسر تنویر ہمیشہ فرن سگریٹ پیتے ان کے تھری پیس سوٹ بے داغ ہوتے۔ چہرے پر موٹے شیشوں کی عینک ہوتی۔ کلاسوں کے علاوہ وہ ہمارا ٹوریل بھی لیتے تھے۔ انہوں نے بھی ان گنت کتابیں پڑھی تھیں۔ ان کا مطالعہ مجھے مرعوب کرتا تھا۔ کیونکہ میری اولین تعلیم دیہاتی تھی۔ اس لیے میں فیوڈل نظام پسند کرتا تھا۔ وہ پکے سوشلسٹ تھے۔۔۔۔ تھیوری کی حد تک وہ معاشرے کی ہر مصیبت کو دولت کی غلط بانٹ سے منسوب کرتے۔۔۔۔ بی اے کے پہلے سال میں وہ ایک اور قسم کے ماسٹر غلام رسول ہیں۔ وہ دل سے سوشلسٹ تھے۔ لیکن صرف کتابی طور پر۔۔۔۔ ان کا رہنا سہنا، ملنا ملانا، زندگی بسر کرنے کی چھوٹی چھوٹی جزیات کسی فیوڈل لارڈ کیسی تھیں، مشکل یہ تھی۔ وہ نہ اپنے سوشلسٹ نظریئے پر تنقید برداشت کرتے تھے۔ نہ اپنی طرز زندگی پر۔

اگر کوئی تند دان کے شاگردوں کی نظر پڑ جاتا اور وہ اس پر رائے دے دیتے تو ماسٹر تنویر سختی کے ساتھ اس آزادی رائے کی سرکوبی کرتے جس کے وہ پرچارک تھے۔

بی اے فائنل کے امتحانوں سے کچھ دن پہلے کی بات ہے وہ میں کلاس میں سگریٹ پینے کی اجازت دے کر اپنے روشن خیال ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔

''میں کھڑا ہو کر بولا۔۔۔۔۔ سر ایک بات ہے۔''

''سگریٹ مت بجھاؤ ہم دوست ہیں پوچھو۔ اور بیٹھے رہو۔''

"سر آپ ہر روز ہمیں بتاتے ہیں کہ روپیہ تھرڈ ورلڈ ذلت کی جڑ ہے۔ پھر آپ اپنی کار بیچ کر معمولی موٹر سائیکل کیوں نہیں خرید لیتے؟"

ابھی میں پختہ نہیں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ عام طور پر قول اور فعل کے تضاد سے بڑی قدآور شخصیتوں کا خمیر بنا ہوتا ہے۔

پروفیسر تنویر کا چہرہ لال ہو گیا۔ انہوں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا "یہ بالکل پرسنل سوال ہے بیٹھ جاؤ ارے یاد رکھو تم قصباتی لوگوں کے manners بہت کمزور ہوتے ہیں، بے وقوف گدھے۔۔۔ اگر میں کار بیچ دوں گا تو کالج کیسے آؤں گا؟!"

میری انا کو ٹھیس پہنچ چکی تھی۔ اس لیے بحث کو اب چھوڑنا میرے لیے بھی آسان نہ تھا میں نے پروفیسر تنویر کو زچ کرنے کے لیے کہا۔۔۔ "سیکل پر سر۔۔۔ سائیکل پر۔۔۔ انسان کو عوام میں ملے رہنا چاہیے۔"

"یہ Space age ہے گدھے آدمی۔۔۔ ہر کام میں وقت بچانا پڑتا ہے۔ اور تم مجھے سائیکل سوار بنا رہے ہو۔"

"لیکن سر چین بھی تو Space age میں ہے وہاں کے لوگ۔۔۔"

"ایک دانشور اور تو کیچوئل سائیکل پر آئے جاتے۔۔۔ اور تمہارے برعکس کارخانے دار۔۔۔ دو کوڑی کے تو دو لیتے کاروں پر گھومیں۔ مر مر کر تو جگہ ملی ہے معاشرے میں۔۔۔ برسوں کی جدوجہد کے بعد گریڈ بڑھے ہیں۔ ہم بھی عزت دار زندگی بسر کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔"

"سر لیکن آپ کے نظریات کے مطابق تو سوسائٹی میں کوئی طبقہ نہیں ہونا چاہیے، جس سے عزت بے عزتی کا سوال پیدا ہو۔"

اب پروفیسر کے منہ سے جھاگ اڑنے لگی وہ دونوں بازو لہرا لہرا کر بولے۔۔۔

۔"بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔۔۔ مینڈکی! کھوپڑی ڈھائی انچ کی ہوتی ہے اور

اس میں مارکس کے نظریات ٹھونسنا چاہتے ہیں، بیٹھ جاؤ۔۔۔۔بھائی میاں۔۔۔۔ پہلے ٹائی کی ناٹ باندھنا سیکھو۔۔۔۔پھر ادھر آنا۔۔۔۔ان باتوں کی طرف۔۔۔۔"

میں اپنی ٹائی کی ناٹ ہتھیلی میں چھپا کر بیٹھ گیا۔۔۔۔پروفیسر تنویر کو کھوپڑیاں کھولنے کا عمل نہیں آتا تھا۔ وہ کسی کو ایسی تعلیم دینے کے اہل نہ تھے جو نظریے اور عمل کا فرق کم کردے۔

لیکن پروفیسر سہیل ایسا چھپا ہوا کاغذ نہیں تھا، جس پر مزید کچھ لکھا نہ جاسکے، وہ تو سلیٹ کی مانند تھا، لکھا۔۔۔۔مٹایا اور پھر لکھ لیا کتابوں سے اس کا شغف دیکھ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔۔۔۔مجھے بھی عرصے سے کتابوں کی رفاقت نصیب تھی۔ لیکن کتابوں نے مجھ سے زندگی کی ہلکی طرف کو پوشیدہ کردیا تھا۔ میں محسوس کرتا تھا، کہ
کتابوں نے مجھ سے زندگی کی ہلکی طرف کو پوشیدہ کردیا تھا، میں محسوس کرتا تھا، کہ
کتابوں سے محبت کرنے والے عموماً زندگی کی اس اہم سمت کو بھول جاتے ہیں۔ وہ اس قدر سنجیدہ ہو جاتے ہیں کہ مزاح مکمل طور پر ان کی زندگی سے نکل جاتا ہے اور وہ لمبے جبے پہن کر سارا وقت پڑھے ہوئے نظریات کی لاٹھی سے دوسروں کی پٹائی میں مصروف رہتے ہیں۔

پروفیسر سہیل شگفتہ اور عجیب تھا شخصیت پر کسی نہ کسی غلام رسول نے اپنی مہر لگا رکھی تھی۔۔۔۔اسلیے بچے کی طرح سادہ، کسی گنوار کی طرح متحیر اور کسی مسخرے جیسے ہنسوڑ پروفیسر سہیل کو دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا۔ تعارفی کلاس میں ہی مجھے اپنی علم دوستی سے گلہ پیدا ہو گیا۔ مہاتما بدھ کی دھاما پادھا سے لے کر موجودہ دور کے تازہ ترین علم پیرا سائیکولوجی تک مجھے جو کچھ پیش آیا تھا۔ اس سے اکتاہٹ پیدا ہو گئی۔ کاش میں بھی سادہ سلیٹ ہوتا۔۔۔۔پچھلا لکھا ہوا مٹا سکتا اور پروفیسر سہیل کی دی ہوئی Assignment کو اسی تازگی سے لکھ سکتا جس کی وہ ہم سے توقع رکھ رہے تھے۔

حالانکہ ابھی میں نے مضمون نہیں لکھا تھا۔ لیکن ابھی سے انہیں مایوس کرنے کا دکھ مجھے تھا۔

آفتاب کے حسن اور پروفیسر سہیل کے علم کے آگے گھٹنے ٹیکنے کے بعد میں نے تیسرا سجدہ بیبی شاہ کو کیا۔۔۔۔غالباً اس میں اس کلچر کی جیت تھی جو دیہاتی لوگوں کو میسر نہیں آتا۔

میں نے اس سے پہلے اتنی مکمل شہری لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اسے دیکھ کر میں شتہاروں کی دنیا میں پہنچ گیا۔ اور وہ مجھے ہوائی سفروں پر بادلوں سے اوپر لے گئی۔ اس کا لب ولہجہ۔ لباس اٹھنا بیٹھنا، جسم سے اٹھنے والی خوشبو سب اس بات کی گواہ تھیں کہ وہ مجھ سے زیادہ مہذب ہے۔ اب میری انا کا یہی مسئلہ تھا کہ میں اس لڑکیکو پچھاڑوں۔ اور اسے اپنے دیہاتی بیک گراؤنڈ میں گھسیٹ کر لے جاؤں جہاں وہ میری وجہ سے پچھڑ کھا کر گرے اور مکمل طور پر دیہاتی ہو جائے۔

پھر اس کے صبح و شام ماں کی طرح لسی پینے دودھ دوہنے، چرخا کاتنے اور بڑی بڑی ہانڈیوں میں ساگ پکاتے ہوئے صرف ہوں۔ شاید ہر مرد کے اندر یہ آرزو ہوتی ہے کہ وہ عورت کو اس کی پٹڑی سے اتارے اور اپنے راستے پر لے کر چلے۔ اب یہ اور بات ہے کہ آفتاب مجھ سے پہلے ہی بیبی شاہ کو موٹر سائیکل پر بٹھا کر رخصت ہو گیا تھا۔ اور اندرون شہر کے کلچر پر اردو میں پہلا لیکچر دے رہا تھا۔

کچھ لوگ کہتے ہیں

پوٹھوہار کا وہ علاقہ جہاں آج کل دوسرے درجے کے بے آب خاکستری پہاڑ ہیں اور جن کو مقامی لوگ بیتیاں پکارتے ہیں۔ یہی علاقہ جو ہوائی جہاز کی کھڑکی سے امریکہ کے جنوبی ریگستانوں سے مشابہہ نظر آتا ہے یہ علاقہ ایک زمانے میں ہریں مارتا چاند کی طرف لپکا ہوا دیں سمندر تھا۔ پھر کسی جوگی نے وقتیں صدی سے اس کے

کنارے بیٹھا گیان دھیان میں مصروف تھا۔ سمندر کو نظروں سے اوجھل ہونے کا سراپ دے دیا۔ سمندر ایسے لوٹا کہ ہر ہر لہر پالا گن پالاگن کہتی بحیرہ عرب میں جا گری اور اس علاقے کی تہہ آب چھپی ہوئی پہاڑیاں ٹنڈ منڈ باہر نکل آئیں۔ ان پہاڑیوں کے نشیب و فراز اور کٹاؤ ایسے تھے کہ لہر در لہر سمندر کے بہاؤ کا پتہ دیتے تھے۔

کچھ اور لوگ کہتے ہیں اس علاقے سے ملحق کبھی ایک گھنا جنگل تھا۔ جنگل کے درخت ایسے اونچے چھتنارے ڈال ملے تھے کہ اس میں بہنے والی ندیوں کو بھی رستہ نہ ملتا اور سورج کی روشنی سے ان کے پانیوں میں بھی ست رنگے بکھر نہ پڑتے۔ یہاں سارا دن پرندے آزادی سے گھومتے پھرتے اور الو بھی دن کے وقت دیکھ سکتے تھے۔ لیکن ایک رت چاند سے ایسے آسیب کی ہوا اتری کہ سارا جنگل ٹنڈ منڈ ہو گیا اور سب ندی نالے سوکھ گئے۔ اسکے علاوہ کچھ لوگ کہتے ہیں کئی قرن پہلے جب پہلی بار نئی نوع انسان متحد ہوا تو یہ جنگل موجود تھا۔ اس وقت وہ تمام متداول علوم رائج تھے جو آج پھر سکھائے جاتے ہیں۔ تب پہلی بار انسان نے مریخ اور زہرہ کا سفر کیا تھا اور زمین پر ایٹم بن بنائے تھے۔ جب تمدن کی کمان پورے زور سے تن گئی تو انسان نے سارے بم گرا کر اللہ کی دھرتی کو تہس نہس کر دیا۔ اور یہ جنگل بے آب و گیاہ بنجر علاقہ بن گیا۔

یہ تب کا ذکر ہے جب انسان نے پہلی بار متمدن ہو کر اپنے بم دنیا پر نہ چلائے تھے۔ جانوروں کی بستیوں میں اس ایجاد کی وجہ سے بہت تشویش پھیلی ہوئی تھی۔ اسی بے جنگل میں کانفرنس بلائی گئی۔ جانوروں کی اس بین الاقوامی کانفرنس میں اتنے پرندے آئے کہ جنگل کے درختوں کی کسی شاخ پر بیٹھنے کو جگہ باقی نہ رہی۔

ہند سندھ سے کاسنی پروں غول در غول آئے کھاسی کی پہاڑیوں سے سرخ دم والی بلبل اور فیروزی رنگ کا کبوتر اس شان سے آیا کہ اس کے اندرونی نارنجی پروں سے

سکی آنکھیں خیرہ ہوئیں کھٹ منڈو کا بھجگا اور تبت کے شاہین کئی پڑاؤ ٹھہر ٹھہر کر حاضر ہوئے۔ افریقہ کے بھٹ تیتر بن مرغی اور بلبلیں تو آئی ہی تھیں لیکن شکاری پرندوں نے بھی اپنی مصروفیت بھلا کر امریکہ اور آسٹریلیا سے یہاں تک کا سفر اختیار کیا تھا۔ اونچے اونچے درختوں میں ریسٹ ہاؤس بن گئے شکرہ باز چرخ عقاب گوانتیا کو چک اور روسی ترکستان کے باسی تھے لیکن وہ بھی پامیر کے پرندوں کو ساتھ لے کر پہنچے تھے۔ کوا، مینا، بٹیر، کھٹکھٹ، چکور، چڑیا، مقامی جنگل کے عوام تھے۔ اس بے میٹنگ میں ان کی اجتماعی ووٹ بہت اہم تھی۔ لیکن انفرادی طور پر کوئی ان کی رائے کو نہ پوچھتا تھا۔ مڑی ہوئی ناک اور نارنجی ازاتوں والے پرندے سفید قوموں کی طرح احساس برتری سے اترائے پھر رہے تھے۔ دریائے گھاگرا اور چترنجی کے حاں سے لٹورے، بھوری کنڈول اور غوغائی بڑے طمطراق اور سلیقے سے فوجی ہوائی جہازوں جیسی فارمیشن بناتی آئیں۔ زریں پشت، نیل کنٹھ اور ہدہدوں کی ٹولیوں نے پرانے درختوں کے ٹھنڈے بسرام کے لیے چن لیے۔ فاختہ کوئل اور چنڈول کو اس مجلس مشاورت سے کوئی دل چسپی نہ تھی ان کے بھانویں انسان جائے۔ ساری کائنات ختم کر دیتا وہ میلے ٹھیلے گھومیاں تو جنگل والوں سے ملنے ملانے چغلی عیب جوئی کے لیے آئی تھیں۔ لیکن جنگل میں پہنچ کر انہیں پتہ چلا کہ معاملہ سنگین ہے۔

کانفرنس سے کچھ دن پہلے سارے بن میں بھانت بھانت کے پرندوں سے کوک پڑی تھی۔ صاحب صدر کا سب انتظار کر رہے تھے۔ کرسی صدارت خالی ہونے کی وجہ سے کانفرنس جاری نہ کی جا سکتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد پرندوں کی نمائندہ ٹولی ماؤنٹ ایورسٹ سے یہ خبر لے کر واپس آئی کہ وہ تمام پربت چھان آئے ہیں۔ دھولا دھار نانگا پربت، کے ٹو اور کنچن جنگا تک ہو آئے ہیں لیکن ہما کا کہیں سراغ نہیں ملا۔ شاید دنیا میں کسی زبردست بادشاہ کی آمد تھی اور وہ اس کے انتخاب میں کائناتی طاقتوں کی مدد کرنے کے لیے اپنے وی آئی پی تور پر نکلا تھا۔ اس دور کے متعلق بھی

پرندوں میں بہت چہ میگوئیاں ہوئیں۔ کچھ شکاری ہوا بازوں کا خیال تھا کہ قیامت کے آثار قریب ہیں اور یہ قیامت خود انسان کے ہاتھوں برپا ہونے والی ہے۔ دنیا کو قیامت سے بچانے کے لیے مردِ مومن کی تلاش ہے اور اس بار ہما بادشاہ کا چناؤ نہیں بلکہ نجات دہندہ کو کھوجنے کے لیے نکلا ہے۔ کچھ پرندے سمجھتے تھے کہ ہما اب صوفی منش ہو چکا تھا۔ وہ انسان کو اتنی بار اللہ کی خلافت کا مشورہ سنا چکا تھا لیکن ہر بار خلیفہ صرف بادشاہ بن کر بیٹھ جاتا۔ ہما کو اس بات کا اتنا دکھ تھا کہ اب وہ اشرف المخلوقات کے سروں پر سے اڑنا گوارا نہیں کرتا۔ اور کہیں چھپ کر وقت گزر رہا تھا۔

بوم جاتی پنے پرائے میں پاؤں اڑانے کے عادی نہ تھے، انہیں اس رائے سے اتفاق نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہما اپنی انفرادی شان کی وجہ سے مشیت ایزدی کو بالکل ملحوظ نہیں رکھتا۔ اسے صرف کسی کسی انسان کی آرزو کی خوشبو ملتی ہے۔ جس کی تعاقب میں وہ پہنچ جاتا ہے۔ اسی لیے ہما جس کندھے پر بیٹھ کر بادشاہت کا اعلان کرتا ہے وہی بادشاہ رعایا کے زوال کا باعث بنتا ہے لیکن الو لوگ چونکہ دیکھنے کے عادی تھے اور بولنے سے پرہیز ان کا شیوہ تھا۔ اس لیے انہوں نے اپنی رائے کا اظہار برملا نہ کیا۔ چپ چاپ رہے اور ٹکر ٹکر صاحب صدر کا انتظار کرنے لگے۔

گو بوم جاتی کے سرکردوں نے اپنی رائے کا اظہار اندر والے سرکل میں کیا تھا۔ لیکن کوے کن سوئی لینے میں اول درجے کے حرامی ہوتے ہیں ویسے بھی انہوں نے بات پہنچانے کا فن آدم زادوں سے سیکھا تھا۔ گول آنکھوں والے الوؤں کی بات سارے میں پھیل گئی اور سارے جنگل میں چہ چہ کی آوازیں آنے لگیں۔ کوؤں کی چھٹ بھیا برادری کو ویسے بھی ہما سرکس کا جوکر لگتا تھا۔ جو ازل سے خود سر بھی تھا اور برخود غلط بھی جب عرصے تک ہما نایاب رہا، تو میٹنگ کی بے جا طوالت سے سب پرندے عاجز آنے لگے۔ کوے بجا طور پر نالاں تھے۔ کیونکہ ان کو جنگل کی عادت نہ رہی تھی۔ وہ کوٹھے منڈیروں پر بیٹھ کر عورتوں کی باتیں سننے کے عادی ہو گئے تھے۔

یہاں شنان کا ساتھ نہ ملا تو یہ بکھیرا پارٹی بہت دق ہوئی۔

اب اکا دکا سیہ نے مکار اور ڈرپوک کوے شاطر شیاست دانوں کی طرح چھوٹے پرندوں کی گنی چنی نفری کو گھیر لیتے اور مشتعل کرتے۔ "لو ہما تو ازل کا احمق ہے بادشاہ چنتا پھرتا ہے دھرتی پر ---- بھائی ادھر دنیا کا ہر انسان بادشاہ چاہے کھری میں سوئے چاہے تخت پر ہما کم عقل یہ نہیں سمجھتا کہ ہر انسان اپنے آپ کا اشرف المخلوقات سمجھتا ہے جس کے سر پر تکبر کا تاج ہو ان کو بادشاہ کیا بنانا۔"

لیکن مور جو پھیلائے سارے جنگل میں ہما کے سواگت کا ناچ ناچتے پھرتے تھے۔ انہیں اس کانفرنس میں آنے کی یہی خوشی تھی کہ وہ استقبالیہ کمیٹی پر ہیں۔ کوے موروں کی ٹولی میں جا نکلتے تو فٹ دوغلی پالیسی تلے کہتے۔ "ہما کی بات کچھ اور ہے۔ --- کرسی صدارت پر صرف وہی سجے گا۔ اگر نہ برا بجے تو چاہے لاکھ کھٹ جوڑ کر و مت کچھ نہ ہوگا۔"

کرسی صدارت دیر تک خالی رہنے کی وجہ سے ہما کے نعم البدل کا ذکر ہونے لگا۔ پھر پرچہ لگا کہ جہاں سے سمندر پر نام کرتا لوٹا تھا اور جہاں پہاڑیوں پر سیپ اور گھونگھے، بچھو صون سنگ، مچھلی کے ڈھانچے اور دوسری سمندری مخلوق مردار پڑی تھی۔ وہاں ایک سیمرغ کا شانتی بھون ہے۔ اس کی عمر کا کسی کو کچھ اندازہ نہ تھا۔ کچھ پرندے مصر تھے کہ سیمرغ بابا نوح کی کشتی میں رفیوجی رہا۔ کچھ کا خیال تھا کہ وہ علاقے جسے آج کل اسرائیل چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں، یہیں غزہ کے علاقے میں مسجد اقصیٰ سے طاقت اخذ کرنے کے لیے سیمرغ کبھی رہتا تھا۔ بوڑھے کچھوے معرض تھے کہ بحیرہ روم کے ساحل میں جس وقت پچھلی رات کو پہلی بار چاندی جیسا پانی بھرنے لگا و رارق جیسی ریت لہروں سے آشنا ہوئی اس ریتلے خطے میں سیمرغ رہتا تھا۔

ساری رات وہ چاند سے نظریں ملائے قوت جذب کرتا رہتا اور سارا دن تپتی

ریت میں پنکھ پھیلائے بنجر اور ویران عمل آفتابی میں مشغول رہتا۔ قسمت بلند تھی کہ سیمرغ کی ہی قوت سے پوٹھوہار علاقہ جنگل ہوا۔۔۔ اگر چاند کی پوری کشش سیمرغ میں نہ بھر آتی۔ ایک بھی پانی کی لہر اس علاقے سے لوٹنے کا ارادہ نہ کرتی۔ عمل مہتابی میں وہ مقناطیسی قوت تھی جس نے پانی کو باہر کی طرف لوٹنے پر مجبور کیا اور آخر میں تمام پانی بحیرہ عرب میں جا گرا۔

راہب طبع سیمرغ کو غل غپاڑے سے نفرت تھی۔ وہ جنگل کے باسیوں سے بڑی وحشت کھاتا تھا۔ بے آباد جگہوں میں رہنا اور جیسے بھر کی خوراک کھانا اس کی عادت تھی۔ لیکن نمائندہ وفد نے اسے ڈھونڈ نکالا اور اس تجربے، فطانت، ذہانت اور نجابت کی قسمیں دے دلا کر اسے میٹنگ میں لے آئے۔ سیمرغ پورے چاند کی رات میں پچھلے پہر آئے اس کے آنے سے چند ثانیے پہلے سارا آسمان درخت توڑ آندھی کی لپیٹ میں آ گیا۔ طوفان سے محبت کرنے والے پرندے اونچی اڑانوں کو نکل گئے۔ ڈرپوک پرندے لمبی شاخوں سے لپٹ کر جھونٹے لینے لگے۔ پھر زور سے بجلی چمکی دھرتی کانپی بجلی اس دھماکے اور چنگاڑے سے چمکی کہ رات دن سی اجلی گئی۔ اس سمے جب تمام پرندے تڑاکے کی بجلی سے دم بخود تھے۔ سیمرغ چودہ سال پرانے بڑ کے درخت پر آ بیٹھا۔ اس کے بیٹھتے ہی آندھی چھٹ گئی۔ درخت ساکت ہو گئے اور بڑ کے درخت میں جیسے فاسفورس کا ایک بڑا فانوس روشن ہو گیا۔ جس وقت سیمرغ نے پر پھڑپھڑا کر اپنی رضامندی کا اعلان کیا تو جنگل پار تک توپوں کے فائر جیسی آواز آئی اور جانوروں نے ایک دوسرے کو کسی بھونچال کے آنے کی خبر دی۔

''اتنی بڑی کانفرنس بلانے کی وجہ کیا ہے؟'' سیمرغ نے سوال کیا۔

چیل جاتی کے گروہ میں سے ایک تنبولن سی چیل نکلی تراہ تراہ کرتی آگے بڑھی۔۔۔

۔۔۔ ''آقا مسئلہ بہت باریک اور توجہ طلب ہے تو دیکھتا ہے کہ آج کل انسان پہلی بار

متحد ہوا ہے اس نے اپنی ایجاد پسند طبیعت کے ہاتھوں زہرہ اور مریخ کے سفر کیے ہیں۔ لیکن انسان کی سرشت میں ایک وصف ایسا ہے جو اس کی تباہی کا باعث ہے۔ ۔۔۔دیوانہ پن۔۔۔۔اپج کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور دیوانے پن سے مشتعل ہو کر اس نے ایسے ہتھیار ایجاد کر لیے ہیں جن سے یہ کرہ زمین کو منٹوں میں تباہ کر دکتی ہے اور اپنے ہمجنسوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتا ہے۔ اے پرندوں کے شاہ! ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم میں سے کچھ پرندے بھی پاگل پن کا شکار ہوتے جا رہے ہیں۔"

مینا نے پر پھڑ پھڑائے اور سب کو متوجہ کر کے بولی۔۔۔۔۔"جس وقت پہلی دیوانگی کا واقعہ ہوا۔۔۔۔قابیل نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا اور کوے نے انسان کی بے بسی دیکھ کر اس کی مدد کی آسمان سے اترا اور ہابیل کی لاش کو مٹی میں چھپانے کا گر سمجھایا۔ انسان کی کم ظرفی ملاحظہ ہو۔ شکر گزار ہونے کی بجائے اس نے ہمیشہ کوے کو ذلیل سمجھا اور پرندوں کو اپنی عقل سے تابع کرنے کی کوشش کی۔

جب بنی قابیل نے جشن منایا تو وہ جنگلی جانور پکڑ کر لائے ان کو ذبح کیا۔ گوشت خود کھایا اور کلے پائے ادھر ادھر پھنکوا دیے اور کتے اور بلی نے گوشت کی کثرت دیکھی۔۔۔۔تو اپنے ابنائے جنس کو چھوڑ کر بستیوں میں آ رہے سیر بھر کر کھایا اور وافر مٹی تلے چھپا چھوڑا۔۔۔۔حرص کا شکار ہوئے۔"

"یہ لمبی داستان ہے آقا۔۔۔۔۔بہت لمبی۔۔۔۔۔انسان لاکھ اشرف المخلوقات سہی ہم اس پر بھروسہ نہیں کر سکتے۔ اس کی صحبت کبھی کسی جانور کو پرندے کو راس نہیں آئی۔"

طوطا مینا کا دشمن تھا اور بدا کر بولا۔۔۔۔"اگر انسان کی صحبت سے دیوانگی کے آثار پیدا ہوتے ہیں، حرص، رغبت کینہ وحسد جنم لیتا ہے تو بتا گدھا حریص کیوں نہیں حالانکہ وہ انسان کا سب سے پرانا ساتھی ہے۔"

مینا جز بز ہو کر بولی۔۔۔۔۔"اور تو بتا اتنی وفاداری کے باوجود۔۔۔۔اتنی نیک

نفسی کے باوصف انسان نے گدھے سے ہمیشہ کیا سلوک کیا؟ کس قدر بوجھ لادتا ہے وہ ان بے زبانوں پر۔۔۔۔اور جس کسی کی عزت مقصود نہ ہو اسے گدھا پکارتا اور سمجھتا ہے، انسان کا کیا ہے یہ تو دودھ پلانے والے جانوروں کا کام نکل جانے پر قصائی کے حوالے کر دیتا ہے۔ انسان کی بات درمیان میں نہ لاؤ دوستو ورنہ بحث لمبی ہو جائے گی۔"

چیل اسی بندر گھاؤ سے پریشان ہو کر بولی۔۔۔۔۔"ملزم کے نفع نقصان پر اس وقت بحث فضول ہے سزا دو۔۔۔۔اور نکال دو۔۔۔۔سزا دو اور نکال دو۔"

کاہو جیسے سیاہ لباس والی کوئل بولی۔۔۔۔۔"سوچ لو ذرا دوستو۔۔۔۔انسانوں کی بستی سے گدھ جاتی لوٹ نہ سکے گی۔ آخر گدھ کا ہمارے ساتھ پرانا رشتہ ہے، وہ ان درختوں پر ہمارے ساتھ رہا ہے بھلا وہ انسان کی صحبت میں کیسے تندرست ہو گا۔ کیسے شفایاب ہو گا؟"

"تجھے شفایابی کی پڑی ہے ہم کہتے ہیں کہ بہت جلد اس کا پاگل پن سارے جنگل کو لپیٹ میں لے گا۔۔۔۔اور پھر کوئی چارہ نہ چل سکے گا۔۔۔۔" ایک جہاں دیدہ چیل بولی۔

چیلوں کو بحث سے کوئی غرض نہ تھی، ان کو سزا سے علاقہ تھا اور وہ صرف سزا کے متمنی تھے۔

سارے جانور کوئل کی بات سن کر گردنیں جھکائے بیٹھے تھے۔

بوڑھی نظر چیل پھر گویا ہوئی۔۔۔۔"ہم عاقلوں کو اس بحث سے یک گونہ تشفی ہوتی ہے لیکن مکمل تسلی نہیں ہوئی۔ ہمارا مطالبہ صرف ایک ہے کہ گدھ جاتی کا حقہ پانی بند کر کے انہیں جنگل بدر کر دیا جائے۔ پھر چاہے یہ آبی جانوروں سے ناطہ جوڑیں چاہے انسانوں میں جا بسیں۔ بس پرندوں میں ان کا شمار نہ ہو۔"

اس وقت سیاہ بگلا اٹھا اور ایک ٹانگ پر ایستادہ ہو کر بولا۔۔۔۔"دانشوروں کی محفل

میں میرا بولنا معیوب ہے، پر گدھ سے بھی پوچھ لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے۔"

فسفورس کی بتی تین بار چمکی اور آواز آئی۔۔۔۔"کہہ گدھ راجہ کیا تجھے اعتراف ہے کہ تو دوسرے پرندوں کی طرح نہیں ہے۔۔۔۔ تجھے دیوانگی کے دورے پڑتے ہیں؟"

راجہ گدھ اونچے درخت کی آخری ڈالی سے اترا اور سوکھے تال میں سب کو مخاطب کر کے بولا۔

"ہاں آقا! چاند راتوں میں اونچے چھتنارے درختوں سے میں خود ہی گر پڑتا ہوں۔ پھر میری حالت اپنے بس کی نہیں رہتی میں اپنے ہم جنسوں کو اپنے ماحول کو پہچاننے سے قاصر رہتا ہوں اور ایسی سمتوں میں نکل جاتا ہوں جو کبھی کہیں نہیں جاتیں۔"

"یہ ایسا کرنے پر کیوں مجبور ہے۔۔۔۔؟ کیونکہ کوئی پرندہ اس دیوانگی کا مرتکب نہیں۔"

"مان گیا، مان گیا۔۔۔۔"چیلوں کے گروہ سے آواز آئی۔

"جس وقت ہم دیوانگی کے آزار سے مغلوب ہو کر روتے ہیں، ہم آپے میں نہیں رہتے آقا۔۔۔۔ ہم خود نہیں جانتے کہ یہ دیوانگی کیوں ہے۔ ہم گناہگار ضرور ہیں لیکن کیوں ہیں، اس کا بھید ہم پر آج تک نہیں کھلا۔۔۔۔ کوئی ہمیں بتا سکے تو ہم اس کا احسان ماننے کو۔۔۔۔ تیار ہیں۔"

اس وقت نجد کی رہنے والی ایک بلبل بولی۔۔۔۔"دوستو! میں ریگستان کی رہنے والی ہوں، میرے حلق میں حدی خوانوں کے نغمے ہیں اور میرے سینے پر انسان کے عشق کا لہو جم گیا ہے۔ میں صدیوں سے دیکھتی آئی ہوں اور تمہیں بتاتی ہوں کہ گدھ کی دیوانگی کا سراغ انسان کی پراگندگی میں ملے گا اور انسان کے پاگل پن کی وجہ ایک ایسی قوت میں پنہاں ہے جو اگر آگے نہ جائے تو ریزہ ریزہ کرنے لگتی

ہے۔"

جنگل میں الو سب سے زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ یکدم متوجہ ہوا۔۔۔۔۔"کیسی قوت؟ میکینکل انرجی۔۔۔۔اٹومک انرجی۔۔۔۔الیکٹریکل انرجی۔۔۔۔ پوٹینشل کہ کائی نیٹک ساؤنڈ کہ لائٹ انرجی؟"

بلبل سرخ سینہ پھلا کر بولی۔۔۔۔"ان سب قوتوں کا مرکب تیز رہوا تو انسان کی قوت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔"

سب حیرانی سے بلبل کا چہرہ تکنے لگے۔

"انسان اسی وقت کی بدولت دیوانہ ہوتا ہے۔۔۔۔مان لو صاحبو جب قوت کو نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تو پھر وہ اس باسن کو توڑ دیتی ہے جس میں اسے جمع کیا جاتا ہے۔"

"تجھے کیسے پتہ چلا؟۔۔۔۔۔کیسے کیسے کیسے؟"

"میں نجد کی رہنے والی ہوں میرا شیخ جب تجارت کی غرض سے دوسرے ملکوں کا سفر کرتا ہے تو مجھے سونے کے پنجرے میں ساتھ رکھتا ہے۔ ایک مرتبہ مجھے بنارس کے ایک منیاسی نے بتایا تھا کہ انسان کے دیوانہ پن کی اصل وجہ کیا ہے؟"

"بول۔۔۔۔بتا۔۔۔۔سربستہ راز کھول۔۔۔۔"

"انسان کی ساری قوت اس کی جنسی طاقت میں پوشیدہ ہے، وہ جانوروں اور پرندوں کی طرح محض نسل بڑھانے کو اپنی جنس استعمال نہیں کرتا، بلکہ طاقت کے اس مشکی گھوڑے کو اپنی رانوں میں دبا کر رکھتا ہے۔ پھر یہی برق رفتار اسے دنیا اور دین کی مسافتیں طے کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس گھوڑے پر انسان کے زانو سختی سے کسے ہوں تو وہ عرفان تک پہنچتا ہے۔ ڈھیلا بیٹھا ہو تو دیوانہ وار گرتا ہے اور پاگل کہلاتا ہے۔ دنیا کا عرفان ہو تو شاعری، مصوری، موسیقی، آرٹ جنم لیتا ہے۔ دنیا درکار نہ ہو قوت تیز ہو تو عرفان کی حدیں چھو لیتا ہے اگر یہ قوت منقبض ہو جائے تو خودکشی کرتا

ہے۔۔۔۔عشق لاحاصل ہو جائے اور گھوڑا سوار کو گھسیٹے تو انسان پاگل ہو جاتا ہے۔ لوگ اسے پتھر مارتے ہیں، زنجیروں سے باندھتے ہیں۔۔۔۔دیوانگی کی اصل وجہ یہی عشق لاحاصل ہے آقا۔"

ذسفورس کی بتی تین بار بجھی اور آواز آئی۔۔۔۔"لیکن انسان کی دیوانگی سے گدھ جاتی کا تعلق؟"

"علم ہمیشہ معلوم سے نامعلوم کی طرف لے جاتا ہے۔۔۔۔کیا ہم انسان کی دیوانگی سے یہ پتہ نہیں لگا سکتے کہ کہیں رجہ گدھ بھی ایسی ہی قوت رکھتا ہو۔؟"

"عشق لاحاصل کی قوت؟۔۔۔۔"سرخاب نے سوال کیا۔

"ہاں۔۔۔۔اس کو کسی طرح وہی طاقت حاصل ہو گئی ہے"بلبل بولی۔

"اللہ کے دیئے ہوئے رزق کی قسم! سچ سچ بتا۔۔۔۔کیا تو اس طاقت سے مزین ہے؟"

رجہ گدھ نے سراسیمگی کے عالم میں پھڑ پھڑائے اور بولا۔۔۔۔"آقا! مجھے مہلت دے میں اپنے بھید سے خود آگاہ نہیں ہوسکتا ہے کہ یہی وجہ ہو لیکن اگر تو مجھے کچھ وقت عنایت کرے تو میں اپنی برادری والوں سے مشورہ کروں اور پھر ساری کیفیت عرض کروں۔"

سیمرغ نے ذسفورس کی لالٹین بجھا دی زور سے بادل گرجا، یکبارگی بجلی یوں کڑکی کہ تمام پرندوں کی نگاہوں میں جنگل سفید ہو گیا۔ پھر اگلی میٹنگ تک کانفرنس ختم ہو گئی۔۔۔۔پرندے ہولے ہولے ٹکڑیوں میں اڑنے لگے اور کچھ دیر کے بعد جنگل صرف سانپوں کی سائیں سائیں فیڈ بیک کرنے لگا۔

کلاس میں پہلے چند روز لڑکے داخل ہوئے۔

لیکن رفتہ رفتہ بور جھڑنے لگا۔ کسی کو کورس مشکل لگا۔ کوئی ماحول سے مطابقت نہ

پیدا کرسکا۔ کسی ایک کو لڑکیوں کی صحبت خائف کرگئی۔ ایک آدھ اس لیے چلا گیا کہ پڑھائی کے علاوہ کسی دوسری فیلڈ میں کمائی کے امکانات زیادہ روشن تھے۔ لڑکیاں ہمیشہ کی طرح ڈٹی رہیں عورت میں ڈٹے رہنے کی بڑی قوت ہوتی ہے۔ بہت جلد کلاس میں ہم صرف پانچ لڑکے رہ گئے پانچ لڑکیاں اور پانچ لڑکے اور اتنی متناسب تعداد کے باوجود سیمی شاہ اور آفتاب کے علاوہ ہم میں جوڑا جوڑا بننے کی صلاحیت نہ تھی۔

سالانہ سپورٹس کے دن سارے کالج میں ہر زبان پر سیمی اور آفتاب کا سکینڈل تھا اتنی جلدی اس قدر دیدہ دلیری اور اپنائیت سے کوئی طالب علم کسی لڑکی کی طرف بڑھنے کی جرات نہیں کرسکتا۔ لیکن وہ دونوں غالباً اس سکینڈل کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، سیمی اپنی ہم جماعت لڑکیوں سے مکمل طور پر کٹی ہوئی تھی۔ طیبہ اور فرزانہ تو خیر مڈل کلاس کی لڑکیاں تھیں ان کی انگلیاں تو شروع دن سے منہ میں تھیں۔ لیکن کوثر جو خود گلبرگ کی پیداوار تھی۔ وہ بھی اپنی تمام تر جدیدیت کے باوجود ابرو اٹھائے اور کندھوں پر عیسائی لڑکیوں کی طرح کراس کا نشان بنائے بغیر نہ رہ سکتی تھی۔ انجیلا اہتہ سارے سکینڈل سے بچ کر چلا کرتی۔ ہر بات سے بچتے رہنے کی وجہ سے اس کا چہرہ ہمیشہ خوفزدہ رہتا۔

جوں جوں ان دونوں میں فاصلے کم ہوتے گئے اتنا ہی بلاوجہ۔۔۔۔۔ بغیر سوچے سمجھے اور اپنی بہتری کے خلاف میں سیمی کا گرویدہ ہوتا چلا گیا۔ دل بھی عجیب چیز ہے جب ماننا نہ چاہے تو لاکھ ثبوت کرو، ہزار دلائل ہوں کچھ نہیں مانتا۔ آفتاب اور سیمی ساتھ ساتھ بیٹھے تھے ان کے نوٹ سانجے تھے۔ کتابیں ایک تھیں، وہ ایک پین سے باری باری لکھتے تھے۔ موٹر سائیکل پر میں نے انہیں آتے جاتے کئی بار دیکھا کیفے ٹیریا پر وہ ایک گلاس میں دو سٹرا ڈال کر مشروب پیتے۔ کالج میں تمام ایک کی خیریت دوسرے سے پوچھتے۔ اس کے باوجود مجھے شبہ تک نہ تھا کہ سیمی آفتاب سے محبت

کرتی ہے۔۔۔۔کیونکہ میرا دل اس بات کی گواہی دیتا رہتا تھا کہ یہ سب چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔۔۔۔انسان لاحاصل کے پیچھے کر کتنی لذت حاصل کرتا ہے۔

سالانہ سپورٹس ڈے پر سارا کالج نصف دائرے والے لان میں جمع تھا۔زیادہ تر نظریں آفتاب اور سیمی پر تھیں۔جو کرسیاں کم ہونے کی وجہ سے ایک ہی کرسی پر ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔پھر لڑکیوں کی چاٹی ریس اناؤنس ہوئی۔سپورٹس کلب والے ہماری سوشیالوجی کی لڑکیوں کو منا کر گراؤنڈ میں لے گئے اس ریس کے دوران کوثر اور سیمی نے جینز پہن رکھی تھی اور طیبہ اور فرزانہ کھلے پائینچوں کی شلوار میں چاٹیاں سر پر اٹھائے بھاگ رہی تھیں۔کالج کے کئی حلال زادے بازوں اٹھائے بے پردگی بھاگتی ان ہرنیوں کو دیکھ کر دل ہی دل میں حرامزادے ہو گئے تھے۔

ایسوں ہی میں سے یک میں بھی تھا۔

فرزانہ کی چاٹی ٹوٹ کر پاش پاش ہوئی سیمی نے کئی فاؤل کیے۔طیبہ بھاگی تو جی داری سے لیکن کوثر سے پیچھے رہ گئی۔بالآخر چاٹی ریس میں کوثر سے سیمی ہار گئی اس کے بعد آفتاب اور سیمی چند لمحے ٹھہرے اور پھر دونوں ادول چھوڑ کر خدا جانے کہاں چلے گئے۔

اس روز پہلی بار میرے دل میں شبہ پیدا ہوا کہ شاید سیمی اور آفتاب دور نکل گئے ہوں۔

یہ شبہ میرے دل میں کوثر نے ڈالا۔وہ چاٹی ریس میں فسٹ آئی تھی۔اس کا چہرہ تمتمایا ہوا اور گردن پر پسینے کے قطرے تھے۔سیمی کی غیر موجودگی میں وہ بہت سمارٹ ہشاش بشاش اور قابل قبول لڑکی لگتی تھی۔کرسیوں کی کمی تھی۔ اس کی واپسی پر میں نے اپنی کرسی اسے پیش کر دی اور سامیانے کے کھمبے کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔

"چلی گئی۔۔۔۔؟"

"کون؟۔۔۔۔"میں نے پوچھا۔

"ہاں جی چلی گئی۔۔۔۔۔" پچھلی قطار سے امجد نے جواب دیا۔

اس وقت ساری کلاس جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی تھی۔

"اور وہ بھی ساتھ گیا اس کا چمچہ۔۔۔۔" کوثر بولی۔

"گیا۔۔۔۔" جمال نے جواب دیا۔

ہاتھ کٹے ہوئے بال دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر اس نے پسینہ آلود گردن سے وپر کیے۔

"Competition تو ذرا برداشت نہیں کرتی۔ کیسے بھاگی ہار کے۔" طیبہ اور فرزانہ دوپٹوں سے منہ پونچھتی ہوئی ہنسنے لگیں۔ انجیلا البتہ اپنے ناخنوں کو دیکھتی رہی۔۔۔۔ وہ ازل کی بے چاری تھی۔

"ابھی تو چاند ریس ہاری ہے۔۔۔۔ جب آفتاب ریس ہارے گا تو پتہ نہیں کیا حشر ہوگا اس کا۔"

کوثر کی زبان پر عورت کا ازلی حسد تھا غصے کی وجہ سے مجھے اس کی شکل بھی کچھ کچھ ٹیڑھی لگ رہی تھی۔ پھر سپورٹس کلب کا ایک جوان ان تین لڑکیوں کے لیے کوکا کولا لے کر آ گیا۔ فرزانہ اور طیبہ تو شاید "عصمت بچاؤ" قسم کی لڑکیاں تھیں انہوں نے کوکا کولا پینے سے انکار کر دیا۔ لیکن کوثر نے بوتل شکریے کے ساتھ وصول کی نواڑی رنگین کرسی پر بیٹھی اور کوکا کولا پیتے ہوئے سیمی کے کردار، آفتاب کی کمزوری کلاس کی بدنامی پروفیسروں کی بے بسی پر بڑی لمبی چوڑی گفتگو کا آغاز کیا۔ کوثر تعارفی تقریب والے دن سے زخم خوردہ تھی۔ گو اس کا مبلغ علم سیمی سے کم تھا۔ لیکن وہ گلبرگ کے مس بولے وارڈ سے آتی تھی۔ جہاں شہر کے امراء رہتے ہیں۔ سیمی کے متعلق سن رکھا تھا کہ اس کے ابا کا گھر گلبرگ کی ایکسٹینشن نمبر تین میں تھا۔ اور وہ ماں باپ کے پاس رہنے کے بجائے کسی ہوسٹل میں مقیم تھی۔

"ایسی لڑکیاں پڑھنے تھوڑی آتی ہیں۔ اگر اس لیے ہے کہ آزادی ہو۔۔۔۔ اور

کیا۔"

بڑی دیر تک طیبہ اور فرزانہ کانوں کو ہاتھ لگاتی رہیں۔

دراصل ساری بات ڈگری کی ہوتی ہے برقعے والیاں، بے نقاب لمبی چوٹی والی کو آزاد خیال سمجھتی ہیں۔ لمبی چوٹی والی کٹے بالوں والی کو بے حیا جانتی ہے۔ بوائے کٹ کا خیال ہوتا ہے کہ اس کے تو صرف بال ہی کٹے ہیں اصل حرافہ تو وہ ہے جو دن کے وقت مسکارا بھی لگاتی ہے اور آئی شیڈ وبھی آئی شیڈ و والی کو یقین ہوتا ہے کہ وہ بے چاری تو اللہ میاں کی گائے ہے۔ اصل میں تو وہ اچھا چھوکا ہے جو دوپٹہ نہیں اوڑھتی See through کپڑے پہنتی ہے اور سب کے سامنے سگریٹ پینے سے نہیں چوکتی سگریٹ نوش بی بی کے سامنے وہ فساد ہوتی ہے جو نامحرموں کے ساتھ بیٹھ کر بیو فلم دیکھتی ہے۔۔۔۔۔۔وغیرہ وغیرہ۔

اسی طرح مردوں میں بھی نیکی کی تعلّی موجود ہوتی ہے اور اس کی کئی ڈگریاں مقرر ہوتی ہیں جو شخص صرف نظر باز ہے اور اچٹتی نظر سے لڑکیوں کو آنکتا ہے وہ ان مردوں کو بدمعاش سمجھتا ہے جو لڑکیوں کی محفل میں راجہ اِندر بن کر بیٹھتے ہیں اور لطیفوں اور کہانیوں سے فضا کو غزل الغزلات کی طرح رومانٹک کر دیتے ہیں عورتوں سے باتیں کرنے کے رسیا ان مردوں کو غنڈہ سمجھتے ہیں جو اندھیرے سویرے کواڑ کے پیچھے سیڑھیوں کے اندھیرے میں غسلخانے کی سنک کے پاس چوری چھپے کسی لڑکی کو بازوؤں میں لے لیتے ہیں۔ چوری چھپے بلے اڑانے والے ان حضرات کو عادی مجرم سمجھتے ہیں جو کھلے بندوں عورتوں کو کاروں میں بٹھاتے اور ہوٹل کے کمرے بک کراتے ہیں کھلے عاشق ان پر آوازے کستے ہیں جو زنا کے مرتکب ہوتے ہیں اور زنا کار ت پر نکتہ چینی کر کے بے قیاس راحت محسوس کرتے ہیں جو زنا بالجبر کرتے ہیں ور قانون کی گرفت میں ملزم ٹھہرائے جاتے ہیں

یہ ساری باتیں آپنے آپ کو بری الذمہ کرنے کے لیے کی جاتی ہیں اور ان میں

تمام لوگ سوسائٹی سے اپنے لیے Approval کا ایک جائز طریقہ تلاش کرتے ہیں ورنہ بات ساری ڈگری کی ہے۔۔۔۔کسی کو ہلکا بخار ہوتا ہے۔۔۔۔کسی کو زیادہ۔۔۔۔کسی معاشرے میں شرافت کا درجہ نارمل متعین کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے۔

"ہوا کیا ہے۔۔۔۔" آخر کو جمال نے سوال کیا۔

"ہوا کیا نہیں۔۔۔۔تم کسی فسٹ ایئر لڑکے سے پوچھ لو۔۔۔۔سٹاف روم میں جا کر کسی کیمسٹری کے پروفیسر، حساب اردو کے پروفیسر سے پوچھ لو۔۔۔۔یسی بیگم کو عشق ہو گیا ہے آفتاب سے۔۔۔۔کوثر بولی"

ٹھن سے کسی نے میرے سر پر لوہے کی ہتھوڑی ماری۔

پہلی بار مجھے خیال آیا کہ شاید یسی مجھ سے محبت نہ کر سکے۔

سب سے پہلے مجھے یسی کے اظہار اشتہار متاثر کیا۔۔۔۔وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی تھی یا کھانا چاہتی تھی۔

ہر عہد میں ہر معاشرے میں مختلف عمر کی عورتیں اپنی اشتہار کی نمائش کرتی رہی در پردہ ہو جاتی ہے۔ وہ نہ صرف عام محفلوں میں چڑی چوگا کھانے لگتی ہیں بلکہ اشتہار کے اظہار سے بھی انہیں نفرت ہو جاتی ہے کیونکہ ایک بھوک سے ہمیشہ دوسری بھوک کا سراغ چلتا ہے۔ پچھلی صدی میں بھوک کی نمائش جنسی آوارگی کے مترادف تھی۔ میلے ٹھیلوں پر یاروں سے لڈو جلیبیاں لے کر کھانے والی ہتھو مردوں میں تو مقبول تھی لیکن اپنی ہم جنسوں میں وہ بڑی بدنام تھی اور سسرال جا کر بسنا اس کے لیے مشکل تھا۔

لیکن اس دور کی ماڈرن لڑکی نے کھانے کے آداب ہوٹلوں سے سیکھے ہیں۔۔۔۔ڈائننگ ٹیبل کی میز سے اخذ کیے ہیں۔ ہوائی جہازوں کے سفر میں جہاں اپنے اپنے ٹرے لگے لگائے آتے ہیں اور جہاں آپ کے ٹرے میں دوسروں کی شراکت

ممکن نہیں ۔ ن ہوٹلوں ہوائی سفروں نے لڑکیوں کا نہ صرف جھجک کا ٹانکا علیحدہ کر دیا ہے بلکہ ان کی بھوک کو فرداً فرداً بڑی اہمیت دے دی ہے۔ اب بیف برگر چبانے والی دوہرے سٹرو سے کوک پینے والی زبان کے چٹخارے سے کون چاٹنے والی لڑکی ندیدی نہیں دل آویز ہے اتنے سارے ٹیلی ویژن کے اشتہاروں میں ماڈلز کو چائے پیتے، چیونگ گم چباتے بسکٹ کھاتے دیکھنے کے بعد کھاتی پیتی لڑکی مرد کا آئیڈیل بن گئی ہے۔

ویسے بھی مرد کا عورت کی بھوک سے ڈھکا چھپا لیکن بڑا پرانا رشتہ ہے جب کبھی کوئی مرد کسی عورت کے عشق میں مبتلا ہوتا ہے تو اسے اس عورت کی بھوک مٹانے کا چسکہ پڑ جاتا ہے پھر وہ اس کی جذباتی بھوک مٹانے کے لیے اس کا سہارا بنتا ہے، ذہنی خلا جو بھوک ہی کی شکل ہے ختم کرنے کو اس سے باتیں کرتا ہے اس کی جذباتی بھوک کے لیے تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے۔ جسمانی بھوک بچوں کا باعث بنتی ہے اور پھر ان ہی چھوٹی چھوٹی اشتہائیں ختم کرنے میں اس کی زندگی صرف ہو جاتی ہے۔

پرانے زمانے میں بھی شوہر اپنی ماؤں سے چھپ کر اپنی نویلی بیویوں کی ذہنی جذباتی جسمانی بھوک مٹانے اوپر والی منزل میں جاتے تو ان کے ہاتھ میں قلاقند کے دونے اور موسری کے ہار ہوتے۔۔۔۔ آج بھی جب ملاقات ہوتی ہے تو کوک پلانے کون کھلانے والا اسے اپنی نیک نصیبی سمجھتا ہے۔

ماڈرن لڑکی یہ بھید سمجھ گئی ہے کہ بھوک کا کھلا وا مرد تک یہ پیغام پہنچاتا ہے کہ اگر وہ کھانے پینے میں سرگرم ہے تو جنسی بھوک میں بھی مرد سے کم نہ ہو گی۔۔۔۔ وہ ایک سمبل سے اپنے تمام کوائف سمجھا دیتی ہے اپنی بھوک کو نمایاں کرتے ہی آج کی لڑکی مرد کی بھوک میں برابر کی شریک ہونے کا وعدہ کرتی ہے۔

حبیبہ کوثر اور فرازنہ سے کسی خوبصورت تو نہ تھی۔ لیکن وہ لباس میں، نشست و برخاست گفتگو کھانے پینے میں سب سے آگے تھی۔ جب کبھی وہ کلاس میں داخل

ہوتی اس کے منہ میں چیونگ گم ہوتی جونہی پروفیسر کلاس سے جاتا وہ اپنے کینوس کے تھیلے میں سے سیب نکالتی اور اسے آستین پر صاف کر کے کھانے لگتی ۔۔۔۔ سیب کھانے کا بھی اس کا عجیب طریقہ تھا وہ سیب میں تیکھے دانت اتارتی اور کڑک کی آواز کے ساتھ منہ پرے کر لیتی ۔ ایک ہی ہفتے کے اندر اس کا سیب ساری کلاس میں گھومنے لگا تھا

"ایک Bite لے لو ۔۔۔۔" ایک دن اس نے مجھ سے کہا۔

میں ایک ایسے گھر سے سوشیالوجی کی کلاس میں گیا تھا جہاں جھوٹے برتنوں میں کھانا گناہ ہوتا ہے۔

"اس طرف سے کھا لو ۔۔۔۔ میں نے یہاں نہیں کھایا"

اس نے سیب کی صاف ستھری طرف پیش کر دی۔ میں نے سیب اس سے لیا اور عین وہاں دانت گاڑ دیئے جہاں سے اس نے کڑاک سیب کاٹا تھا۔

بھوک کے معاملے میں وہ بہت بودی تھی ۔ وہ گھنٹے گھنٹے کے بعد بھوکی ہو جاتی۔ یوں سمجھیے، یہ اس کا لاڈ تھا ۔۔۔۔ بہت جلد ہماری کلاس ایک خاندان کا روپ اختیار کر گئی ۔ اسی بے میں کی باتیں کسی کو عجیب نہ لگتی تھیں۔

"بھئی میرے پاس بکھر پیسے ہیں ۔۔۔۔ لیکن مجھے کوک پینا ہے ۔۔۔۔ ہے کوئی اللہ کا بندہ ۔۔۔۔؟"

اللہ کا بندہ آفتاب ہمیشہ اس کی ساتھ والی سیٹ پر ہوتا۔

اچھا بھئی اور کون کون کوک پینے جائے گا؟

ادھر پورے سبھی تیار ہو جاتے۔

پھر سب اپنی اپنی نقدی اس کے ڈیسک پر دھرتے جاتے۔ وہ حساب لگاتی جب رقم پوری ہو جاتی تو ہم سب کوک پینے چلے جاتے کینٹین پر بھی عجب تماشہ رہا کوئی سیون اپ منگواتا کوئی فانٹا منگواتا کوئی کوک ۔۔۔۔ اب سبھی کسی سے مانگ کر

گھونٹ پیتی کبھی اپنی بوتل پیش کر کے کہتی۔

''پی و حبیبہ۔۔۔۔ تم نے تو فانٹا منگوایا ہے۔۔۔۔ سیون اپ کا بھی ایک سپ لے لو بھئی۔۔۔۔''

جب حبیبہ ہچکچاتی تو وہ اپنے کینوس کے تھیلے میں سے ٹشو پیپر نکال کر بوتل کا منہ صاف کرتی اور کہتی۔

''خدا قسم اب تو کوئی ہرج نہیں ہے۔''

شروع شروع میں سیمی ایسی Sporty لڑکی نظر آئی کہ کلاس والوں کو شبہ تک نہ ہوا کہ وہ آفتاب کی ہپ پاکٹ میں ہے۔ ان دنوں میں ہر روز اس میں کوئی نئی بات کوئی نئی ادا اور کوئی نئی دریافت کرنے کی سٹیج میں تھا۔ میری یہ سٹیج تحیر کی تھی جو کچھ مجھے نظر آتا میں اسے پوری طور پر ہضم بھی نہ کر پاتا کہ دوسرے دن اس میں کچھ اور نیا، کچھ اور دلچسپ اور حیران کن نظر آجاتا۔۔۔۔ سب سے بڑی تبدیلی جو آفتاب سے ملنے کے بعد اس میں آئی اردو کی سوجھ بوجھ تھی۔ اب وہ ایسی اردو بولنے لگی تھی کہ بڑے بڑے اردو باز اس کا منہ دیکھتے رہ جاتے۔

سوشیالوجی کی کلاس میں وہ سب سے باتونی لڑکی تھی پروفیسر کے نظریات سے ٹکر لینا اور چھوٹے سے لطیفے پر دیر تک ہنستے رہنا اس کا محبوب مشغلہ تھا دراصل اس میں وہ خوش اعتمادی کا خمیر تھا جس سے اس کی شخصیت کی تمام دل آویزی میں پھول لگے تھے۔

بھوک کی نمائش کے بعد سیمی میں بڑی جنسی کشش تھی وہ عموماً گردن پیچھے کر کے غرغر کرتے انداز میں منہ کھول کر بات وار آواز میں ہنستی ایسے میں اس کے کندھے بازو پیٹ چھاتیاں سب ہلکورے لینے لگتے۔ اس کا قہقہہ عام طور پر مصنوعی ہوتا لیکن اس قدر بناوٹی ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ لپ سٹک، بریزئر اور سینٹوں کے اشتہاروں کی طرح کوئی چیز آپ کو یقین دلاتی تھی کہ قہقہہ محض

اشتہار ہے اصل سمی اس اشتہار سے بھی اچھی ہوگی۔

بند بانگ قہ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔ بدقسمتی سے اس روز وہ میرے بہت قریب بیٹھی تھی حالانکہ اس کا بازو آفتاب کی کاپی پر تھا۔ لیکن اس قربت نے مجھ پر ایسے اثر کیا کہ یکدم ہنستے ہنستے میں اسے دیکھنے لگا اور پھر ہنس نہ سکا۔

کچھ لمحے بڑے فیصلہ کن ہوتے ہیں اس وقت یہ طے ہوتا ہے کہ کون شخص کس کا سیارہ بنایا جائے گا جس طرح کسی خاص درجہ حرارت پر پہنچ کر ٹھوس مائع اور مائع گیس میں بدل جاتا ہے اسی طرح کوئی خاص گھڑی بڑی نتیجہ خیز ہوتی ہے اس وقت ایک قلب میں طلوع ہوتا ہے وہی دوسرے آئینے میں منعکس ہو جاتا ہے دوسرے قلب کی اپنی زندگی ساکت ہو جاتی ہے اس کے بعد اس میں صرف بازگشت کی آواز آتی ہے جس وقت میں سمی کے عشق میں مبتلا ہوا مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ آفتاب کی محبت میں اس قدر دور نکل چکی ہے۔۔۔۔ دراصل سمی جیسی لڑکیوں پر محبت کرنے کا کبھی شک بھی گزر نہیں سکتا۔ وہ جاتی شرماتی تو ہیں نہیں کہ آدمی اندازے لگا سکے ہم پانچوں طالب علموں کے ساتھ اس کی خوب بجشار ہی تھی۔

فرزانہ اور حبیبہ متوسط گھرانے کی لڑکیاں تھیں س لیے ان میں جراءت کی کمی بھی تھی اور سچائی کی بھی۔۔۔۔ کوثر درمیان میں تھی۔۔۔۔ کبھی ہو کر مذاق کر لیتی بھڑک سرخ۔۔۔۔ بھلا اس پر میں کیسے شبہ کرتا کہ اندر ہی اندر وہ جل بجھا ہے۔

حسن اتفاق دیکھئے کہ آفتاب اور میں روم میٹ تھے۔ ہوسٹل کے ہم کمرہ دوست بھی ہوتے ہیں اور حریف بھی ان کا سب سامان سانجھا بھی ہوتا ہے اور اس شراکت کے باعث ان میں جھگڑے بھی رہتے ہیں ہم کمرہ کے سیفٹی سے بلیڈ چرانا، اس کے صاف تو بے سے گندہ پسینہ پونچھنا' پیسے ادھار لے کر نہ لوٹانا' اس کی حاضری میں سے کھانا' بغیر اجازت کے ٹائی لے کر استعمال کرنا اور ڈرائی کلین کرائے بغیر لوٹانا۔

اپنے سلیپر خشک اور روم میٹ کے سلیپر غسل کے بعد گیلے کرنا' تیل لگانے کے بعد ہم کمرہ کے صاف تکیے کو دوہرا کر کے گردن تلے فٹ کرنا' نئی جرابیں مانگنا' گندے رومال بخوشی آفر کرنا' مجموعی طور پر لڑکیوں کو زیر بحث لانا اور اصلی لڑکی کے ذکر کو گول کر جانا۔۔۔ یہ سب باتیں ایک ہی کیوبکل میں رہنے والوں میں چلتی رہتی ہیں لیکن آفتاب اور میں پورا ففتھ ایئر اور سکستھ ایئر کے چھ ماہ ساتھ رہے۔۔۔ ہمارے پلنگ' ٹرنگ اور میز تو ساتھ ساتھ تھے۔

لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے مکمل طور پر اجنبی ہی رہے۔

نہ صرف ہماری عادتیں مختلف تھیں بلکہ ہم مختلف ماحول کی پیداوار بھی تھے۔

اگر میں گھاس تھی تو آفتاب پھول تھا۔ گورا چٹا کشمیری جس کی شربتی آنکھیں براؤن بال اور بڑی چوڑی چکلی کاٹھی تھی۔ اس میں قد سے لے کر رنگ تک ہر توں سے لے کر خاموشی تک عادتوں سے لے کر جبلی سرشت تک وہ سب کچھ تھا جس سے لڑکیاں پیار کرتی ہیں۔ وہ شکلاً اتنا معصوم اور بھولا تھا کہ اسے دیکھ کر ہر لڑکی میں ایک ماں بیدار ہو جاتی۔ لڑکیوں کے سامنے اس بلا کا خاموش رہتا کہ سب کا جی محبوبہ کی طرح اسے گدگدانے کو چاہتا۔ ذرا سی طبیعت کے خلاف بات ہو جاتی تو اس کی شکل مجروح ہو جاتی' شربتی آنکھیں نمناک نظر آتیں۔ اب باتوں کے پچھے لے کر سب لڑکیاں نرس بننے پر آمادہ ہو جاتیں۔ آفتاب قالین فروشوں امیروں کا ایک ڈیڈ بیٹا تھا جس کی گھٹی میں پریم رچنا تھی۔ وہ اس قدر سیر چشم سیر دل آدمی تھا کہ نہ اسے دولت کی بھوک تھی نہ محبت کی نہ وہ شہرت کی تلاش میں تھا نہ ترقی کی۔۔۔ وہ ان تمام نعمتوں میں ہر وقت رہتا تھا۔ مچھلی جیسے جل میں رہتی ہے۔ اس کے لیے یہ سب کچھ سوج کی طرح ضروری اور سورج کی ہی طرح غیر اہم تھا۔ اس نے کبھی کسی کلاس میں کسی پروفیسر سے بحث نہیں کی۔ بس نما نما مسکراتا رہتا۔ ہم سب میں جب سیاسی بحثیں ہوتیں اور ہم نوائے وقت' امروز' مساوات' جنگ' مشرق سے ہو کر

نیوز ویک اور ٹائم ویک اور ٹائم تک پہنچے۔ تب بھی وہ خاموش رہتا۔ وہ کسی کو مرعوب کرنے کے لیے یا خود کسی سے مرعوب ہونے کے لیے خواہ مخواہ کوئی پنگا نہیں لیتا۔ جب کبھی وہ بات کرتا تو اس کی بات میں وزن ہوتا ۔۔۔ نمبر ایک ۔۔۔ نمبر دو ۔۔۔ نمبر تین ۔۔۔ وہ نہ کبھی لڑکیوں کو لفٹ دیتا نہ متاثر کرنے کی کوشش کرتا۔ صرف اس سے عادتاً اور سرشتاً ایسی حرکتیں ہوتی رہتی تھیں جن سے لڑکیاں پیار کرتی ہیں۔ اگر ماڈرن لڑکیاں بھوک کی نمائش کر کے اندر کی بھوک کا ثبوت دیتی تھیں تو آفتاب کے پاس ہمیشہ اتنے پیسے رہتے تھے جس سے وہ ظاہری بھوک کو شانت کر دیتا اور کچھ اس لاپروائی سے کہ لڑکی سمجھ جاتی ایسے ہی بغیر مشکور کیے' بغیر شرمندہ کیے خاموشی و رضا سے وہ اس کی دوہری اشتہا مٹانے کی بھی صلاحیت رکھتا ہے۔

لڑکیوں کے ٹاپک پر وہ گھنٹوں باتیں کر سکتا تھا۔ لیکن صرف امجد کے ساتھ' روم میٹ ہونے کے باوجود اس نے کبھی کسی لڑکی کو میرے ساتھ موضوعِ سخن نہیں بنایا۔ مجھے یاد ہے شروع ایم اے کے دن تھے میرا خیال تھا کہ آفتاب اپنے تجاہلِ عارفانہ سے مجھے ٹٹول رہا ہے میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہی کہا۔

آج طیبہ تمہارے متعلق پوچھ رہی تھی۔"

"کون سی طیبہ۔"

وہی جس کی ناک پر تل ہے"

"اچھا وہ"

"شاید اسے تم میں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔"

"ہو سکتا ہے ۔۔۔ لیکن بڑی بے وقوفی ہے ۔۔۔ اس نے جرابیں اتارتے ہوئے کہا۔

"تھوڑے وقفے کے بعد جو طلیں ان میں دلچسپی نہیں لینی چاہیے۔"

"یہ کوئی اختیاری بات تھوڑی ہے ۔۔۔" میں نے کہا۔

"ہاں ۔۔۔۔ اختیاری بات تو نہیں ہے۔"

اس کا رویہ نہ جارحانہ تھا نہ مدافعانہ ۔۔۔۔ بس وہ بات کو آگے بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔

"پوچھتی تھی کہ کیا آفتاب کے اباجی دوکان ہے مال پر ۔۔۔ قالینوں کی ۔۔۔"

بتا دینا تھا اباجی کی دوکان ہے ۔۔۔ آفتاب کی نہیں ۔۔۔۔ اس نے ابرو سکوڑ کر کہا۔

ب وہ پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو گیا ۔۔۔ میں بات کو بڑھانا چاہتا تھا کہ لیکن اس کی خاموشی نے میرا منہ بند کر دیا۔

ابتدا میں مجھے شبہ تھا کہ وہ نرگسیت کا شکار ہے۔ لیکن بعد میں مجھ پر کھلا کہ غالباً آفتاب کو اپنے آپ سے پیار نہیں تھا۔ بس اسے زندہ رہنے کی عادت تھی پرندوں کی طرح۔ اور وہ سمجھتا تھا کہ کسی کے پاس کوئی خاص معقول وجہ بھی نہیں ہے کہ وہ کیوں زندہ نہ رہے۔ اگر کسی کے پاس ایسی وجہ ہوتی اور وہ آفتاب کو بتا دیتا تو یقیناً آفتاب اپنی زندگی ختم بھی کر دیتا شروع شروع میں جب میں اس کے ساتھ منتقل ہوئی اور ہم دونوں اکٹھے رہنے لگے تو مجھے آفتاب سے شدید نفرت ہو گئی بلکہ میری یہی کوشش رہتی تھی کہ جونہی وہ کمرے میں آئے میں باہر نکل جاؤں لیکن اتنا پاس رہنے کے باوجود یہ اس کی سادگی تھی جس نے اسے یہ اندازہ ہی نہ لگانے دیا کہ میری جذبات کیا ہیں؟ آفتاب کو میں نے کسی دن خود آگاہی میں جتا نہیں ریکھا اگر اسے اپنی ذات کی سمجھ ہوتی تو شاید وہ مجھ تک پہنچ سکتا۔ عام طور پر ہماری کلاس کے لڑکے لڑکیاں سی خود آگاہی کے احساس سے کئی حرکتیں کرتے تھے۔ لیکن اس کا لٹ یہ سیدھا ایک تھا اسی لیے وہ کھاتے وقت باتیں کرتے ہوئے چلتے وقت بیٹھتے سے سوتے ہوئے کبھی اپنی زندگی کی گرفت میں گرفتار نظر نہیں آیا۔

اس روز جب امجد کی زبانی بھید کھلا کہ سیمی اور آفتاب کا قصہ دور نکل چکا ہے۔ تو

کوثر کی بات پر مہر لگ گئی۔ میں پروفیسر کنول سے مل کر آ رہا تھا سٹاف روم سے باہر ہی مجھے امجد مل گیا۔ کلاس میں صرف امجد سے آفتاب کی بے تکلفی تھی۔

یار یہ لڑکیاں بہت میسنی ہیں عشق بھی فل سائز کرتی ہیں اور پڑھائی بھی فل ٹاس کرتی ہیں تم غافل نہ رہنا۔۔۔۔ ماریں گی ساری بدبختیں۔۔۔۔ پڑھتے تم رہے گے ور فسٹ یہ آئیں گی باجماعت۔۔۔۔

میں نے تکلفاً پوچھا۔۔۔۔ عشق کون کون کر رہا ہے؟۔

"سب کر رہی ہیں یک ایک لیکن سب کا عشق گھٹیا درجے کا ہے سوائے سیمی کے۔"

"سیمی۔۔۔۔ سیمی بھی؟"

میرا دل دھک کرنے لگا۔

میں بھی چوری چوری پرائز بانڈ خرید چکا تھا اس وقت میرے کان یہ سننے کے بے قرار تھے کہ میرا انعام نکل آیا ہے۔

"ہم دونوں اوول کے سامنے ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ میں نے بات کو مذاق میں اڑانا چاہا۔

"اچھا تو پھر کون کون عشق کر رہا ہے۔"

"طیبہ اور فرزانہ تو قابل اعتماد لڑکیاں نہیں ہے، یہ دو قدم آگے چلتی ہیں تو چار قدم پیچھے جاتی ہیں۔"

"کیوں؟"

"ان کا قصور نہیں ان کی فیملی بیک گراؤنڈ ایسی ہے مڈل کلاس کی لڑکی کو بدنامی کا بڑا ڈر ہوتا ہے۔۔۔۔ یہ عشق نہیں کرتیں شوہر تلاش کرتی ہیں۔"

"اور کوثر؟"

"کوثر؟ اس وقت میرے ساتھ فٹ جا رہی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ جب

سارے نوٹس فوٹو سٹیٹ کر کے میں اسے دے دوں گا تو پھر جمال کی طرف مائل ہو جائے گی۔"

"بکومت ۔۔۔۔۔"

امجد نے سگریٹ سلگا کر کہا۔

"احمق آدمی جمال کے ابا جی وائس چانسلر ہیں ۔۔۔۔ کوثر بے چاری کیریئر بنانا چاہتی ہے وہ اس ڈیکٹ کو بھلا سکتی ہے بھی ۔۔۔۔ وہ کسی مرد کے انگوٹھے تلے زندگی بسر نہیں کرنا چاہتی۔"

میرے سوں پر سیمی کا نام آنا چاہتا تھا، لیکن امجد ادھر ادھر کی باتوں کے چٹخارے لے رہا تھا میں سیمی کا نام کیسے لیتا۔

"ویسے یار یہ کوثر چوہی جیسی میرے دل کو بڑی لگی تھی پہلے پہل۔"

"اب کیا ہو گیا ہے ۔۔۔۔" میں نے سوال کیا۔

"ذی مرہ ۔۔۔ ان کم بختوں کے پیچھے مرنے کا ۔۔۔۔ دفع ہو جائیں گی تو محد کا جواب بھی نہیں دیں گی، بچوں کو گود میں بٹھا کر توس مکھن کھلایا کریں گی اور ہماری باتیں اپنے شوہر کو سنا کر ہنسایا کریں گی۔"

میں نے پھر سیمی کے متعلق پوچھنا چاہا لیکن چپ رہا ۔۔۔۔

"انجیلا کا فگر اچھا ہے اگر وہ کب ڈال کرنے چلے ۔۔۔۔ ہے نا ۔۔۔۔؟" امجد نے کہا

"شرماتی ہے ۔۔۔" میں نے جواب دیا ۔۔۔ "لمبے قد کی لڑکیوں کو بیماری ہوتی ہے کب کی"

"شرماتی نہیں ذرا عام نارمل لڑکی سے بھاری ہے اس کا کمپلکس ہے اسے کن کی وجہ یہی ہے مانو نہ مانو ۔۔۔۔"

میں نے ذہن میں انجیلا کے کمپلکس کو لانے کی کوشش کی لیکن مجھ پر سیمی کے

عشق کا یہ خوف حاری تھا کہ مجھے انجیلا کا کچھ بھی یاد نہ آسکا۔

"کبھی تم نے دیکھا نہیں جب وہ کلاس میں آتی ہے تو ہمیشہ اپنی کتابیں سینے کے آگے رکھتی ہے۔ کم بخت کی ایک ہی چیز اچھی ہے اور اسی کا اسے کومپلکس ہے۔"

"آج سپاٹ سینوں والی لڑکیوں فیشن میں ہیں گدھے۔۔۔۔جن کے کندھے کی ہڑی کارکی ہڈی اور دو چار پسلیاں نظر آتی رہیں۔۔۔۔۔جیسے۔۔۔۔جیسے۔۔۔۔" میں چپ ہو گیا میں سیمی کا نام نہیں لینا چاہتا تھا۔

"مدقوق لڑکیاں Under nowrished" امجد نے سوال کیا۔

"ہاں تو ور کیا کھیتوں میں کام کرنے والی صحت مند لڑکیاں اچھی لگتی ہیں۔ توبہ کرو، وہ تو پینڈو لگتی ہیں پینڈو۔"

"ہمیں تو اطالوی تصویروں کی لڑکیاں پسند ہیں ڈی ونچی اور رافیل کی لڑکیاں۔"

"وہ عورتیں تھیں۔۔۔۔عورتوں کا زمانہ گزر گیا۔"

"سیمی جیسی لڑکیاں؟۔۔۔۔" امجد نے بالآخر اس کا نام لیا۔

"بالکل ویسی۔۔۔۔۔جس کی ہنسلی کی ہڈی نظر آئے۔۔۔۔۔ہاتھوں کی نسیں ابھری ہوں گالوں کی ہڈی اوپر کو اٹھی ہوئی دکھائی دے۔"

"لعنت بھیجو۔۔۔۔میں تو ان کو اشتہاروں میں پسند نہیں کرسکتا، زندگی میں کیا پسند کروں گا"

"اس لیے کہ تم پینڈو ہو۔۔۔۔تمہاری بیک گراؤنڈ دیہاتی ہے۔۔۔۔بھائی کو بوٹی ہے پتہ نہیں اسے یہ مریل سیمی کیوں پسند ہے۔

امجد نے لمبا کش لگایا اور بولا۔۔۔۔اور آفتاب کون سا اکسفورڈ کا پڑھا ہوا ہے۔۔۔بھائی کی بوٹی۔۔۔۔۔پسند ہے۔"

یکدم آسمان سے بجلی گری اور میرے پراگش بانڈ پر غلط نمبر پرنٹ ہو گیا۔

"آفتاب کو۔۔۔۔؟"

''اچھا بننے کی کوشش مت کرو۔ تم اس کے روم میٹ ہو تم کو پتہ ہوگا۔''

''وہ مجھ سے ذرا بھی فری نہیں ہے۔''

''یار ان کا عشق تو آخری مرحلے میں داخل ہو گیا ہے۔''

''کیا مطلب۔۔۔۔'' میں اپنے حسد کو چھپاتے ہوئے کہا۔۔۔۔ ''اتنی جلدی کیسے کیسے؟''

''یار آفتاب تو بیبی کو اپنی ماں سے بھی ملانے لے گیا تھا لیکن غالباً کشمیرن بڑھی نے پسند نہیں کیا بیبی کو۔۔۔۔ میں بھی اس کی جگہ ہوتا تو ناپسند کرتا۔''

میرا جی چاہتا تھا کہ کراٹے کا ایک ہاتھ اس کے جبڑے پر ماروں لیکن اس وقت امجد مجھ سے بے حد دوستی کا اظہار کر رہا تھا۔

''تم اس قدر غائب مت رہا کرو قیوم۔۔۔۔ کچھ کلاس والوں کے حالات پتہ ہونے چاہئیں۔ ایک روپیہ ہے؟''

میں نے جیب میں ہاتھ مارا۔

''یار یہ منی بس والے ذرا لحاظ نہیں کرتے۔ ساری بڑی بسیں دس پیسے لے کر سوار کر لیتی ہیں لیکن یہ روپیہ لیتے ہیں پورا ماڈل ٹاؤن کا۔۔۔۔ اس پاکستان کا کیا بنے گا۔''

وہ روپیہ لے کر چلا گیا۔ لیکن میں نہ پاکستان کے بارے میں سوچ سکا نہ بسوں کے متعلق۔۔۔۔

ان دنوں مجھ پر بیبی کے عشق کا دورہ پڑا ہوا تھا جب عشق اظہار سے ناواقف ہو تو اس میں اندر ہی اندر بہت زیادہ تخیر پیدا ہو جاتا ہے۔ بیبی کی ہر بات کو غلط سمجھنا آسان تھا وہ ہر لڑکے کو دلچسپی اور تجسس سے دیکھنے کی عادی تھی جنس مخالف سے ایک خاص حد تک دوستی کو وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتی تھی۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو گھر کی صحبت کو سوغات کی طرح سمجھ کر تھینک یو کر کے رکھ لیتی ہیں مشکل یہ ہے کہ کبھی کبھی

ایسے رویے سے معتوب وشق اس وہم میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ دونوں طرف برابر آگ لگی ہوئی ہے حالانکہ وہ صرف ٹائمس Nice ہو رہی ہوتی ہیں۔

ہم دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے لیکن میری فیملی بیک گراؤنڈ کچھ ایسی تھی کہ میں تو از خود کبھی اس کی ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کی جرات کر سکا نہ ہی باتوں میں اپنی قلبی کیفیت بیان کر سکا میں اپنی جماعت کا ڈلا سفر تھا۔ وہ بڑی بڑی دیر تک میرے پاس بیٹھ کر باتیں کرتی رہتی...... لیکن یہ تمام گفتگو علمی نظریات پر بالکل غیر ذاتی ہوتی اسی لیے میرا معمول تھا کہ کالج جانے سے پہلے ایک خط تحریر کرتا اس میں اپنی تمام محبت کو کھلم کھلا ظاہر کرنے کی کوشش ہوتی۔ کالج سے واپسی پر یہ خط پھاڑ دیتا۔ اور اپنی ڈائری میں احتیاط سے وہ تمام باتیں رقم کرتا جو اس کے اور میرے درمیان ہوتی رہتی تھیں...... میں بیبی کے رویے سے کسی تشکیک کا شکار نہیں تھا میں تو لٹا ہی نشاط کے سہارے زندہ تھا کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے بیبی کا خاموش رویہ اس پر صاد رہے۔

امجد کے جانے کے بعد سمجھ نہ آ رہی تھی کہ پچھلے تمام وقفے کو کس کھاتے میں ڈالوں کرسمس کی چھٹیوں میں صرف چند دن تھے میں ان چھٹیوں سے ویسے ہی خوف زدہ تھا کہ اس خوف میں یوں اضافہ ہوا۔ امجد کے جانے کے بعد بیبی آ گئی۔ ہم دونوں دیر تک کیفے ٹیریا میں بیٹھے رہے وہ کچھ کہنا چاہتی تھی...... میں بھی کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے چلے گئے اور کوئی بھی اندر کی بات نہ کر سکا امجد کی باتیں سن کر اب مجھے سمجھ آ گئی کہ دراصل وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ جب ہم اٹھنے والے تھے تو وہ بولی

"میں پڑھائی چھوڑ دینا چاہتی ہوں قیوم۔"

"ہیں ہیں؟ یہ کیا عقل ہے؟"

"بس مجھے دلچسپی نہیں رہی"

"نئی نسل میں وقت کون سا رہ گیا۔"

وہ آج ملک شیک کے ساتھ آلو کے چپس نہیں کھا رہی تھی حالانکہ یہ دونوں چیزیں وہ ہمیشہ اکٹھی اندر اتی تھی۔

"میں سوشیالوجی کے قابل نہیں ہوں ------ نہ سوشیالوجی یہ قابل ہے ---

--- یہ ایک بجھا سبجکٹ ہے۔"

"اچھا منہ بند کرو۔"

"میں سوچتی ہوں، اگر میں پنڈی چلی جاؤں تو؟"

"وہاں جا کر کیا کرو گی۔"

"صاف ستھرا شہر ہے --- وہاں کوئی Job مل جائے گی میں ہوسٹل لائف سے بور ہو گئی ہوں۔"

ہر ماڈرن لڑکی بہت جلد بور جاتی ہے اس لیے میں نے اس کی بات سنجیدگی سے نہ لیا۔

لیکن وہ سنجیدہ تر ہوتی گئی۔

"قیوم --- میں تمہیں ایک بات بتاؤں --- جب کوئی آدمی ناکام ہو جاتا ہے تو پھر وہ اپنے آپ کو Analyze کرتے کرتے فلاسفر بن جاتا ہے ---- میں بھی اپنے پرائے کا فرق بھول گئی ہوں کبھی کبھی لگتا ہے اگر میں ہوسٹل چھوڑ کر اپنے گھر جا کر کال بل بجاؤں تو گھر والے مجھے ایسے ملیں گے جیسے اپنے ہوں کبھی لگتا ہے اگر میں اپنے گھر کے برامدے میں جا کر کسی کو آواز دوں گی تو کوئی باہر نہیں نکلے گا ---

--- سب میری شکل دیکھ کر لوٹ جائیں گے ------ مجھے پہچان نہیں سکیں گے ---

--- کیا میں جنسی طور پر Frustrated ہوں قیوم۔"

"کون کہتا ہے ------" میں نے محبت سے سوال کیا۔

"کوثر کہہ رہی تھی کہ میں بہت زیادہ Fustrated ہوں۔"

میں نے اسے پیار سے دیکھ کر کہا۔

"جب تمہارا گھر یہاں لاہور میں تو تم ہوسٹل میں کیوں رہتی ہو سیمی؟"

اس نے ملک شیک کی نلکی دو حصوں میں توڑ کر میز پر پھینکی پھر لمبی آہ بھری، اور بولی۔۔۔۔ "وہ گھر میرا خرچ تو اٹھا سکتا ہے۔۔۔۔ میرا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔"

"کیا مطلب؟"

"او ہو۔۔۔۔ زیادہ سوال مت کیا کرو بڑے پینڈو لگتے ہو۔"

"میں کسی تجسس کے زیر اثر نہیں پوچھتا سیمی۔۔۔۔" میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

"میں جانتی ہوں۔۔۔۔ میں جانتی ہوں تمہارا دل بڑا ہمدرد ہے۔۔۔۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے جیسے تم میری زندگی میں بڑا اہم رول ادا کرو گے۔۔۔۔ پتہ نہیں کیوں مجھے Feelings ہیں اس قسم کی! تم مجھے بچاؤ گے کبھی نہ کبھی کسی آفت سے۔"

یہ محض اظہار محبت کا تھا لیکن وہ اس جملے کے باوجود بجھی ہوئی اور پریشان نظر آ رہی تھی میں خاموش رہا۔

"کل رات میں نے خواب میں دیکھا کہ ہم دونوں ہوائی جہاز سے سفر کر رہے ہیں اچانک ہوائی جہاز Crash ہو گیا۔ کچھ باقی نہیں بچا نہ جہاز کا نہ ہم دونوں کا۔"

"اچھا خواب ہے۔۔۔۔ اگر کچھ بچ جاتا تو خواب برا ہوتا۔"

وہ چپ ہو گئی۔ پھر اس نے اپنے کپڑوں کے تھیلے میں ہاتھ مارا

"قیوم مجھے ایک پیکٹ لے دو۔۔۔۔ چیونگ گم کا۔"

خوش قسمتی سے میرے پاس پیسے تھے میں نے اسے چیونگ گم خرید دی۔

اس روز وہ بہت قریب ہو کر دور دور رہی۔ جیسے پتنگ کی ڈوری ہاتھ میں ہو اور پتنگ دور دور رہی ہو۔

"تم سوشیالوجی کے سٹوڈنٹ ہو قیوم۔۔۔۔ کبھی تم نے سوچا کہ پاکستان کی

اصل بدنصیبی کیا ہے؟"

ایسے وقت میں یہ سوال بہت عجیب تھا لیکن وہ اس طرح باتیں کرنے کی عادی تھی یکدم بہت جذباتی ہو کر وہ بات موڑنے کی غرض سے بہت ہی معروضی بن جاتی۔

"دراصل پاکستان کی سب سے بڑی ٹریجڈی وہ Generation ہے جنہوں نے پاکستان بنایا آئیڈیل کی خاطر۔۔۔۔ اور اب وہ خود نظریہ پاکستان کو کیا کریں گے۔"

اب ہم دونوں خالص طالب علموں کی طرح دیر تک پاکستان نظریہ پاکستان موجودہ پود ورچھلی نسل پر باتیں کرنے لگے ابھی کچھ دیر پہلے وہ بے جان تھی۔ اس نے اپنی ٹانگیں سامنے میز پر رکھی ہوئی تھیں اور گلابی چشمے کو کینوس کے بیگ پر لاپروائی سے ڈال چھوڑا تھا اب وہ گردن آگے کیے دونوں ہاتھوں کے اشاروں سے باتیں کر رہی تھی اور ایک تار کی طرح زندہ جس میں سے کرنٹ گزر رہا ہو۔

"یار قیوم۔۔۔۔ پاکستان صرف دو نسل کی کارگزاری ہی تو ہے۔۔۔۔ یہ پچھلے پچیس سال جس میں ہمارے ماں باپ بوڑھے ہوئے اور ہم جوان۔۔۔۔ یہ وقفہ۔۔۔۔ یہ ایک کڑا ہے میں گزرا ہے سب نے اس میں اتنا کچھ ڈالا ہے۔۔۔۔ ہماری Generation نے ہمارے ماں باپ نے۔۔۔۔ اور آج تک نہ کچھ میٹھا پکا ہے نہ نمکین ہے نا۔"

"تم سوشیالوجی کے طالب علم ہو کر میری بات میں دلچسپی نہیں لے رہے لعنت"

"لے رہا ہوں۔"

"غور کرو۔۔۔۔ سوچو ذرا۔۔۔۔ تجزیہ کرو ساری جنریشن کا پاکستان کا جو امیر طبقہ ہے وہ ۱۹۴۷ء میں جوان تھا اور غریب گھرانوں سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے ادھر ہجرت کر لیعنی مقابلہ نہ تھا۔ اس لیے یہ طبقہ یہ Ambitions طبقہ بہت آگے نکل گیا۔ اس

نے قیوم۔۔۔۔زرا غور سے سوچو اس طبقے نے افسر شاہی کی وہ تجارت پیشہ پیدا کیے جو آج Business magnets ہیں اس نے ان بینکروں کو جنم دیا جنہوں نے سارے ملک کو نوٹ زدہ کر دیا۔۔۔۔اس طبقے وے وہ پروفیسر اٹھے جنہیں تعلیم سے زیادہ گریڈوں کی فکر تھی۔وہ ڈاکٹر سامنے آئے جو بیرونی ممالک میں اس لیے عمریں گزارتے ہیں کہ وہاں پیسہ زیادہ ہے۔۔۔۔اس طبقے ہی سے وہ دانشور پیدا ہوئے جن کی اپنی کوئی Covrction نہیں ان کی سوچ چاہے سرخ چین سے آئے یا سرمایہ دارانہ نظام سے ان کی اپنی نہیں ہوتی Greed میں مبتلا یہ لوگ ہمیں ایک ہی میراث دے سکتے ہیں Conflict اندر کا تضاد، حالات کا تضاد، شخصیتوں کا تضاد۔۔۔۔تم کیوں چاہتے ہو کہ میں واپس اس گھر میں چلی جاؤں جہاں سے اور کچھ نہیں مل سکتا تضاد کے سوائے۔"

"وہ آخر تمہارے ماں باپ ہیں۔"

"جانے دو قیوم۔۔۔۔تم کو ایسے ماں باپ سے پالا نہیں پڑا تم کو پتہ نہیں Ambitions لوگ کیسے ہوتے ہیں۔"

"پھر بھی۔"

"پھر بھی پھر بھی کیا۔۔۔۔تم دینیات تو نہیں پڑھتے رہے کہ مجھے اخلاقی قدریں سکھانا چاہ رہے ہو۔"

"ایک دوست کی حیثیت سے۔"

"یہ لوگ۔۔۔۔یہ پاکستان بنانے والے میرے ماں باپ جب ادھر آئے پاک سرزمین پر۔۔۔۔تو یہاں آ کر ان لوگوں نے جفاکش محنتی بیویاں بیاہیں۔۔۔۔نیا ملک بسانے کے لیے۔۔۔۔اپنے آپ کو مضبوط بنانے کے لیے۔۔۔۔یہ عورتیں مردوں کو مجازی خدا سمجھتی تھیں۔انہیں نے مردوں کا ساتھ دیا غریبی دور ہوتی گئی۔۔۔۔جیسے روشنی قریب آتی وہ کسی جگہ جا کر حد مقرر نہیں کر سکا۔ان لوگوں کے

بنک بیلنس بیرونی ممالک میں ہیں وہ کسی جگہ جا کر الحرمین میں مبتلا ہو گے مانے جاتے ہیں۔ ان کی بیویاں گھروں میں ہیں۔ پرپوشش کیے جاتے ہیں۔۔۔۔ تمہیں پتہ نہیں I have gone through all ان کے ابے والی بیویاں بوڑھی ہو گئی ہیں شوہروں کو کسی مقام پر پہنچانے کے بعد اب وہ ناکارہ ہیں پرانے صوفے کی طرح ان کا ہر سپرنگ ڈھیلا ہے۔۔۔۔ اور مجھ جیسی لونڈیاں پھرتی ہیں شہر میں اور ان کے بے ہر انگور کا گچھ میٹھا ہے۔۔۔۔ واہ کیا Drematic بات ہے۔۔۔۔ ہے نا۔"

"آج تمہیں کیا ہو گیا ہے سیمی۔"

"کوثر ٹھیک کہتی ہے میں Frustrated ہوں۔۔۔۔ دراصل میں۔۔۔۔ میرے ماں باپ؟۔۔۔۔ میں کیسے تمہیں سمجھاؤں قیوم۔۔۔ میرا باپ پاکستان بنانے والی پود کی طرح بوڑھا ہو رہا ہے اس نے اپنی بوڑھی مردمیت کے سامنے دولت بنگلے بنک بیلنس کی سکرین لگا کر اپنے آپ کو بہت Potent کر لیا ہے۔۔۔ ۔ اس کا وقت لونڈیوں کے لیے ہے۔۔۔ بیٹی بڑا بوجھ لگتی ہے اسے۔"

"تمہیں اپنے باپ کے متعلق ایسی باتیں نہیں سوچنی چاہئیں"

"اور میری ماں کے ہاتھ پلے کچھ نہیں۔ وہ اپنے آپ کو نہیں بچا سکتی، مجھے کیا بچائے گی۔ تم نے شہر کی لونڈیاں دیکھی ہیں جنہیں ہر بیوٹی شاپ فورتھ ایڈ پہنچاتی ہے ان کے پاس نقلی پلکیں ہیں کئی کئی امرچیں ہیں۔۔۔۔ میک اپ کے علاوہ آزادی ہے ان سے میری ماں کیا لڑے گی۔"

"تمہارے امی نے اجازت کیسے دی ہوسٹل میں رہنے کی۔"

"اوہ چھوڑو جی۔۔۔۔ میری ممی کسی بات کی اجازت نہیں دیتیں وہ کسی بات سے Agree نہیں کرتیں اور سب کچھ مان جاتی ہیں۔۔۔۔ وہ شراب نہیں پیتیں لیکن کاک ٹیل پارٹیوں میں شریک ہوتی ہیں وہ میرے باپ کے مشاغل سمجھتی ہیں

لیکن اعتراض اس سے نہیں کرسکتیں کہ وہ ڈیڈی کو مجازی خدا سمجھتی ہیں۔ وہ بیوٹی پارلر سے حسن کاری کرواتی ہیں لیکن دل سے ان کا عقیدہ ہے کہ کوئی بوڑھی عورت عمر سے لڑ نہیں سکتی۔۔۔۔ بھائی صاحب ہم تو ایسے گھر میں رہتے آئے ہیں جہاں ایک ماں کو بوڑھا ہونے کی اجازت بھی نہیں ملتی مجھے جوان ہونے کی اجازت کب ملے گی۔۔

۔۔تم کو کیا پتہ ایسا گھر کیا ہوتا ہے۔میری ماں بوڑھے ڈھانچے کے ساتھ نوجوان ہونے کے برابر بھاگ رہی ہے۔۔۔۔وہ یہ سب کچھ یہ میرے ماں باپ ان کی زندگی تو مضحکہ خیز ہے۔۔۔اتنی بچگانہ ہے کہ میں۔۔۔۔۔میں اس میں نہیں جاسکتی واپس کبھی نہیں۔۔۔بتاؤ جب ماں ہی بیٹی سے ڈرتی ہو تو اجازت کون دے گا۔۔۔۔میں کس سے اجازت لے کر ہوسٹل آتی۔بتاؤ ناں۔"

"کبھی ماں ڈری ہے بیٹی سے۔۔۔۔حد کرتی ہو تم۔"

"ڈرتی ہے ہر وہ ماں۔۔۔۔جو کبھی میں جوان تھی آج اپنی بیٹی سے ڈرتی ہے اب گھروں میں بیٹیاں حکومت کرتی ہیں۔۔۔ڈیڈی کی کار، ڈیڈی کی توجہ۔۔۔۔ ڈیڈی کی چیک بک سب کچھ بیٹی کے لیے ہے بیٹی کی تکمیل کے لیے ہے تکمیل کی تکمیل کے بیچ میں۔۔۔اپنی ماں سے پیار کرتی ہوں قیوم۔۔۔۔تم کو کیا پتہ میں اس کو ملک کا صدر بنا کر خود پرائم منسٹر بننا نہیں چاہتی۔"

بڑی دیر خاموش رہی۔

"گھروں میں کچھ جھوٹا سچا دبدبہ ہونا چاہیے۔۔۔۔۔جھوٹا سچا پیار۔۔۔۔ورنہ ہوسٹل بہتر ہے۔"

وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس نے اپنا ہاتھ اٹھ کھڑی ہوئی پھر اس نے اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھا۔۔۔۔۔"آج میں نے تمہیں بہت بور کیا۔۔۔۔ہے نا۔"

"ذرا بھی نہیں۔۔۔۔۔میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ تم کتنی صاف اردو بولنے لگی ہو۔۔۔۔"

"ہاں وہ بھی ——— ہے" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جا رہی ہو سیمی؟"

"ہاں ـــ میں سوچتی ہوں سوشیالوجی ایم اے کا بھی کچھ فائدہ نہ ہوگا یہ بھی بڑا Hoax ہے میرے مما ڈیڈی کی طرح ـــ" کچھ دیر وہ کھڑی رہی اور پھر بولی "دیکھو آفتاب ملے تو میرا اسلام کہنا"

جس وقت سیمی رخصت ہوئی میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کالج سے ہمیشہ کے لیے جا رہی ہے۔ جس وقت اس نے سلام بھجوایا تب بھی مجھے شبہ نہ گزرا کہ کوئی عجیب بات ہونے والی ہے حتیٰ کہ جس وقت میں نے آفتاب کو سیمی کا سندیسہ دیا اس وقت بھی مجھے خیال نہ آیا کہ سیمی کا کالج میں آخری دن تھا اور میرے ساتھ آخری دوپہر تھی۔

"سیمی تمہیں سلام بھجو رہی تھی۔"

"اچھا ـــ؟" لاتعلقی سے آفتاب نے کہا۔

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو لمحہ بھر کے لیے دیکھا اور پھر چپ ہوگئے۔ شاید آفتاب کو بھی معلوم نہ تھا کہ سیمی ہوسٹل چھوڑ کر پنڈی جا چکی ہے۔

کچھ دن سیمی کا چرچا رہا ہم جماعت اس کا ذکر کرتے رہے پھر لیٹ فیس والوں کے ساتھ بورڈ پر اس کا نام نظر آتا رہا۔ پھر اچانک آفتاب کی منگنی ہوگئی کلاس کو ایک نیا موضوع ہاتھ آگیا۔ یہ منگنی اس لیے انوکھا پن تھی کیونکہ اب تک سیمی آفتاب کا سکینڈل عام ہو چکا تھا۔ لڑکیاں آفتاب کی غیر موجودگی میں اس عشق کی بڑی تفصیلات باہم پہنچاتی تھیں۔ لیکن آفتاب کے سامنے سب سیمی کا نام لینے سے گریز کرتے تھے۔

فائنل امتحان سے ٹھیک ایک ماہ پہلے آفتاب نے بھی ہوسٹل چھوڑ دیا پھر ایک دن وہ شادی کے کارڈ بانٹنے آیا اور مستقل غائب ہوگیا ـــ امتحانوں کی وجہ سے بہت

دن تک ہم سے بھی یاد نہ کر سکے۔

امتحانوں سے پہلے دن اور رات کی سمتیں بدل جاتی ہیں کبھی گھنٹہ میلوں میں کٹتا ہے اور کبھی سارا دن ملی میٹر میں سکڑ جاتا ہے امتحان سے قبل ہونے والی چھٹیاں ہو چکی تھیں آفتاب کی شادی کا کارڈ ان چھٹیوں سے دو دن پہلے آیا تھا۔ ہم سب نے اپنے اپنے کارڈ لیے اور کوثر نے سیمی کا کارڈ بھی لے لیا۔ آفتاب کے جانے کے بعد کچھ دیر تک اس کی شادی دلہن کا نام کارڈ کی پرنٹنگ، لفافے کا سائز آفتاب کی شخصیت زیر بحث رہی پھر امتحان ڈیٹ شیٹ نوٹس کی باتیں ہونے لگیں۔ کسی نے سیمی جیسی بونگی لڑکی کا نام نہ لیا۔

امتحانی چھٹیوں سے پہلے گلاب کے سفید پھول جو کالج کی سڑک کے ساتھ ساتھ نظر آتے تھے ختم ہو چکے تھے بہار ختم تھی بھرپور گرمی ابھی آئی نہ تھی صبح اٹھنے کو جی نہ چاہتا تھا رات کو پڑھائی کرنے سے دل بھاگتا تھا۔ سہ پہر کو اچانک ٹمپریچر بڑھ جاتا اور قیلولہ کرنے کو جی چاہتا امتحانوں میں وقت کم رہتا جا رہا تھا لیکن اب ساتھ پڑھنے والی لڑکیوں کی باتیں زیادہ یاد آنے لگی تھیں دماغ میں امتحان کی گھنٹی بجتی رہتی۔ جس سے Guilt میں اضافہ ہوتا۔ حسن اتفاق سے ہر فلم ہاؤس میں اب دھڑا دھڑ اچھی فلموں کی نمائش شروع ہو گئی تھی جمال امجد اور میں ہوسٹل رہ گئے تھے۔ لڑکیاں گھروں میں مقید ہو چکی تھیں ہر اچھی فلم دیکھنے کے بعد ہم تینوں قسم کھاتے کہ امتحانوں تک کوئی فلم نہیں دیکھیں گے۔ لیکن خبر ملتے ہی خدا کیسے پروگرام بن جاتا کورس کے علاوہ سب کتابیں دلچسپ اور پر از معلومات نظر آتیں۔ ہم تینوں قریباً ہر روز مختلف بک ڈپوز کتاب گھروں کے چکر لگاتے ان کتابوں کو جو بک سٹالوں پر بکتی تھیں خریدنے کی ہم میں استطاعت نہ تھی لیکن اصلی پڑھائی سے جان بچانے اور ضمیر سے چھٹکارا حاصل کرنے کا اور کوئی طریقہ نہ تھا بک سٹالوں پر پھیرنے سے

یہ تسلی رہتی کہ ہم تیاری کر رہے ہیں جمیل اور راجہ نے تو پولیس آئی ایس کا کارڈ بھی بنوا لیا تھا وہ اپنے آپ کو جل دینے وہاں بھی چلے جاتے میں انارکلی میں فٹ پاتھ پر بکنے والی پرانی کتابیں دیکھتا رہتا پھر پبلک لائبریری چلا جاتا۔۔۔۔ان مشاغل سے مجھے سیمی کے متعلق سوچنے میں بڑی مدد ملتی تھی اپنی ہمزکری کے خیلوں کا انحد بدجا فیڈ آؤٹ ہونے لگتا بک سٹالوں پر فٹ پاتھ کنارے اور پبلک لائبریری میں دماغ کو کسی جہت پر لگانا نہیں پڑتا تھا جوں جوں امتحان قریب آ رہے تھے گھبراہٹ زیادہ اور پڑھائی کا گراف گر رہا ہے اب ہم تینوں نے داڑھیاں رکھ لی تھیں۔۔۔۔لیکن میں شیو سے زیادہ خط بنوانے میں وقت صرف کرتا جب بھی ہم تینوں ملتے پڑھائی کے متعلق ناآسودہ گفتگو ہوتی ہر روز ہم تینوں فیصلہ کرتے کہ گھر ہی چلے جانا بہتر ہے لیکن دوسرے دن سب ہوسٹل میں ہر تے۔

میں اپنے گاؤں چندرا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ وہاں ماں بھی نہیں تھی اور بجلی کا بھی نظام نہیں تھا۔ساندہ کلاں میں بڑے بھائی مختار رہتے تھے لیکن میں کبھی ان کے پاس نہیں رہا۔اس لیے میں امتحان کی تیاری کے لیے کسی کسی نئے ماحول میں جانے کو تیار نہ تھا۔۔۔۔چندراں میں بغیر بجلی کے تیاری ہو سکتی تھی۔بشرطیکہ دسویں کے بعد میں گھر چھوڑ کر قصور نہ چلا گیا ہوتا۔ذہنی طور پر چندرا سے کٹ کر اب امتحانی چھٹیاں گزارنے میں وہاں کیسے جا سکتا تھا۔

کئی بار مجھے خیال آیا کہ ماموں کے پاس قصور چلا جاؤں۔۔۔۔وہ مجھے اوپر والی منزل کا کمرہ دیں گے رات کو بلھے شاہ کے مزار سے قوالیوں کی آواز آئے گی۔صبح صبح ماموں گرم گرم پوریوں کا ناشتہ لائیں گے۔۔۔۔سب میری پڑھائی کا فکر مجھ سے زیادہ کریں گے۔۔۔۔لیکن اب مجھے ایسے ماحول سے وحشت ہوتی تھی۔

دراصل میں کسی ایسے ماحول میں جانا نہ چاہتا تھا جس میں زیادہ وقت سیمی کے متعلق سوچ نہ سکوں۔۔۔۔پتہ نہیں کیوں مجھے احساس ہوتا تھا کہ اگر میں نے

ہوسٹل کا کمرہ چھوڑا تو کہیں اس کے درو دیوار کے ساتھ ہی سیمی بھی پیچھے نہ رہ جائے۔

آفتاب کی شادی سے ایک رات پہلے کا واقعہ ہے۔

میں بنیان پاجامہ پہنے اپنا بستر گول کر کے کمرے کے پیچھے لگائے پڑھ رہا تھا، کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ دستک گول کر جاؤں کیونکہ ہوسٹل کے لڑکے کافی وقت ضائع کر دیتے تھے لیکن پھر آواز آئی۔

"قیوم۔۔۔"

میں نے دروازہ کھولا۔۔۔وہ سامنے کھڑی تھی۔

سیمی کو دیکھ کر میں پسینہ میں نہا گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ دبلی بھی اور زرد لگ رہی تھی آج اس کے کٹے ہوئے سرخ بال کھلے تھے اور کینوس کا بیگ اس کے ساتھ نہ تھا وہ پہلے جیسی نہ تھی۔۔۔۔گو ظاہرا طور پر اس میں کوئی خاص تبدیلی بھی نہ آئی تھی۔

"آپ کب آئیں۔۔۔آیئے ناں۔۔۔"

"ابھی آٹھ بجے کی فلائٹ سے۔۔۔اپنا سامان وائی ڈبلیو سی اے میں رکھا۔۔۔۔اور یہاں۔۔۔"

"گھر نہیں گئیں آپ؟۔۔۔" میں نے تکلف سے پوچھا۔

"کون سا گھر؟۔۔۔ابھی تک تم میرا گھر نہیں بھولے۔"

وہ رول کیے ہوئے بستر پر بیٹھ گئی۔۔۔اس کے کولہے کی ہڈیاں تنگ جینز میں بہت نمایاں تھیں۔

"ویک اینڈ کے لیے آئی ہوں۔۔۔وائی ڈبلیو میں میری ایک دوست رہتی ہے۔ ویک اینڈ کے لیے رکھ لے گی مجھے۔"

مجھے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ اس سے کس موضوع پر بات کروں۔

"آپ تو کالج سے ہی گئیں ۔۔۔۔ بغیر ملے ملائے۔"

"جانا پڑتا ہے۔"

میں نے اس بونگی، تیز سی، کم شکل، عاشق غیر کو دیکھا ۔۔۔ کوئی خاص بات قابل ذکر نہیں تھی۔ لیکن پتہ نہیں میں ہر قیمت پر، ہر موسم میں، ہر قسم کے حالات میں اس کا اسیر تھا۔

"تم بہت دبے ہوگئے ہو ۔۔۔ اب تم بانڈ فلمز میں ہیرو نہیں بن سکتے۔"

یہ محض عرض حال تھا ۔۔۔ لیکن جتنی جلدی اس نے میرے متعلق یہ جملہ کہا تنی ہی سرعت سے وہ غائب ہوگئی۔

"تم نے پوچھا نہیں کہ میں ۔۔۔ کیوں آئی ہوں لاہور۔؟"

میں نے اب بھی سوال نہ کیا۔ میرا دل کہتا تھا کہ وہ آفتاب کی شادی پر آئی ہوگی

"کون کون جا رہا ہے شادی پر"

"جمال اور راجہ ۔۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

"اور تم ۔۔۔۔"

"آفتاب میرا روم میٹ تھا ۔۔۔ میرا دوست نہیں تھا ۔۔۔ شاید میں تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔"

"مجھے کوثر نے کارڈ بھیجا تھا ۔۔۔ کمینی ۔۔۔۔ کبھی خط نہیں لکھا اور کارڈ پوسٹ کر دیا۔ قیوم ۔۔۔ تم، تو گئے تو نہیں ۔۔۔ لیکن مجھے پتہ چل گیا تھا پہلے ہی کہ اس کی شادی کس دن ہوگی میں نے کارڈ ملنے سے بہت پہلے کل کی تاریخ اپنی نوٹ بک میں لکھی تھی ۔۔۔۔"

اس نے نوٹ بک دکھانے کے لیے بیگ تلاش کیا ۔۔۔ "افسوس میں نوٹ بک کینوس والے بیگ میں بھول آئی ہوں۔"

"تمہیں کیسے شک تھا ۔۔۔۔ کیسے؟"

"بس مجھے معلوم تھا۔۔۔۔ کہ وہ چودہ تاریخ کو شادی کرے گا چودہ تاریخ تو ارکا دن۔۔۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل ہوں گے اور اس کی شادی کی رات کو بارش ہو گی گرج چمک کے ساتھ۔۔۔ تم جاؤ گے نا اس کی شادی پر۔"

"کس لیے۔۔۔۔؟ میں وہاں کسی کو نہیں جانتا۔۔۔ میں وہاں جا کر کیا کروں گا۔"

"تمہیں جانا پڑے گا قیوم۔۔۔ میری خاطر۔۔۔۔ دیکھو میں چنڈی سے محض اس لیے آئی ہوں۔۔۔۔ تم مجھے آ کر بتانا کہ دولہن کیسی ہے؟"

"تم خود چلی جاؤ تمہارے پاس کارڈ ہے۔۔۔ کوثر کا بھیجا ہوا۔۔۔۔ بلکہ تم تو دولہن کو زیادہ قریب سے دیکھ سکتی ہو۔"

"ہاں جا سکتی ہوں، دیکھ سکتی۔۔۔۔ ہوں لیکن۔۔۔۔"

"لیکن کیا۔۔۔؟"

"بس قیوم میں بہادر لگتی ہوں لیکن صرف لگتی ہوں اندر سے نہیں ہوں۔۔۔۔ قیوم پلیز فور مائی سیک۔۔۔ آفتاب کی بیوی کو دیکھ کر آنا۔۔۔۔ میں نے سنا ہے وہ بہت خوبصورت ہے۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"وہ آفتاب کی دلہن ہے۔۔۔۔ ویسی ہی ہو گی آفتاب جیسی۔۔۔۔" سیمی کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں آنسو آ گئے

"تم جاؤ گے ناں۔۔۔ میں نے اس کی کوٹھی دیکھی ہے کل ڈیوس روڈ کی اس کوٹھی میں کتنی روشنی ہو گی۔۔۔ آفتاب دولہا بن کر نکلے گا تو۔۔۔۔ تو۔۔۔۔ تم اسے دیکھنا قیوم۔۔۔۔ وہ وہ۔۔۔۔۔" یکدم چپ ہو گئی۔

"چلو ہم اکٹھے چلیں گے۔"

وہ ڈر گئی۔

''ناں جی۔۔۔ بھلا میں کیسے جا سکتی ہوں وہاں۔۔۔ اس کی بے بے مجھے قتل کر دے گی فوراً۔۔۔ کون جانے آفتاب بھی برا مان جائے۔''

میں نے سیمی کا ہاتھ پکڑا اور محبت سے کہا۔۔۔ ''سنو سیمی۔۔۔ گو اپنی نصیحت پر خود عمل نہیں کر سکتا۔ لیکن میرا فرض ہے کہ ایک بار میں صورتحال سے تمہیں اچھی طرح روشناس کراؤں۔''

''مثلاً؟''

''تم کیا کر رہی ہو پنڈی میں۔''

''ایک ٹریول ایجنسی ہے۔۔۔ اس میں ملازم ہوں۔''

''تم ایم اے کر و واپس آ کر مکمل کرو اپنی تعلیم۔''

وہ اونچے اونچے ہنس دی۔

''میں تعلیم یافتہ ذہین عورتوں سے نفرت کرتی ہوں کم بخت بڑی کی جھوٹی ہوتی ہیں۔ اور پھر جب تک آفتاب لاہور میں ہے میں یہاں کیسے آ سکتی ہوں۔۔۔ سب کچھ پھر سے شروع ہو جائے گا۔''

''ذرا غور سے سوچو۔۔۔ آفتاب کی شادی ہو رہی ہے تم کیوں خود بخود دیس نکالا لے رہی ہو۔۔۔ اپنے ماں باپ سے سمجھوتہ کر لو سیمی۔۔۔ مشرق میں سب اول دہ سمجھوتے کے بے پیدا ہوتی ہے۔''

وہ چپ چاپ بستر کی چادر میں سے تاریں نکالنے لگی۔

''قیوم بڑی مشکل ہے، میں تو سمجھوتہ کر لوں لیکن۔۔۔ لیکن میری وجہ سے ان دونوں کا آپس میں بڑا سمجھوتے کرنے پڑتے ہیں ڈبل بیڈ پر سونا پڑتا ہے۔ اکٹھے تقریبات میں جانا پڑتا ہے جب بھی میں گھر پر رہوں ان دونوں کو میری خاطر محبت کی فضا کا تعدم کرنا پڑتا ہے۔ بجلی، گیس ہاٹ کولڈ واٹر کی طرح بڑا مل آتا ہے محبت کا۔ ۔۔۔ وہ دونوں بے چارے بڈھا بڈھی جوان بننے کی کوشش کرتے ہیں قیوم۔

۔۔۔ جب وہ دونوں میری وجہ سے سمجھوتے کرتے ہوں ۔۔۔ اب بھی ۔۔۔"

"شاید ۔۔۔۔ لیکن اب میں دیکھ نہیں سکتی۔"

میں نے سوال کرنے کے لیے منہ کھولا اور پھر چپ ہو گیا۔

"پوچھو ۔۔۔۔ پوچھو ۔۔۔۔ پوچھو ناں؟"

میں بڑی دیر چپ رہا اصل سوال ہمیشہ نکلائی کی گرہ بن کر میرے ہی حلق کا ناطقہ بند کرتے رہے ہیں۔

"آفتاب کو بھی بڑے سمجھوتے کرنے پڑتے تھے۔ میری وجہ ۔۔۔۔ سے! اسی لیے تو میں نے کالج چھوڑ دیا۔ مجھے بڑا ترس آتا تھا آفتاب پر۔"

"کیوں؟ ۔۔۔ کیوں آخر۔؟"

ایک ہر پھر میں نمکین پانی تھا اور وہ مجھ میں سلورنائیٹریٹ کے تلچھٹ کی طرح بغیر ملے ہوئے بیٹھتی جا رہی تھی۔

"کالج میں اسے مجھ سے محبت کرنی پڑتی تھی۔ گھر جا کر اپنی کشمیرن بے بے کے ساتھ شادی کے امور میں دل چسپی لینی ہوتی تھی۔ پھر شام کو اپنی کزن کے گھر جانا ایک معمول تھا اس کا ۔۔۔ اللہ جانے وہ مجھ سے محبت کرنے میں زیادہ مجبور تھا کہ کزن کے ساتھ شادی کروانے میں ۔۔۔ اب تو یہ باتیں میں اس قدر سوچ چکی ہوں کہ اگر مجھے جواب مل بھی جائے تو میں داستانیں کچھ سوچتی رہوں گی باقی ساری عمر ۔۔۔"

آفتاب کی محبت! ۔۔۔ اس کے اظہار کا بھی ابھی تک مجھے موقع نہ ملا تھا۔

سیمیں نے مجھے آستین سے پکڑ کر التجا کی ۔۔۔ "سنو قیوم تمہیں شادی پر جانا ہوگا۔ جانا پڑے گا دیکھو تم انکار نہیں کر سکتے ۔۔۔ وعدہ کرو ۔۔۔ پرومس۔"

"وعدہ۔"

"ایسے نہیں ہاتھ ملا کر ۔۔۔ وعدہ!"

میں نے کسی کا ہاتھ گرفت میں لے لیا۔

جلتی استری پر چھن سے پانی بابد پڑی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں پڑتے ہی غائب ہو گیا۔

"زیبا کے ہونٹ پر تل ہے۔۔۔۔ غور سے دیکھنا قیوم بائیں طرف گہرے سبز رنگ کا تل۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"مجھے کوئی کچھ نہیں بتاتا۔۔۔ بس مجھے پتہ ہوتا ہے۔۔۔۔ یاد رکھنا قیوم ہونٹ پہ۔۔۔۔"

اس کا چھن سے غائب ہو جانے والا ہاتھ میرے گرم ہاتھ میں تھا۔

پہلی بار میں نے سوچا کیا میں جنسی طور پر Frustrated ہوں۔

شادی انٹر کونٹی نینٹل میں تھی۔ گہری شام کو ہائی ٹی۔۔۔ سارا انتظام سوئمنگ پول کے اردگرد کی غلام گردشوں میں تھا۔ مجھے کوئی مجبوری نہ تھی لیکن میں جمال اور امجد سے بہت پہلے وہاں پہنچ گیا۔ یہ تاجر پیشہ لوگوں کی شادی تھی۔ اس میں شرکت کرنے والے لوگ شہر کے Elite تھے۔ قالین فروشوں نے اونچے افسروں سے لے کر فلمی ایکٹرسوں تک سب قابل ذکروں کو بلا رکھا تھا۔ کچھ لوگ میری طرح تھے۔ ان کی آفتاب کے گھر والوں سے جان پہچان نہ تھی وہ سب وقت کٹی کے لیے سگریٹ پینے بیروں کو دیکھ کر مسکرانے اور بے مصرف چکر لگانے میں مصروف تھے۔ ابھی دولہن اپنے آرائشی منڈپ میں نہیں آئی تھی خوش لباس کشمیری لڑکیاں، اور فربہ جسم عورتیں شادی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

پھر آفتاب برات سمیت پہنچا۔ اس کے ساتھ جمال اور امجد بھی تھے۔

برتوں کو لوٹنے کا عہد گزر چکا۔ لیکن آفتاب کے آگے آگے دیکھ کر میرا جی چاہا

کہ اسی وقت کوئی چھ فٹا نوجوان کہیں سے آجائے پھر آفتاب کو قتل کر کے وہ اس کی زیبا کے ساتھ فرار ہو۔۔۔۔اسے سندھوری میز پوش ان پر سجے ہوئے بھاری بھاری کانسی برتن پیسٹری سینڈ اِنش ٹرے تربتر ہوں۔۔۔کاریں سفید کشمیری لڑکیوں کو پیک کر کے سوئی فریب عورتوں کو بھگا کر نکل جائیں۔

نیچے سوئمنگ ٹینک میں تیرنے والی امریکی اور جرمن لڑکیاں چیخیں، ڈر کر اوپر والے

کمروں کو دوڑیں اور آفتاب کی لاش، کمخواب کی شیروانی اور تلے کی جوتی سمیت سوئمنگ ٹینک پر تیرتی رہے۔ ہوٹل کا عملہ پولیس کے آنے تک اندر چھپا رہے اور چودھویں رات کا چاند کے علاوہ اس لاش کو دیکھنے والا کوئی نہ ہو۔۔۔پھر میں وائی ڈبلیو پہنچوں اور سیمی کو بتاؤں کہ زیبا کے سابق عاشق نے آفتاب کو قتل کر دیا اور دولہن کے ساتھ فرار ہو گیا سیمی نڈھال ہو کر میرے سینے سے آ لگے۔

پچھلے باب کا اختتام ہو۔۔۔اور آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے جب سیمی دوبارہ زندہ ہو تو اس کی ہر خوشی ہر غم مجھ سے وابستہ ہو جائے!

خواب جب اس قدر فاسد قسم کے ہوں تو ان کے دیکھنے والے عموماً خوش نہیں رہ سکتے۔

اس سے عین وقت پر نکاح ہوا۔

تمام مہمان گو مغربی تہذیب میں سنے ہوئے تھے۔ لیکن انہوں نے شوق سے نکاح کے چھوہارے کھائے۔۔۔پھر منڈپ میں دولہا دولہن ایک ساتھ بیٹھے پریس فوٹو گرافر کے علاوہ امجد نے بھی تصویریں کھینچیں۔ سلامیاں دی گئیں۔۔۔۔سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہوتا رہا۔ پتہ نہیں کیوں آفتاب کی شادی مجھے ٹیلی ویژن کا فلور شو لگ رہا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ ابھی یہ سارا سیٹ ایکسٹرا ایکٹرسوں سمیت اپنے اپنے گھر چلا جائے گا پھر نہ کوئی شادی ہوئی ہو گی نہ کوئی دعوت۔

لیکن منڈپ میں دولہن بیٹھی تھی۔۔۔ نتھ کے نیچے ہونٹ پوتلے وہ مسکراہٹیں دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کے پاس آفتاب دونوں نتھنوں سے ہنس رہا تھا اس کی کسی حرکت سے تاسف، غم یا ملیامیٹ ہونے والی کسی کیفیت کا سراغ نہیں ملتا تھا۔ میں بیبی کو اس غنڈے آفتاب کی شکل کیسے دکھاتا؟ کاش اس وقت میرے پاس بھی کوئی پولو رئیڈ کیمرہ ہوتا تو میں ابھی آدھ گھنٹہ میں اس کی تصویریں بنا لیتا پھر شاید بیبی یقین کرتی کہ۔۔۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا!

میں چونکہ اقتبا کا روم میٹ۔ اس لیے اس سے بہت بعد میں ملا۔ بیرے چائے کے برتن اٹھانے میں مصروف تھے کچھ اہم مہمان جانا چاہتے تھے آفتاب کی بھربھر کم ماں انہیں مسکراہٹوں کے ساتھ رخصت کر رہی تھی۔ اب بھی جو لڑکیاں بجلیاں گرانے کے بے تابیاں، بالیاں اور چوڑیاں درست کیے کا رہی تھیں مرد بظاہر سیاست پر گفتگو کرتے ہوئے ان ہی زہرہ جبینوں کو تحسین بھری نظروں سے خراج دے رہے تھے۔

میں نے زیبا کے ہونٹوں کا تل دیکھ لیا تھا اور باقی شادی میں میرے لیے اب کوئی نظر فریب بات نہ تھی پھر امتحان کا خیال بھی تھا۔ میں کھسک جانے کا راستہ بھانپنے میں مشغول تھا۔ جب آفتاب میرے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

واقعی آفتاب میں وہ سب کچھ تھا جس کی آرزو لڑکیاں کرتی ہیں۔

”لڑکی کوئی نہیں آئی۔۔۔۔۔“ آفتاب نے کہا۔

پتہ نہیں وہ کس لڑکی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا؟

”لڑکیاں یار پڑھا کو ہوتی ہیں، وہ کیوں اپنا ٹائم ویسٹ کریں گی۔“

”باقی سب کا کیا حال ہے؟“

باقی سب خدا نے اس کا کیا مطلب تھا؟

”خوب پڑھائیاں ہو رہی ہیں۔۔۔۔“ اس نے سوال کیا۔

"کہاں یار۔۔۔۔۔؟ پتہ نہیں سبجکٹ واہیات ہے کہ ہم لوگ بیہودہ ہیں۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔۔۔۔۔پتہ نہیں میں کیوں محسوس کیا کہ آج وہ مجھ سے فروعی باتیں نہیں کرنا چاہتا۔

"سیمی آئی ہے۔۔۔۔۔" پتہ نہیں میں نے کیوں کہا۔

"کہاں۔۔۔۔؟ یکدم اس نے سارے میں نظر دوڑائی۔"

"یہاں نہیں آئی۔۔۔۔ویسے آئی ہوئی ہے۔"

آفتاب جیسے ، یوں ہو گیا۔

"اچھا۔۔۔۔کب؟۔۔۔۔"

"کل شام۔"

"کچھ دن رہے گی۔"

"صرف ویک اینڈ۔۔۔۔"

آفتاب کا رنگ پھیکا پڑ گیا اس کا سارا دولہا پن، خوبصورتی، مسکراہٹ رخصت ہو گئی۔۔۔۔سیمی کا ذکر نے یکدم ہمیں اس قدر قریب کر دیا جیسے ہم ہمیشہ کے دوست تھے، روم میٹ نہیں تھے۔ آفتاب کے چہرے سے لگتا تھا جیسے ہم ہمیشہ کے دوست تھے روم میٹ نہیں تھے۔ آفتاب کے چہرے سے لگتا تھا جیسے وہ ٹیپ ریکارڈ کی طرح بولنا چاہتا ہے لگا تار۔۔۔۔اٹک اٹک گول گول چکروں میں۔۔۔۔کبھی ٹون گرا کر کبھی Volume بڑھا کر۔۔۔۔ایسے خاموش لڑکے سے اتنی باتوں کی مجھے امید نہ تھی۔

"عجیب بونگی لڑکی ہے وہ حالات سے، اپنے آپ سے، کسی دوسرے سے سمجھوتہ کرنے والی نہیں۔"

سپرنگ بورڈ پر ایک امریکی لڑکی چڑھی اس نے ہوا میں سمر سالٹ لگایا اور سرخ لباس غسل سمیت پانی تلے غائب ہو گئی۔۔۔۔اس لڑکی اور سیمی میں بڑا کی مشابہت تھی

میں نے سانس روک لی اور آرزو کی کہ جلدی سے وہ پانی کی سطح پر واپس نکل آئے۔

آفتاب نے منڈپ کی طرف دیکھا۔ دولہن میں اب عمومی دلچسپی کم ہو چکی تھی اور اسے اس کے گھر والی عورتیں سہیلیاں اور چھوٹی بچیوں نے گھیرے میں لے بیٹھی تھیں۔ شاید آفتاب کو زیبا سے بھی محبت تھی۔

"بیبی کبھی سمجھ نہیں سکتی۔۔۔ وہ بہت زیادہ زندہ ہے۔۔۔۔ محبت کرتی ہے جی جان سے۔۔۔ زندگی حساب کا سوال نہیں ہے لیکن وہ اسے کسی فارمولے سے حل کرنا چاہتی ہے۔۔۔۔" نمبر ایک نمبر دو۔۔۔۔۔ تین وا!!! بے تکان بول رہا تھا۔۔۔

"سب کا اپنا اپنا طریقہ ہے آفتاب۔۔۔۔ ہم کسی پر اپنا طریقہ ٹھونس نہیں سکتے۔"

اس نے گلے سے تمام ہار اتارے کر سامنے میز پر رکھ دیے اور پھر ٹنڈ منڈ ہو کر کرسی سے پشت لگا دی۔ آفتاب کم گو تھا۔۔۔ وہ صرف امجد کے ساتھ بیبی کے ٹاپک پر باتیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس وقت پتہ نہیں کیوں وہ کیوں وہ اس قدر پھر کم باتیں کرنے لگ

"زندگی سے موت تک کئی راستے ہیں جس راستے پر بھی پڑ جاؤ قیوم اس کی کچھ راحتیں ہوتی ہیں۔ اس میں کچھ تکلیفیں پیش آتی ہیں کچھ اس راہ پر چلنے کے تھمے ہوتے ہیں کچھ قیمتیں ادا کرنی پڑتی ہیں دراصل کوئی راہ اختیار کر لو۔۔۔۔ کسی راستے پر پڑ جاؤ وقفہ اتنا لمبا ہے کہ مسافروں کا سانس اکھڑ ہی اکھڑے۔۔۔۔"

کیا آفتاب ہمیشہ سے ایسا تھا؟

یا کسی واقعہ نے اس کی طبیعت کو بدل دیا تھا۔۔۔۔ مجھے وہ دن یاد آ گیا۔ جب پہلی بار ہم سب نے اپنا اپنا تعارف پروفیسر سہیل کی کلاس میں کرایا تھا۔ اس روز آفتاب کس قدر موڈی، کنوارا اور خوبصورت نظر آتا تھا۔

وہ بولے گیا۔۔۔۔ "دیکھو ناں قیوم جب مسافر کا دم اکھڑتا ہے تو پہلی سوچ

اس کی یہ ہوتی ہے کہ ۔۔۔۔ کہ مسافت میں تھکا دینے والا بنیادی نقص اس کی پسند کا تھا گر اس نے کسی دوسری راہ کو پسند کیا ہوتا تو شاید راستہ آسانی سے کٹتا ۔۔۔۔"

"کبھی کبھی درست انتخاب راستے کی طوالت کو کم کر دیتا ہے" میں نے کہا۔

"غلط میرے بھائی غلط ۔۔۔۔ جھوٹ بکواس! کسی راہ پر چلے جاؤ ۔۔۔۔ کم وقت نہیں لگے گا ۔۔۔۔ اسی لیے تو کوئی پسند کی راہ درست نہیں ہوتی بالآخر ۔۔۔۔"

یہ باتیں ایک دولہا کے منہ سے اچھی نہیں لگتیں۔ دولہا تو شرماتا پان چباتا اور مسکراتا ہی پیارا لگتا ہے۔

"فرض کرو ایک راستہ ہے پتھریلا، آسمان پر سورج خط استوا جیسا ۔۔۔۔ اس راستے پر چلنے والا ضرور سوچے گا کہ لوگ کتنے خوش نصیب ہیں جو تاکستانوں کی چھاؤں میں انگوروں کے خوشے کھاتے چل رہے ہیں اگر تاکستان والی راہ پر نکلو تو وہاں کے چلنے والے بتائیں گے کہ ہر خوشے میں کالی وردیوں والے کاٹ رہے ہیں شہد کی مکھیاں ہیں۔ اس کے جسم پر ہر جگہ بھڑوں کا کاٹے کیسو حسن ہے ۔۔۔۔ پھر یہ تاکستانوں میں چلنے والا سوچتا ہے کہ وہ شخص جو لکڑی کا چپو ڈالے بن چوارا اترائی کے رخ پانی کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ جا رہا ہے خوش نصیب ہے اس کی راہ آسان ہے، بن چوارے سے پوچھو تو وہ کہتا ہے ۔۔۔ خبردار یہاں کی مچھلیاں آدم خور ہیں ۔۔۔۔ سنسار منہ کھولے پڑے ہیں، اور ڈھلوان پر جانے والے پانی میں از خود بھنور پڑتے ہیں"

"اگر ہر راہ پر خطر ہے ۔۔۔۔ تو پھر پسند کیسی ۔۔۔۔ یہ پسند کا شوشہ چھوڑ کر تو فطرت نے انسان کو احمق بنایا ہے۔"

"ورنہ کیسے احمق اپنی Choice پر ڈٹے رہیں گے کیونکہ ان کا خیال ہے کہ راہ کے انتخاب سے وہ زندگی کی راحتوں میں اضافہ کر سکتے ہیں حالانکہ وہ صرف ادل بدل سکتے ہیں راحتوں کو ۔۔۔۔ اضافہ نہیں کر سکتے نہ غم میں نہ خوشی میں۔"

"یہ تم آج کیسی باتیں کر رہے ہو آفتاب"

"میں نے کبھی اپنی پسند سے زندگی نہیں گزاری اور بڑی اسودگی میں وقت گزارا ہے مجھے دولت، محبت، آسودگی طمانیت حسن اتفاقات ملی ۔۔۔۔۔۔ یہی ۔۔۔ یہی بات اسے سمجھ نہیں آئی میں اگر پسند کو زندگی میں شامل کرلوں تو بڑی مشکلات پیدا کر لینا پڑتی ہے ۔۔۔ دوسروں کے لیے۔"

یہ شخص یہ تو بتا کا خودغرض تھا یا بلا کا بے غرض ۔۔۔۔۔۔ میں اندازہ لگا سکا۔

"تمہارا کیا خیال ہے؟ لوگ اہم فیصلے کیسے کرتے ہیں۔ ساری زندگی کے تمام فیصلے پسند ناپسند کے راستے یہ کیسے ہوتے ہیں اگر نتیجہ نہیں نکلتا تو فیصلے ہوتے کیوں ہیں آخر نیچر ہمارا وقت ضائع کرنا چاہتی ہے ہمیں بے وقوف بنانا اس کی منشا ہے؟" میں نے پوچھا

آفتاب اب مجھے مکمل طور پر پروفیسر کی کاپی لگ رہا تھا۔ اس نوجوان سے میری کوئی واقفیت نہ تھی۔

"دیکھو فیصلے ہم میں شروع ڈال دیے جاتے ہیں چوری چوری ہماری مرضی پوچھے بنا۔ ہر انسان کے اندر ایک خمیر ہوتا ہے سرسوں کے بیج میں یہ فیصلہ ہوتا ہے اس کا زرد رنگ ہوگا تربوز کا تو تو اس کا ہر بیج یہ فیصلہ ہوتا ہے کہ اس سے جنم لینے والا تربوز سرخ ہوگا ۔۔۔ دیکھو قیوم نہ تربوز اپنی خوشی سے سرخ ہوتا ہے نہ چنبیلی اپنی مرضی سے خوشبودار ۔۔۔۔ سب کا بیج کا خمیر ہے جو آدمی چور بنتا ہے اس کے وجود کو غارت گری کا خمیر لگا ہوتا ہے کہیں ۔۔۔۔ نیک سازگار ماحول میں شاید ساری عمر اس کی یہ خوبی نہ کھلے لیکن جس کے اندر غارت گری کا خمیر نہیں ہوگا ۔۔۔ وہ ناساز گار ماحول میں بھی کچھ نہیں کر پائے گا ۔۔۔ کبھی چور نہیں بن سکے گا ۔۔۔ یار میرے سیدھی بات ہے سیب کو تم بھی گرتا دیکھتے ہو نیوٹن نے بھی دیکھا تھا تم کشش ثقل ایجاد نہیں کر سکے۔ کیونکہ تمہارے بیج میں وہ راستہ نہیں تھا جو ایک سائنسدان کا

ہوتا ہے" میں ــــ پروفیسر کنبل کی کمپنی میں اگر نہ رہتا تو شاید یہ باتیں مجھے سمجھ نہ آتیں اور ـــ شاید میں اپنی پسند کی زندگی بسر کرنا چاہتا ـــ لیکن اب میں سمجھ گیا ہوں۔

کیا واقعی وہ سمجھ گیا تھا۔؟

کیا سیمی سے بچھڑ کر وہ ایسی باتیں کرنے پر مجبور تھا۔

کیا پروفیسر کنبل کی باتوں کا اثر تھا۔

کیا وہ ہمیشہ سے خاموشی کے غلاف تلے ایسی ہی باتیں سوچتا تھا۔

"اب میں احتجاج کرنے کے خلاف ہوں تہلکہ مچانے والے صرف اپنا نقصان ہی نہیں کرتے سب کو برباد کرتے ہیں سارے ماحول کو ـــ سیمی سمجھتی ہے کہ وہ اپنے رویے سے اپنی سوچ سے اپنی پسند سے خوشی اور غم لانے کی ضامن ہے ـــ وہ تو ایسی ضدی ہے کہ اپنی آرزو کے سامنے اللہ کی ساری کائنات توڑ پھوڑ سکتی ہے۔"

"میں بھی ایسے ہی سمجھتا ہوں۔

"بیکار ہے فضول ہے ـــ میں جانتا ہوں وہ خود ٹوٹ جائے گی اچانک۔"

"تمہیں سیمی سے محبت ہے؟"

وہ بڑی دیر خاموش رہا۔

"آفتاب ـــ میں نے ایک سوال کیا ہے تم سے۔"

"محبت ہونے نہ ہونے سے میرا راستہ نہیں بدل سکتا۔"

"کیوں؟"

"سیمی سمجھتی ہے میں نے اس سلسلے میں کچھ سوچا نہیں ـــ بہت سوچا ہے میں نے قیوم بہت زیادہ ـــ سیمی کے ساتھ بھی زندگی میں کچھ راحتیں ہوتیں کچھ غم ہوتے ـــ زیبا کے ساتھ رہنے میں کچھ راحتیں ہوں گی غم ملیں گے ـــ

زندگی کسی کے ساتھ گزارلو قیوم آخر میزان برابر رہتا ہے۔"

"ایسی منفی سوچ کی وجہ سے تم نے اس کی زندگی تباہ کر دی۔"

"گر میں اس کی زندگی تباہ نہ کرتا۔۔۔تو کچھ اور لوگوں کی زندگی تباہ کر دیتا یہ فیصلہ بھی نہیں پہلے سے میرے اندر ہو چکا ہے۔"

"تمہیں یہ فیصلہ کسی سے محبت کرنے سے پہلے کرنا چاہیے تھا۔"

"میں نے کبھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔۔۔کیونکہ ہر فیصلہ میرے بیج میں پہلے سے موجود تھا وہ اس بیج کے فیصلے سے مڑا نہیں جا سکتا۔ باقی تمام فیصلے اس پہلے فیصلے میں موجود ہوتے ہیں قیوم۔"

"مجھے خدا کے لیے بتاؤ تمہیں کسی سے محبت ہے کہ نہیں۔"

اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔۔۔چند تارے اپنی نوبیا ہتا کو دیکھا اور بولا۔

"محبت چھلاوہ ہے قیوم۔۔۔اس کی اصل حقیقت بڑی مشکل سے سمجھ آتی ہے۔ کچھ لوگ جو آپ سے اظہار محبت کرتے ہیں اتصال جسم کے خواہاں ہوتے ہیں۔ کچھ آپ کی روح کے لیے تڑپتے ہیں کسی کسی کے جذبات پر آپ خود حاوی ہو جانا چاہتے ہیں۔ کچھ کو سمجھ سوچ ادراک کی سمتوں پر چھا جانے کا شوق ہوتا ہے۔۔۔ محبت چھلاوہ ہے لاکھ روپ بدلتی ہے۔۔۔اسی لیے لاکھ چاہو ایک آدمی آپ کی تمام ضروریات پوری کر دے یہ ممکن نہیں۔۔۔اور بالفرض کوئی آپ کی ہر سمت ہر جہت کے خلا کو پورا بھی کر دے تو اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ بھی اس کی ہر ضرورت کو ہر جگہ ہر موسم میں ہر عہد میں پورا کر سکیں گے۔۔۔انسان جامد نہیں ہے بڑھنے والا ہے اوپر دائیں بائیں۔۔۔اس کی ضروریات کو تم پابند نہیں کر سکتے۔۔۔ لیکن کسی بڑی ضدی ہے۔۔۔بہت زیادہ۔۔۔وہ محبت کو کسی جامد سمے میں بند کرنا چاہتی ہے۔"

شاید آفتاب اور میں ابھی اور کچھ دیر باتیں کرتے رہتے لیکن اس وقت امجد اور

جمال آ گئے وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

امجد نے آتے ہی آفتاب کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

"کیا راز و نیاز ہو رہے ہیں"

لیکن آفتاب ابھی جواب دینے نہ پایا تھا کہ جمال بولا "یار ادھر چوشیلسار میں تین پیاری پوپٹیں بیٹھی ہیں۔۔۔۔ خدا قسم ذرا ہائے اوئی کرنے والی نہیں بڑے آرام سے تبادلہ خیالات کرتی ہیں۔"

"ہاں سچ یار بڑی ڈیسینٹ لڑکیاں ہیں۔ ایسے آرام سے باتیں کرنے لگیں ہم سے چھوٹ" امجد بولا۔

"چونکہ تم سے باتیں کرنے لگیں اس لیے ڈیسینٹ ہوئیں۔۔۔۔" آفتاب نے مسکرا کر پوچھا۔

امجد نے آنکھ مار کر کہا۔۔۔۔ "جی یار ہمیں تو وہی ڈیسینٹ جو خواہ مخواہ ہمیں یہ احساس نہ دلائیں کہ ہم کوئی خاص قسم کے غنڈے ہیں جو ان کی عصمت دری کیے بغیر دم نہ لیں گے۔۔۔۔ اندر سے چاہے ویسے ہی ہوں لیکن احساس نہ دلائے تب لڑکی ڈیسینٹ ہوتی ہے اٹھو قوم۔۔۔۔ اٹھو۔۔۔۔۔"

آفتاب نے مسکرا کر کہا۔۔۔۔ "جاؤ بھائی۔۔۔۔ ہم تو کسی ہو گئے۔"

"اس کے ساتھ۔۔۔" جمال نے میری طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"نہیں اس کے ساتھ"

ابرو کے اشارے سے آفتاب نے زیبا کی طرف اشارہ کیا۔۔۔۔ جمال اور امجد نے بڑے نزت کاروں کی طرح کمریں لچکاتے کرسیوں میں بیٹھی ہوئی جنس مخالف کو سیں کیوزمی کرتے ہوئے اندر کی طرف چلے گئے۔

اس وقت پانی کی تہہ سے سرخ لباس غسل والی امریکن لڑکی نے سر نکالا اور ڈولفن کی طرح سر اٹھا کر جھٹکا۔۔۔۔ لڑکی نیلی آنکھوں پر پانی کی تہہ میں تیرنے کی وجہ

سے ہلکی سی سرخی چھا گئی تھی۔۔۔۔ آفتاب نے سامنے پڑے ہوئے گل دان میں سے ایک گیندے کا پھول توڑا اور اس کی طرف پھینکا۔ لڑکی ایک انجانے راستے پر یوں تعریف ہوتے دیکھ کر معصومیت اور خوشی سے مسکرائی پھر اس نے پھول کو فوخنۃ کی طرح منہ میں اٹھایا اور پانی کی تہہ میں چلی گئی۔

آفتاب میں وہ سب کچھ تھا جس سے لڑکیاں محبت کیا کرتی ہیں۔

ہوٹل سے نکل کر مجھے سارا راستہ کالج کی تعارفی کلاس یاد آتی رہی پتہ نہیں کیوں ساری

شام آفتاب کی باتوں سے پروفیسر سہیل کی خوشبو آتی رہی تھی جیسے میں آفتاب سے نہیں پروفیسر سہیل سے مل کر آ رہا تھا۔

جمال اور راجد سے بہت پہلے میں شادی سے لوٹ آیا۔

رات کے پچھلے پہر ہوسٹل بالکل اجاڑ تھا کمروں میں سے پنکھوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور سڑک پر چلنے والے ٹریفک کی دبی دبی سی آواز ایک مسلسل سرگوشی تھی میں ہوسٹل کی

زندگی سے مطمئن نہ تھا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے پھر دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ ان قلیل چھٹیوں میں مجھے کیسے پڑھائی کرنی چاہیے کیا میں بھائی کے پاس شاہدرہ چلا جاؤں کیا قصور میں دلجمعی سے پڑھائی ہو سکتی ہے یا پھر مجھے نیا ٹائم ٹیبل بنا کر یہیں ہوسٹل میں رہنا چاہیے؟

ہوسٹل کی ایک بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ پڑھنے والے لڑکوں کی عادتیں اور پڑھائی کے اوقات ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہوتے ہیں کچھ نوجوان ساری رات سادھی لگا کر پڑھتے ہیں اور صبح نیند کی گولیاں کھا کر مگرمچھ کی طرح بے سدھ لیٹ جاتے ہیں کچھ خائف رہتے ہیں اپنے حافظے کے ہاتھوں۔ ان کو زیادہ پڑھنے

کے بعد نروس ہو کر دوسروں کے پاس اکلاقی جرات۔ اعادہ سبق اور خوف کا علاج کرنے جانا پڑتا ہے ان کے علاوہ ایک جماعت خودغرضوں کی بھی ہوتی ہے وہ کوٹا بھر پڑھائی کر کے دوسروں کے پاس خوش گپی کے لیے اس وقت جاتے ہیں جب ابھی دوسرا بے چارہ پڑھائی کا سٹارٹ ہی لے رہا ہوتا ہے میں دن میں کئی مرتبہ پڑھائی کی کلی دبانے کی غرض سے جھوٹے سٹارٹ لیتا اور ہر بار کوئی نہ کوئی ہوسٹل کا ہوسی بریک لگانے پر مجبور کر دیتا۔ جمال کی عادت تھی کہ شہزادہ سات گھنٹے پڑھنے کے بعد حالیہ حالات پاکستان اور پاکستان کو ترقی یافتہ ملکوں کی صف میں لانے کے پروگرام بڑی تفصیل سے زیر بحث لا کر دو ڈھائی گھنٹے میرے پاس صرف کرتا۔

''بیٹھ جاؤ جمال۔۔۔۔۔'' میں کرسی پیش کرتا۔

''میں بس جا رہا ہوں۔۔۔۔۔'' وہ کھڑا رہتا اور بولتا چلا جاتا۔

''ہاں بھائی۔۔۔۔ تمہارا بھی ٹائم ویسٹ ہو گا۔۔۔۔ میرا بھی۔۔۔۔ بیٹھنا وٹھنا نہیں ہے۔''

میں اس کے سامنے کئی بار گھڑی دیکھتا۔ کئی پنسلیں گھڑ کر رکھ دی جاتیں۔ پن دھوئے جاتے۔ ان کی سیاہی بدلی جاتی کاغذوں کے نوٹ بنانے کے بے پن لگاتا۔۔۔۔ جن

کتابوں سے مختلف Topics پر Refrence ملنے کی امید ہوتی۔ ان کتابوں میں جا بجا کاغذ کی پرچیاں رکھ کر ان کو اینٹوں کے چھتے کی طرح جما کر رکھتا۔۔۔۔ میرے مشاغل نے کبھی جمال کو پریشان نہیں کیا۔ وہ سٹیل مل لگانے سے لے کر وہی ہونے والی چھوٹی رلی تک ان گنت فیکٹریاں پاکستان کے مختلف شہروں میں لگاتا رہتا۔ اس کی گفتگو سے سارا پاکستان کالا شاہ کاکو بن جاتا اور فضا میں سے بدبودار شیرے، ایران ارٹینری کے خام چمڑے کی بو آنے لگتی۔۔۔۔۔

جمال کے جانے کے بعد فضا میں فیکٹریوں کا دھواں اس قدر پھیلا ہوتا کہ میں

سانس برابر کرنے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے باہر چلا جاتا۔ واپسی پر پڑھائی کے سٹ رٹ میں کئی اوگھٹ گھاٹیاں آتیں ان کو پار کرنے کے بعد ابھی میں نے سپیڈ ہی پکڑی ہوتی کہ امجد آ جاتا ۔۔۔ امجد ہنگامی آدمی تھا وہ صرف پندرہ منٹ ٹھہرتا ۔۔ ۔۔ لیکن اس کے ضمیمے کے بعد توجہ کتاب کی سکرین پر ٹھہر ہی نہ سکتی تھی۔

جس وقت میں آفتاب کی شادی سے لوٹا۔ میرا ارادہ شہر سے بھاگ جانے کا تھا جو کچھ آفتیں اوپر بیان کر چکا ہوں۔ ان کی سردار مصیبت سیمی تھی۔ آفتاب کی شادی نے پتہ نہیں کیوں دل میں سیمی کی محبت پا لینے کے خواب کو از سر نو ہوا دے رکھی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ کوئی ایسا خوف بھی تھا جو میسٹر نوم پر بتا رہا تھا کہ اب بیٹا تم پاس ہی نہ ہو سکو گے اس لیے اس میں عافیت ہے کہ شہر، ہوسٹل۔ کالج چھوڑ کر کسی چھوٹے سے گاؤں میں بھاگ جاؤ، وہاں مقامی نمبردار سے دوستی لگا کر ایک چھوٹا سا سکول کھولو اور باقی ماندہ زندگی ان بچوں کو پڑھاؤ جو پڑھنے کے لیے پیدا ہی نہیں ہوئے۔

بالآخر میں نے پھر ایک چھوٹا سٹارٹ لیا۔ اپنی چارپائی سے بستر رول کر کے سرہانے کی جانب رکھا اور سوشیالوجی کے دوسرے پرچے کی تیاری کرنے لگا۔

اس وقت دروازے پر کسی نے انگوٹھی کے ساتھ دستک دی۔

دروازہ کھولا تو سیمی کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ مجھے بانس پر ٹنگا ہوا نظر آیا۔

"آ جاؤں ۔۔۔۔۔۔ کہ نہیں۔"

"اس وقت تمہیں اجازت کیسے ملی اندر آنے کی؟"

"بس مل گئی آ جاؤں؟"

وہ چارپائی پر جوتے اتار کر بیٹھ گئی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی کٹے ہوئے بالوں والی کسی لڑکی کو سلیپر پہن کر الانی چارپائی پر ننگے پاؤں بیٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے رول کیے ہوئے بستر پر اپنی کہنی جمائی اور نظریں جھکا کر پوچھا۔

"تو ہو گئی شادی؟"

شاید وہ مجھ سے نفی میں جواب کی آرزومند تھی۔

"ہاں ۔۔۔۔۔۔ ہو گئی ۔۔۔۔۔۔"

بڑی دیر تک وہ سر ہلاتی ہلاتی رہی۔

پھر جیسے اس نے اپنے آپ کو قابو پالیا۔ وہ بڑے سادی گھریلو انداز میں باتیں کرنے لگی۔

"بہت مہمان تھے ۔۔۔۔۔ ہے نا ۔۔۔۔۔"

"نہیں زیادہ نہیں تھے ۔۔۔۔۔ یہی کوئی تین سو کے قریب ۔۔۔۔۔"

"جمال ور امجد بھی گئے ہوں گے ۔۔۔۔۔" جیسے وہ شادی پر ہمارے ساتھ ہی تھی

"ہاں ۔۔۔۔۔"

"اور ۔۔۔۔۔؟ ورفرزانہ کوثر وغیرہ ۔۔۔۔۔"

"وہ پڑھ رہی ہوں گی اس وقت ۔۔۔۔۔ ان کمبختوں نے فسٹ ڈویژن لینی ہے ہماری طرح کوئی اپنا آگا تھوڑا مارنا ہے۔"

"ہاں ۔۔۔۔ سمجھ دار ہیں وہ چاروں ۔۔۔۔۔ کاش خدا ہمیں بھی عقل دیتا! انجیلا بھی نہیں آئی ۔۔۔۔۔؟"

وہ چپ ہو گئی

اس وقت ایک بار امید نے مجھے بڑے بھرپور قسم کے سبز باغ دکھائے دراصل ہر شخص کو اپنے ملک کی لوک کہانیاں پر اندر ہی اندر بڑا اعتبار ہوتا ہے وہ بہت سمجھدار ہونے کے باوجود کبھی ان کہانیوں کے چنگل سے نکل نہیں سکتا۔ ملک کی مجموعی سائیکی ان ہی کہانیوں میں ہوتی ہے۔ اور میں بھی ان ہی کہانیوں کا ایک حصہ تھا۔ اس وقت مجھے یقین تھا کہ چونکہ ویلن کی شادی ہو گئی ہے اس لیے نیچرل نتیجہ یہی ہے کہ اب یہ پوری قوت سے مجھ پر عاشق ہو جائے گی۔ راستے کی چٹان کٹتے ہی

اسے میرے سوائے اور کچھ نظر نہیں آنا چاہیے۔ لیکن ابھی کچھ شوقیہ گلابی گلاسز نہیں پہنتی تھی۔ وہ تھی اس کی بصیرت کمزور تھی اسے آفتاب کے بعد کوئی شخص نظر نہ آیا۔

"انتظام کیسا تھا؟۔۔۔۔۔" اور میں نے یونہی پوچھا۔

دراصل وہ کچھ اور پوچھنا چاہتی تھی اور میں کچھ بھی بتانا نہیں چاہتا تھا۔

میں اس سے وہ باتیں کیوں کرتا جو تالاب کنارے آفتاب نے مجھ سے کی تھیں

شاید میرے بیان کے رد و بدل سے وہ ان باتوں کو آفتاب کی محبت پر محمول کرتی۔

بڑی دیر بعد میں نے جواب دیا۔۔۔۔۔۔ "اچھا تھا جیسے ہوٹلوں کے انتظام ہوتے ہیں۔"

"پھر بھی۔۔۔"

"نکاح سے پہلے ڈرنکس تھیں۔۔۔۔ کوکا کولا وغیرہ"

یکدم اس کا رنگ پھر فق ہو گیا۔ دوپہر کی دھوپ میں چمکتی سفید ریت کی طرح

"نکاح سے پہلے۔۔۔۔ نکاح سے پہلے۔۔۔۔ نکاح سے پہلے۔۔۔۔۔" وہ الاپنے لگی اس وقت مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید یہی اب بھی مجھ سے محبت نہ کر سکے۔

"اور۔۔۔۔۔ اور۔۔۔۔۔"

"چائے تھی۔۔۔۔۔ نکاح کے بعد۔۔۔۔۔ وہی معمول کی چیزیں، چپز فنگرز، مچھلی، پیسٹری اور ایک ٹرائفل قسم کی سویٹ تھی۔"

یکدم وہ بھڑک کر بولی۔۔۔۔۔ "نکاح کے بعد کبھی ٹرائفل نہیں ہوتا۔۔۔۔ ہمیشہ نکاح سے پہلے ٹرائفل ہوتا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو آگئے جنہوں نے میرے اظہار محبت کو شارٹ سرکٹ کر دیا۔

"کیسی ہے؟۔۔۔۔۔" گلابی گلاسز کے پیچھے وحشی ہوئی آنکھیں تھیں آنکھوں میں آنسو تھے اور ان پردوں کے پیچھے کہیں بیسی کھڑی تھی۔

"کون۔۔۔۔؟۔۔۔۔"

"وہی بڑا انقل۔۔۔۔"

"خوبصورت ہے۔۔۔۔جیسے کشمیری لڑکیاں ہوتی ہیں۔۔۔۔" میں نے لہجے کو خشک رنگ دے کر کہا۔

"قد۔۔۔۔؟۔۔۔۔"

"مناسب۔۔۔۔"

"آنکھیں۔۔۔۔؟۔۔۔۔"

"نیلی!۔۔۔۔لیکن میک اپ زیادہ تھا میں نقلی پلکوں کی وجہ سے دیکھ نہیں سکا اچھی طرح۔"

"رنگ۔۔۔۔؟۔۔۔۔"

"گورا۔۔۔۔گائے کے دہی جیسا۔"

اب آنسو اس کی گالوں پر بلا تکلف گرنے لگے۔

"اور وہ۔۔۔۔"

"وہ کون۔۔۔۔؟۔۔۔۔"

تھوڑی دیر کے لیے میں بھول گیا تھا کہ یہی آفتاب سے محبت کرتی ہے۔

"دولہا؟۔۔۔۔آفتاب؟"

"ٹھیک تھا۔۔۔۔جیسے دولہا ہوتے ہیں کمخواب کی شیروانی، ملتانی کھسہ، سر پہ سرحدی پٹکا۔۔۔۔سہرا۔۔۔۔ہار۔۔۔۔"

"یہ نہیں۔۔۔۔یہ نہیں۔۔۔۔بتاؤ قیوم وہ خوش تھا، خوش نظر آ رہا تھا۔۔۔۔؟ اسے خوش ہونے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔۔۔۔مجھ سے بچھڑنے پر کم از کم اسے خوش تو نہیں ہونا چاہیے۔۔۔۔ہے نا؟"

میں نے کسی کو خوشنودی کے لیے کہا۔۔۔۔"نہیں بابا تم سے کس نے کہا وہ

خوش تھا۔۔۔۔۔۔۔مجھے تو وہ کچھ اداس نظر آیا۔"

اس کے خیال کے ساتھ اتنی آسانی کے ساتھ مطابقت کرنے پر وہ خالص افسروں کی طرح بگڑ گئی۔

"جھوٹ مت بولو۔۔۔۔۔خوشی کوئی اس کے چہرے پر تھوڑی ہو گی۔۔۔۔۔وہ تو اس کے دل میں ہو گی اندر یہاں۔۔۔۔۔"

"شاید۔۔۔۔۔"میں نے شرمندگی کے ساتھ کہا۔

ب اس نے رول کیے ہوئے بستر ے پر سر ٹکا دیا اور دھاری دار گدی پر اس کے تمام

بال بکھر گئے۔

"ماما اس کی بڑھی بے بے مجھ سے شادی پر رضامند نہ تھی۔لیکن کیا کچھ سال اور وہ رک نہ سکتا تھا۔۔۔۔۔کم از کم ہم دونوں ایم اے ہی اکٹھے کر لیتے۔۔۔۔۔ساتھ ساتھ۔۔۔۔۔لیکن اسے شوق تھا شادی کا۔۔۔۔۔اسے اپنی بچپن کی منگیتر سے محبت ہے قیوم۔۔۔۔۔تم نہیں جانتے وہ بے حد دوغلا ہے۔۔۔۔۔اس کی دو شخصیتیں ہیں۔۔۔۔۔مٹر کے چھلکوں کی طرح۔"

اس وقت میرا جی چاہا کہ اسے وہ ساری باتیں بتاؤں جو آفتاب نے سوئمنگ پول کرانے کی تھیں۔

"تم جو وہاں گئے تھے تو کیا کھانے پینے گئے تھے؟"میں چپ رہا۔

"لڑکیاں تاڑنے؟"اس نے پوچھا۔

"چھوڑو یار۔"

"پھر تم اتنا بھی پتہ نہ کر سکے کہ زیبا کے متعلق اس کا Reaction کیا ہے۔"

میں نے اس جلالی افسر سے جان بچانے کی خاطر کہا۔۔۔۔۔"میں نے انہیں باتیں کرتے تو نہیں دیکھا لیکن غالباً آفتاب کے ماں باپ نے زبردستی یہ لڑکی اس

کے گلے باندھی ہے۔"

"چھوڑو قیوم چھوڑو ــــــ تم بھی مجھے فریب دینا چاہتے ہو آفتاب کی طرح۔ وہ اُلو کا پٹھا بھی چاہتا ہے کہ خود تو بڑے مزے کی خوشگوار شادی شدہ زندگی گزارے اور میں یہ یقین رکھوں کہ وہ دل ہی دل میں مجھ پر مرتا ہے اس لیے ساری عمر میں شادی نہ کروں؟"

امید نے پھر سر اٹھایا۔

"نہیں تمہیں شادی ضرور کرنی چاہیے بلکہ جلد از جلد۔۔۔"

"مائی فٹ۔۔۔۔ شادی! میں لعنت بھیجتی ہوں شادی پر۔۔۔۔ میں تو امتحان نہیں

دے سکی اس کے بغیر۔۔۔۔ میں شادی کیا کروں گی؟"

میں نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ سیمی کے جسم کو چھونا میرے لیے حجر اسود کو چومنے سے کم نہ تھا میرا رواں رواں رقت اور عقیدت سے بھر گیا۔ دیر تک میرا ہاتھ اس کے کندھے پر پڑا رہا اس نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ شاید وہ اس بات ہی سے آگاہ نہ تھی کہ میرا ہاتھ اس کے کندھے پر لرز رہا ہے۔

"اس کے گھر میں چاہے کوئی رہے دل میں تم رہو گی سیمی۔"

سیمی نے لمبی آہ بھری اس کی ہنسلی کی ہڈی اور ابھر آئی۔

"جانے دو قیوم جانے دو۔۔۔۔ دل کی پوسٹ تو میں نے پنڈی جانے سے پہلے خالی کر دی۔"

"میرا ابھی یہی خیال تھا کہ پوسٹ خالی ہو چکی ہے اور یہ موقع افسر کی میز پر اپنی عرضی رکھنے کا ہے۔ میں نے ہاتھ اس کے زانوں پر رکھا۔ وہ پہلے کی طرح بے دھیانی بیٹھی رہی۔"

"سنو سیمی!۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں ایک دوست کی حیثیت سے تمہیں بتا رہا

ہوں۔۔۔۔آفتاب اس وقت اسی فیصد خوش ہے۔۔۔۔بیس فیصد خوشی اسے رفتہ رفتہ مل جائے گی۔۔۔۔کیونکہ وہ زیادہ شدید نہیں ہے۔۔۔۔مسئلہ تمہارا ہے تمہیں خوش رہنے کے لیے کوئی بندوبست کرنا چاہیئے"

وہ کسی قسم کے بندوبست کے لیے تیار نہ تھی۔

"وہ اس قدر بے رحم نہیں ہو سکتا۔۔۔۔وہ ایسا بے وفا نہیں ہے قیوم۔۔۔۔ہم دونوں تو ایک دوسرے کے علاوہ کسی کے ساتھ خوش رہ ہی نہیں سکتے تھے۔۔۔"

پھر یہ کیسے ہوا کہ وہ تو زیبا کو پا کر خوش ہو گیا اور میں۔۔۔۔اور میرے لیے خوشی ایک مسئلہ بن گئی۔۔۔۔کیسے؟

"تمہیں بھی اپنے لیے خوشی کی کوئی راہ تلاش کرنی ہوگی سیمی۔۔۔۔پیچھے رہ جانے

والوں کے لیے اور کوئی صورت نہیں ہوتی!"

وہ محبت کے ترازو میں برابر کا تلنا چاہتی تھی اور دوسری طرف کے پلڑے میں مجھے ایسے کوئی بٹہ رکھنا نہیں آتا تھا جس کی وجہ سے اس کا توازن ٹھیک ہو جاتا۔ اگر میں آفتاب کو خوش ظاہر کرتا تو وہ ہسٹیریا کی صورت میں بے قابو ہو جاتی اگر میں اسے اداس ظاہر کرتا تو بے یقینی ناامیدی اور شدید غم تلے دب کر آہیں بھرنے لگتی، محبت کا آرا اوپر تلے برابر اس کے تختے کاٹتا چلا جا رہا تھا۔

میں سوشیالوجی کے طالب علم کی طرح سوچنے لگا کہ جب انسان نے سوسائٹی کو تشکیل دیا ہوگا تو یہ ضرورت محسوس کی ہوگی کہ فرد علیحدہ علیحدہ مطمئن زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ باہمی ہمدردی میل جول اور ضروریات نے معاشرہ کو جنم دیا ہوگا۔ لیکن رفتہ رفتہ سوسائٹی تنی پیچ در پیچ ہو گئی کہ باہمی میل جول، ہمدردی اور ضرورت نے تہذیب کے جذباتی انتشار کا بنیادی پتھر رکھا۔ جس محبت کے تصور کے بغیر معاشرے کی تشکیل ممکن نہ تھی۔ شاید اسی محبت کو مبالغہ پسند انسان نے خدا ہی سمجھ لیا اور انسان

دوستی کو نسبت کی معراج ٹھہرایا۔ پھر یہی محبت جگہ جگہ نفرت حقارت اور غصے سے زیادہ لوگوں کی زندگیاں سلب کرنے لگی۔ محبت کی خاطر قتل ہونے لگے۔۔۔۔ خود کشی وجود میں آئی۔۔۔۔ سوسائٹی اغواء سے شخصون سے متعارف ہوئی۔ رفتہ رفتہ محبت ہی سوسائٹی کا ایک بڑا روگ بن گئی اس جن کو ناپ کی بوتل میں بند رکھنا معاشرے کے لیے ممکن نہ رہا اب محبت کے وجود یا عدم وجود پر ادب پیدا ہونے لگا۔۔۔۔ بچوں کی سائیکولوجی جنم لینے لگی۔ محبت کے حصول پر مقدمے ہونے لگے۔ ساس بن کر ماں ڈائین کا روپ دھارنے لگی۔ معاشرے میں محبت کے خمیر کی وجہ سے کئی قسم کا ناگوار Bactria پیدا ہوا۔

نفرت کا سیدھا سادا شیطانی روپ ہے۔ محبت سفید لباس میں ملبوس عمر عیار ہے۔ ہمیشہ دوراہوں پر لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ اس کی راہ پر ہر جگہ راستہ دکھانے کو صلیب کا نشان گڑا ہوتا ہے۔ تبھی جھمیلوں میں کبھی فیصلہ کن سزا نہیں ہوتی ہمیشہ عمر قید ہوتی ہے۔ جس معاشرے نے محبت کو علم بنا کر آگے قدم رکھا وہ اندر ہی اندر اس کے ننھ ور سے بری طرح متاثر بھی ہوتی چلی گئی۔ جائز و ناجائز محبت کے کچھ ٹریفک رولز بنائے لیکن ہائی سپیڈ معاشرے میں ایسے سپیڈ بریکر کسی کام کے نہیں ہوتے کیونکہ محبت کا خمیر ہی ایسا ہے زیادہ خمیر لگ جائے تو بھی سوسائٹی پھول جاتی ہے۔ کم رہ جائے تو بھی پپڑی کی طرح تڑخ جاتی ہے۔

شکست و ریخت۔

بدبختی و سوختہ سامانی۔

آج تک سوسائٹی جراثیم کی بیخ کنی پر اپنی تمام قوت استعمال کرتی رہی ہے۔ اس نے اندازہ نہیں لگایا کہ کتنے گھروں میں کتنے مسلکوں میں سارا نقص۔ ہی محبت سے پیدا ہوتا ہے۔ سوسائٹی کا بنیادی تضاد ہی یہ ہے کہ ابھی تک وہ محبت کا علم اٹھائے ہوئے ہے۔ حالانکہ وہ اس کے ہاتھوں توفیق بھر تکلیف اٹھا چکی ہے۔ جب تک یہ

جن دوبارہ بوتل میں بند نہیں ہو جاتا اور اس کے ٹریفک رولز مقرر نہیں ہوتے' تب تک شانتی ممکن نہیں۔ کیونکہ محبت کا مزاج ہوا کی طرح ہے کہیں ٹکتا نہیں اور معاشرے کو کسی ٹھوس چیز کی ضرورت ہے۔

محبت میں بیک وقت توڑنے اور جوڑنے کی صلاحیت ہے۔ سوسائٹی کا رنگ اسی کی بدولت نکھرتا ہے اور اسی جذبے کی وجہ سے شدید کالک بھی منہ پر لگتی ہے میں اور سیمی اگر اب بھی ہم جماعت ہوتے تو محبت کے اس پہلو پر کئی گھنٹے بحث کرتے رہتے پھر وہ ابن خلدون' ڈرخائم' کومٹ اور مارکس کے نکتہ نظر پیش کر کے بحث کو بڑی Objective اور خوب صورت بنا دیتی ہم کسی نئی تھیوری کے سر پر پہنچ کر اپنے آپ کو بہت ذہین تصور کرنے پر مجبور ہو جاتے ایسی بحثیں جو عام طور پر ہم کیفے ٹیریا میں کیا کرتے تھے۔ ہمیں ایک دوسرے سے کس قدر دور لے جایا کرتی تھیں اور ان ہی کی وجہ سے ہم نے کتنے فاصلے طے کیے تھے۔ لیکن اس وقت وہ میری ہم جماعت نہ تھی۔ وہ مائی توبہ توبہ کی تلی تھی۔

میرے گاؤں چندرا میں ایک پرانا بھٹہ تھا۔ اینٹیں بنانے والے یہاں سے کبھی کے جا چکے تھے۔ لیکن جا بجا ٹوٹی اینٹوں کے چھٹے لال گیروے رنگ کی پکی مٹی اور گہری کھائیاں تھیں جن سے مٹی کھود کھود کر اینٹیں بنائی جاتی ہوں گی۔ برسات میں ان کھائیوں میں برساتی پانی بہہ کر اکٹھا ہو جایا کرتا۔ پرانے بھٹے کے پاس مائی توبہ توبہ کی جھگی تھی۔ پتہ نہیں اس کا اصلی نام کیا تھا۔ لیکن اب سارے گاؤں میں اسے سب مائی توبہ توبہ کہتے تھے۔ سارے گاؤں میں مشہور تھا کہ وہ کالا علم جانتی ہے۔ لیکن ایک بار میری موجودگی میں کسی نے اس سے استفسار کیا تو وہ کانوں پر ہاتھ رکھ کر توبہ توبہ کرنے لگی۔ ایک روز میں شام گئے گھر نہ لوٹ سکا۔ باہر امرود کے باغ میں کچے پکے امرود توڑتے مجھے دیر ہو گئی۔ پتہ نہیں میرے باقی ساتھی کیا ہوئے لیکن

جس وقت میں باغ سے باہر نکلا تو ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پرانے بھٹے تک پہنچتے پہنچتے بارش کا یہ عالم تھا کہ مجھے لگا۔ پانی کا ریلا مجھے زمین میں میخنا چاہتا ہے۔ اس روز میں نے مائی توبہ توبہ کی جھگی میں پناہ لی۔

جس وقت جھگی میں داخل ہوا۔ مائی توبہ توبہ نے منہ پر انگلی رکھ کر مجھے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ میں پھوس کی دیوار کے ساتھ کھڑا ہو کر سہم گیا۔ مائی اس وقت ایک آٹے کا پتلا بنا رہی تھی۔ اس نے بڑی توجہ سے ایک گھٹیا آٹے کا انڈا بنایا۔ پھر چولہے میں سن کی چھیٹیوں کی آگ جلائی۔ اب وہ اس آٹے کے پتلے میں سوئیاں کھبونے لگی۔ ہر سوئی پتلے میں فٹ کرنے کے بعد وہ آنکھیں پھراتی اور دیر تک چھو چھو کرتی جس وقت اس نے اس آٹیکے پتلے کو آگ میں ڈالا۔ بجلی اس زور سے کڑکی کہ بھٹے سے لے کر امرود کے باغ تک ساری دھرتی سفید ہو گئی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھول کر بھاگنا چاہا۔ لیکن اس وقت کسی نے پیچھے سے میرا کرتا پکڑ کر کہا "دیکھ اگر کسی سے بات کی تو سوئیاں چبھو کر تجھے بھی آگ میں جھونک دوں گی کسی کو بتایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"

اس وقت میرے سامنے میری ہم جماعت نہیں تھی جس سے میں سوشیالوجی کی بحثیں کیا کرتا تھا۔ بلکہ وہ مائی توبہ توبہ کی پتلی تھی۔ جس میں پتہ نہیں کتنی ان گنت سوئیں چھپی ہوئی تھیں اور وہ بھٹی میں اترنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو قیوم؟"

آفتاب کیسا آدمی ہے؟"

"مجھے کیا پتہ؟"

"وہ تمہارا روم میٹ تھا"

میں نے نثری انداز میں بولنا شروع کر دیا "وہ اکتوبر کے مہینے کی پیداوار ہے اس ناطے سے وہ Libra ہے ایسے لوگوں میں ایک قدرتی ہوتا ہے۔"

"اور ۔۔۔ اور ۔۔۔"

"تین بہنوں کا کلوتا بھائی ہے۔ سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوا ہے۔"

"یہ تم مجھے کیا بتا رہے ہو ۔۔۔ یہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔"

"جو کچھ تم جانتی ہو، میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں جانتا۔"

"اس نے کیسے وہ سب کچھ بھلا دیا میری محبت ۔۔۔ ہمارا ۔۔۔ میل جول وہ سب کچھ"

"یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا کہ اس نے سب کچھ بھلا دیا ہے۔"

"پھر یہ سب ۔۔۔ کیا ہے؟ ۔۔۔ یہ شادی ۔۔۔ یہ زیبا ۔۔۔ یہ ماں باپ کی فرمانبرداری ۔۔۔ یہ سب کچھ!"

ہم دونوں خاموش ہو گئے۔

میں اسے آفتاب کی ایسی کوئی بات بتانا نہ چاہتا تھا جو اس کی محبت کو اور پختہ کرتی اور پھر بھی میں اسے تسلی دینے پر مجبور تھا۔

"وہ کون ہے؟ ۔۔۔ کیا ہے؟ ۔۔۔ کیسا آدمی ہے؟ ۔۔۔ خدا کے لیے تم تو اتنے اچھے تجزیے کیا کرتے تھے ۔۔۔ بتاؤ ناں ۔۔۔ اس کی اصلیت کیا ہے؟"

میں نے سر کھجلایا اور دانشور بن کر بولا ۔۔۔ "دنیا میں رنگ رنگ کے لوگ ہیں ان کی سٹڈی کے الگ الگ علوم ہیں ۔۔۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ ۔۔۔ کہ آفتاب۔"

"تبت کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ہر انسان کے گرد رنگ کا ایک ہالہ ہوتا ہے اور یہ ہالہ اس کی اصلی سائیکی کا index ہے۔ کچھ لال ہیں کچھ پیلے کچھ سبز جن کے گرد نیلا ہالا ہوتا ہے وہ لوگ ہمدردی کرنے والے ہوتے ہیں۔ سرخ رنگ والے شدید ہوتے ہیں ۔۔۔ سوسائٹی سے یوں بھڑ جاتے ہیں جیسے ماتادور کا سرخ مینٹل سانڈ کے سینگوں سے الجھتا ہے۔ جذبے کے غلام جنس کے غلام یہ لوگ توڑ پھوڑ کرتے ہیں۔ تمہارے آفتاب کا ہالا بادل کے رنگ کا ہے ۔۔۔ اس پر سورج

کی شعاعیں پڑیں۔

تو اس کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ زمین کا عکس پڑے تو مٹی رنگا ہو جاتا ہے۔ تمہارے آفتاب کے کئی جلوے ہیں کئی رنگ ہیں۔"

"ہاں ہاں اب اس بادل پر زیبا کا رنگ چڑھنے لگے گا۔"

میں اسے جان سے مارنا چاہتا تھا۔

"وہ بہت خوبصورت ہے" سیمی نے میری طرف اس امید سے دیکھ کہ میں اس جملے کی تردید کر دوں۔

"ہاں خوبصورت ہے لیکن بے رنگ ہے۔"

"اس کی بیوی ہے وہ اس کی محبت کی زیادہ مستحق ہے ہے نا۔ ہے نا بولو؟

"

خدا جانے محبت کا دراصل مستحق کون ہوتا ہے؟ میں نے دیکھا ہے کہ بگڑے دل رئیس جنہیں بہت محبت ملتی ہے عموماً اسی محبت کی مٹھاس کا مزہ زائل کرنے کے لیے پچھی پشتوں کی

عزت اتروانے طوائفوں کے پاس جاتے ہیں شہر کے مشہور دانشور ایسی عورتوں کے پیروں پر نماز پڑھتے ہیں۔ جو انہیں کتے کے باسن میں کھلاتی ہیں۔ انسان کا دل ہمیشہ محبت کا متلاشی نہیں ہوتا۔ جب محبت کی گیس سے اس کا غبارہ پھٹنے لگتا ہے تو اس کی آرزو ہوتی ہے کہ کوئی سوئی ہلکا سا چھید کر کے اس کی انا کو کم کر دے جو لوگ ہماری عزت اتارتے ہیں اور بے دفع دور رکھتے ہیں وہ ہماری انا کو کترنے والی قینچی ہوتے ہیں۔ انا کا سائز بہت بڑا ہو جاتا ہے تو ایسی قینچی کہیں نہ کہیں سے پیدا ہو جاتی ہے۔ انسان ہمیشہ محبت کی فضا میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہمیشہ فرعون بنے رہنا اس کے لیے ممکن نہیں۔ وہ خدا سے لے کر معمولی بدتک ہر سٹیج پر اترتا چڑھتا رہتا ہے۔ جیسے ستار سروں پر انگلیاں پھرتی ہیں۔ جب مختلف

طریقوں سے کئی بار یہ ہجرت ہو چکتی ہے تو ایک انسان کا گیت مکمل ہوتا ہے۔ اسی لیے زندگی کے لیے محبت بھی ضروری ہے اور نفرت بھی جب نفرت پاتال میں لے اترتی ہے۔ تو پھر کہیں سے محبت اوپر اٹھاتی ہے اتنا اٹھائے لیے جاتی ہے کہ آدمی غبارہ بن کر آسمانوں کو چھونے لگتا ہے جب یہ غبارہ اور اوپر نہیں جا سکتا لیکن اس کی آرزو کم نہیں ہوتی تو کہیں سے حقارت نفرت کی سوئی گیس کم کرنے کو آنکلتی ہے یہ عمل مسلسل ہے زندگی کے ساتھ ساتھ ہے خدا سے لے کر عبد تک عمل فرشتے سے لے کر شیطان تک کی منزل۔

ان مٹ سے لے کر ناپائیدار تک

"تم کیا سوچتے ہو۔۔۔ کہاں چلے جاتے ہو تم قیوم۔۔۔ تم کو اپنی پڑھائی کا اس قدر فکر کیوں ہے؟"

میں چپ رہا۔

"مجھے بتاؤ۔۔۔ سمجھاؤ مجھے خدا کے لیے۔۔۔ جس طرح تم مجھے ذرا کم کی تھوری سمجھایا کرتے تھے خودکشی کی۔۔۔ بتاؤ قیوم محبت کہاں ملتی ہے؟۔۔۔ کن کو ملتی ہے

؟۔۔۔۔"

میں اسے کیا بتاتا۔

میں تو خود بچپن سے محبت کی تلاش میں سرگرداں رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ محبت کہاں ملتی ہے کن کو ملتی ہے اور کن وجوہات کی بنا پر ملتی ہے لیکن جب کبھی وہ مجھ سے بات کرنے کی توقع رکھتی میں بولتا جاتا۔

"محبت کا تحفہ بھی عموماً دو قسم کے لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔۔۔ ایک وہ فرعون صفت لوگ جو اپنے جیسا کسی کو نہیں سمجھتے جو چلتے نہیں اچھلتے ہیں ان کو انا کو پر تیغ کرنے کے لیے ان کی زندگی میں کوئی شخص محبت کا گلدستہ لے کر داخل ہوتا ہے

گلدستہ وصول کرتے وقت فرعون شکل لوگوں کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں کانٹے بھی ہیں اور چیونٹیاں بھی۔۔۔۔عموماً ان ہی چیونٹیوں کے ہاتھوں بڑے بڑے ہاتھی جاب تحق ہو جاتے ہیں۔"

"میں تمہاری بات سمجھی نہیں قیوم۔۔۔۔یا شاید آج میرا دماغ درست نہیں"

"یک وہ لوگ جو خدا سے بھی نہیں ڈرتے ان کو انسان بنانے کے لیے۔۔۔۔ عہد بنانے کے لیے محبت عطا ہوتی ہے ان کی حیثیت سمجھانے کے لیے۔ان کا قد عام انسانوں جتنا کرنے کے لیے۔۔۔۔یا پھر محبت ان لوگوں کو ملتی ہے جو مرنے کی آرزو میں جیتے ہیں جاں بلب ہوتے ہیں ان کے لیے محبت کا تریاق آتا ہے غیب سے۔ یکدم ان مردہ لاشوں میں زندگی کے آثار اجاگر ہوتے ہیں وہ درختوں کو پرندوں کو چاند ستاروں کو از سر نو دیکھنا شروع کرتے ہیں بچے کی حیرت کے ساتھ موسم ان پر اثر انداز ہوتے ہیں ایک بار پھر۔۔۔۔"

"کیا کیا کیا؟"

"سنو بھی سنو۔۔۔۔محبت مارتی بھی ہے اور زندہ بھی کرتی ہے۔۔۔۔پھنکارتی انا کو مارنے کے لیے بھی محبت کا زہر ہے اور قریب المرگ زندگی کو زندہ کرنے کے لیے بھی محبت

ہی کا تریاق ہے۔"

اب وہ بپھر گئی

"تم سے بھی کچھ نہیں ہو گا۔۔۔۔تم بھی ایویں ہی ہو۔۔۔۔واہیات۔۔۔۔ صرف کچے پکے فلاسفروں بالکل ڈاکٹر سہیل کی کاربن کاپی۔"

"تمہیں تسلی کیسے ہو گی۔"

"محبت سے صرف محبت سے"

میں ہنس دیا۔

"اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔"

میں نے دکھی سے کہا۔۔۔۔ تمہیں محبت نہیں چاہیے کسی۔۔۔۔ تمہیں صرف آفتاب درکار ہے۔۔۔۔ سب کا یہی حال ہے۔۔۔۔ سب کا سب کو محبت چاہیے لیکن صرف اس شخص کی جسے اس کا اپنا دل شدت سے چاہتا ہے۔۔۔۔ باقی سب محبتیں کیلے کا چھلکا ہیں وافر وابیات۔۔۔۔ غیر ضروری۔۔۔۔ ایویں۔

"تم نے کبھی محبت کی ہو۔۔۔۔ تو تمہیں پتہ ہو آدمی کس کرب سے لنگتا ہے تم کو تو ہر وقت پڑھائی کی پڑی رہتی ہے۔۔۔۔ اپنی تھیوریاں بنانے میں لگے رہتے ہو پروفیسر سہیل کے ساتھ سوشلزم کی بحث کرنے میں وقت گزرتا ہے تمہارا۔۔۔۔ جاؤ جا کر رسکن پڑھو۔۔۔۔ اینگلز پر سر کھپاؤ۔۔۔۔ تم کو کیا پتہ کہ ایک ایسا وقت انسان پر آتا ہے جب وہ خوب پیٹ بھر کر کھانا کھانے کے باوجود خودکشی کر لیتا ہے۔۔۔۔ تم کو کیا پتہ۔۔۔۔ سب کچھ معاشرہ نہیں ہوتا۔ معاشیات سے انسان کی فلاح مکمل طور پر بندھی ہوئی نہیں ہے۔۔۔۔ تمہیں کیا پتہ۔"

"مجھے پتہ ہے۔۔۔۔ پتہ ہے۔" میں چلایا

اس نے اپنا پرس اٹھایا لکڑی کی ہیل والے جوتے تلاش کیے اور اٹھ گئی

"تمہیں میری بات سننا ہوگی۔۔۔۔ میں نے بھی محبت کی ہے کسی سے۔۔۔۔ شدت کے ساتھ۔۔۔۔ آج تمہیں میری طرف کی کہانی بھی سننا پڑے گی سیمی۔"

"سنوں گی قیوم۔۔۔۔ ضرور سنوں گی لیکن آج نہیں۔۔۔۔ دیکھو نا آج میرا ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر التجا کی۔۔۔۔ "صرف ایک جملہ۔"

"آج نہیں قیوم پتہ ہے آج ہی تو اس کی شادی ہوئی ہے۔۔۔۔ آج ہی تو بینڈ سوسئیڈ ہوا ہے زبردست قسم کا۔"

وہ چپ چاپ باہر نکل گئی۔ صرف اس کا چھوٹا سا پھولدار رومال اڈنی چارپائی پر

پڑا رہا۔

اسے میرے اظہار محبت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔۔۔ میں اسے کیسے بتاتا؟ کہ میرے سارے فلسفے میرے تمام تجزیے پروفیسر سہیل کے ساتھ ہونے والے مباحثے اس ایک نا آسودہ جذبے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔

کیا میں جنسی محرومی کا شکار تھا۔ کیا میں صرف Frustrated تھا؟

کیا میری ذہانت ان محرومیوں کی وجہ سے سان پر چڑھی تھی۔؟

سیمی کے جانے کے بعد فوراً کتابوں کی طرف متوجہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اس کے کٹے ہوئے پھوسدار رومال۔۔۔ کئی چیزیں! جیسے شہد کی مکھیاں میرے تعاقب میں تھیں اور میں ان سے بھاگ کر کہیں جا نہ سکتا تھا کئی بار باتیں کرتے کرتے وہ اپنی بائیں گال کے تل کو جڑ سے اکھاڑنے کی ایسی کوشش کرتی کہ مجھے اس کی کیوٹکس لگے ناخنوں سے نفرت ہو جاتی۔۔۔ سیمی جا چکی تھی صرف اس کی خوشبو باقی تھی۔۔۔ تار پر سوکھنے والے کپڑوں کی طرح چارپائی پر رومال پڑا تھا اور اس کے جانے والی کی ذات کا کمپیوٹر چل رہا تھا۔

میں نے پہلے تو اس رومال کے باوجود پڑھنے کی کوشش کی پھر مجھے خیال آیا کہ جب تک وہ ایک لاوارث بچے کی طرح چارپائی پر بلکتا رہے گا میں توجہ سے نہ پڑھ سکوں گا۔ میں نے رومال اٹھایا سونگھا اس کی تہیں بالکل ویسے جمائیں جیسے پہلے تھیں پھر اسے پاس رکھ کر پڑھنے لگا لیکن اب رومال بلی کے بچے کی طرح بڑا جاندار ہو گیا تھا۔ وہ پنکھے کی ہوا میں پھول رہا تھا۔ شکلیں بدل رہا تھا فضا میں اپنی خوشبو کو آنسو گیس کی طرح پھیلائے جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے بار بار میری آنکھیں نمناک ہو جاتی تھیں اور جب میں آنکھیں پونچھ کر دوبارہ اسے میز پر رکھتا تو وہ پہلے سے زیادہ نڈر اور کھلنڈرا ہو جاتا۔

اس رومال کو ٹھکانے لگانے کے لیے میں کواڈرینگل سے نکل کر انارکلی کی طرف

چلا گیا۔ دن کے وقت انارکلی کا کچھ اور رنگ ہوتا ہے۔

گاہکوں کی سرگرمیاں، دوکانداروں کی گرم جوشیاں اور بکاؤ مال کی وافر نمائش کچھ دیکھنے نہیں دیتی کچھ کاروالے سائیکل والے، پیدل، سکوٹر سوار، بازار میں خرید وفروخت کے لیے نہیں آتے فقط اضافی آمدورفت بن کراتے ہیں انہیں اس راستے کہیں اور مثلا رنگ محل یا شاہ عالمی جانا ہوتا ہے اس مجمع سے بھیڑ بھاڑ میں اور اضافہ ہوتا ہے کچھ ان لونڈوں کا ٹریفک ہوتا ہے جن کا خرید وفروخت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ محض دوکانوں پر چائے یا بوتلیں لے جانے یا واپس کرنے میں مصروف ہوتے ہیں ان کے کندھوں پر مکسڈ چائے کی پیالیاں، نان چھولے، کباب یا بوتلیں ہوتی ہیں۔۔۔طرارے بھرتے لوگوں میں راستہ بناتے وہ بھونڑے سے نکل جاتے ہیں لیکن چونکہ وہ ٹریفک کے بہاؤ کے ساتھ نہیں ہوتے اس لیے ان سے بھی آمدورفت کا تار ٹوٹتا ہے پھر کالج کے طالب علموں کی وہ ٹولیاں بھی ہوتی ہیں جو لڑکیاں تاڑنے دوکانوں کے تھڑوں کے پاس کھڑے ہوتے ہیں ان کا بھی براہ راست بازار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا وہ بڑے پتھروں کی طرح نظروں سے بازار کے بہاؤ کو روک لیتے ہیں اس کے علاوہ دوکانداروں کے بچے رشتہ دار اور بوڑھے بزار میں ملنے کی غرض سے آتے ہیں ان کا بھی خریداری سے تو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ لیکن ان کی وجہ سے انارکلی کا راستہ تنگ پڑ جاتا ہے ٹریفک رک رک جاتا ہے اور انارکلی کی شکل داتا دربار کے عرس جیسی ہو جاتی ہے۔

میں روحل کو انارکلی کے اس سرے سے لے کر شاہ عالمی تک بہنے لے گیا۔

لیکن پتہ نہیں وہ کیوں آنسوؤں سے بھیگتا جارہا تھا؟ رات کے پچھلے پہر اتنی قوس سے قریب سونی انارکلی میں بلا تکلف روتے جانے میں کوئی قباحت نہ تھی دوکانوں پر جستی پھٹک چڑھے تھے اور ان کے دونوں طرف دوہرے دوہرے تالے تھے۔۔

۔۔لوگ تھڑوں پر سوئے ہوئے تھے۔۔۔ٹریفک اب بھی تھا۔۔۔لیکن اتنی

رات گئے اکا دوکا آنے والوں کو پروا نہ تھی کہ کوئی لیڈیز رومال سے آنکھیں پونچھتا کہاں جا رہا ہے۔

آج رات سیمی نے میرے دل کے بازار سے کچھ خریدے بغیر اس میں ساری ٹریفک بند کر دی تھا ۔ ۔ ۔ ۔ جیسے اس نے اپنا تری ٹرک گلی کے ناکے پر لا کھڑا کیا۔ اب پچھلی گاڑیاں ہارن بجا رہی تھیں۔ پی پی پاں پاں کر رہی تھیں کچھ بے چین کاروں سے اتر اتر کر اس کھڑے ملٹری کے تھری ٹن ٹرک کو دیکھ رہے تھے۔ لیکن وہ گلی کے دہانے پر جم کھڑا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی بریکیں فیل ہو گئی تھیں سلف جواب دے گیا تھا۔

سیمی اس رومال کی صورت میں میرے اندر ایک تھری ٹن ٹرک کھڑا کر گئی تھی میں اس رومال کے ہوتے ہوئے نارمل آمد و رفت کا حامل نہ ہو سکتا تھا۔ ہوسٹل پہنچ کر میں نے پہلے سے تکیے تلے رکھا پھر میز کی دراز میں ابن خلدون کی کتاب کے بیسویں صفحے کے اندر چھپا دیا جس میں تین صفحے بھی پڑھنے نہ پایا تھا کہ میں نے اسے وہاں سے نکال کر اپنی جیب تھنے لگی تو میں نے اسے سوٹ کیس میں بند کر دیا۔

پہلا بوسہ، پہلا تحفہ ۔ ۔ ۔ ۔ پہلی مرتبہ اقرار محبت میں گرمیوں کی اولین بارش جیسی کیفیت ہوتی ہے سارے میں مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو پھیل جاتی ہے۔

حالانکہ یہ رومال نہ تحفہ تھا نہ بوسہ نہ اقرار محبت ۔ ۔ ۔ ۔ پھر بھی سیمی سے وابستہ پہلی چیز جو میرے ہاتھ آئی تھی کچھ دیر بعد میں نے رومال کو سوٹ کیس سے بھی نکال لیا ۔ ۔ ۔ اچانک وہ بہت غیر محفوظ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد پڑھائی، رومال اور میں آنکھ مچولی کھیلنے لگے ۔ ۔ ۔ ۔ میں ہر پانچ منٹ کے بعد اس کی جگہ تبدیل کرنے لگا۔ ۔ ۔ ۔ کبھی اس کی باری منظر تلے آتی ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی میں اسے بش شرٹوں کے اوپر رکھتا۔ ۔ ۔ ۔ یہاں سے نکال کر پتلون کی اندرونی تہہ اس کا پڑاؤ بنتی ۔ ۔ ۔ ۔ آخر میں بہت سوچنے کے بعد میں نے اسے سوٹ کیس کے نیچے بچھے ہوئے اخبار تلے بچھا کر سوٹ کیس کو تالا لگا دیا۔

بچپن میں ہمارے گاؤں میں اسی طرح میرے چچا ایک نیا سائیکل لے کر آئے تھے۔۔۔ابھی اس کے ڈنڈوں پر خاکی کاغذ چڑھا تھا اور پچھلے مڈگارڈ پر لگا ہوا تالا بڑی مشکل سے کھلتا تھا۔۔۔۔چچا کی سائیکل نے میری راتوں کی نیند حرام کردی تھی سائیکل پر چڑھنا میرے مقدر میں نہ تھا میں صرف اسے صاف کر کے باہر والی حویلی میں کھڑا کر دیتا تھا چچا کے اٹھنے سے بہت پہلے میں اسے بتی والے نلکے کے پاس لے جاتا سائیکل صاف کرنے کا سارا سامان میرے پاس ہوتا پرانے ٹوتھ برش، گریس کا ڈبہ صاف اور گندے چیتھڑے، ڈھبریاں کسنے کے پیچ کس، ہتھوڑی، موم۔۔۔۔میں نے سائیکل صاف کرنے کے لیے جو سامان اکٹھا کر رکھا تھا وہ کار کی سروس کے لیے کافی ہوتا۔ایک بار سائیکل صاف ہو جاتی تو پھر کبھی آنگن میں کبھی گھڑونچی کے پاس کبھی برآمدے میں اس کے پارک کرنے کی مشکل پیش آتی جس طرح ماڈرن لڑکیاں دھوپ سے بچتی ہیں اور اپنی جلد کا خیال رکھتی ہیں۔۔۔۔میں سائیکل کے پینٹ کے لیے فکر کرتا رہتا۔

پھر چچا اٹھتے باہر کی حویلی سے سائیکل اٹھاتے۔کچی مٹی سے بھری سڑکوں پر اونچی نیچی منڈیروں پر کھلیانوں میں بنجر گزرگاہوں پر ببول کے کانٹوں سے بھری پگڈنڈیوں میں نہر کنارے والی سڑک پر یہاں وہاں جانے کہاں کہاں سائیکل لیے پھرتے۔واپسی پر جب وہ گھر لوٹتے تو سائیکل گرد کی وجہ سے پہچانی نہ جاتی۔

بازار سے واپسی پر میں کافی دیر اپنے نئے نام نیمل کے مطابق خاص انداز میں بڑبڑاتا رہا لیکن سندر ہی سندر کہیں سوچ کی تنگی اور تنگی ہوئی تھی۔جیسے گھڑی کی بیرونی سوئیاں منٹ گھنٹے دکھاتی ہیں لیکن اندر کی گراریوں کی رفتار سے یہ اندازہ نہیں ہوسکتا گو میں بڑبڑ بیڈ لیمپ جلا کر اس روشنی میں رات کے تین بجے تک سو شیا ہو جی پڑھتا رہا لیکن میرے اندر بار بار آفتاب کی شادی ہوتی رہی کبھی کاروں سے بڑے

تکلف کے ساتھ اترتی عورتیں نظر آنے لگتیں۔ کبھی بیرے چائے کے ٹرے اٹھائے نظروں میں گھوم جاتے کبھی آفتاب صاف دکھائی دیتا۔ اس کی اچکن شلوار سر سے بندھا ہوا سنہری تاروں والا سہرا اور گلے میں پڑے ہوئے بڑے بڑے نوٹوں کے ہار۔۔۔ کس طرح وہ فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھا تھا اور کس طرح اس نے اپنی اچکن اور ہار بیٹھنے کے بعد درست کیے تھے۔

"لڑکی کوئی نہیں آئی۔۔۔۔۔" اس نے بہت آہستہ سے مجھ سے پوچھا تھا۔

پتہ نہیں وہ کس لڑکی کے بارے میں پوچھنا چاہتا تھا۔

آفتاب کی شادی کے پلے بیک پر سیمی کی آہوں کا مسلسل میوزک سوپر امپوز ہو چکا تھا کوئی بینڈ کوئی ڈھولکی کوئی گیت میرے ذہن میں نہیں ابھر رہا تھا۔ بلکہ مسلسل سیمی کا رونا آہستہ آہستہ بیک گراؤنڈ میوزک کی طرح ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔۔۔۔

سوشیالوجی کی کتاب میرے سامنے کھلی تھی رات کا پچھلا پہر تھا اور میں ماسٹر غلام رسول کی طرح اڑا ہوا تھا کہ پڑھ کر دم لوں گا۔

سونے پڑھنے پریشان خواب دیکھنے کا یہ تیسرا Phase تھا جب دروازے پر دستک ہوئی اور جمال داخل ہوا۔

"کون ہے؟۔۔۔۔۔" میں نے کئی خوابوں کو توڑ کر جواب دیا۔

"جمال۔۔۔۔۔ جمال رشید۔۔۔۔۔ دروازہ کھولو۔۔۔۔۔"

جب میں نے دروازہ کھولا تو تھوڑی دیر کے لیے وہ بھی مجھے اپنی سوچ کا ہی ایک حصہ نظر آیا۔

"کیا ہے۔۔۔۔۔ کیا چاہیے۔۔۔۔۔"

جمال نے اپنے ہونٹ کاٹے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور بولا

"یار اجد کا Accident ہو گیا۔۔۔۔۔ مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے۔"

"کس کا ـــــ کس کا ـــــ"

"امجد کا۔"

"وہ آفتاب کی شادی سے میرے ساتھ واپس آیا۔ بیوقوف کی عقل ملاحظہ ہو، موٹر سائیکل پر پنڈی گیا راستے میں اینٹوں سے لدے ہوئے ٹرک سے اس کا موٹر سائیکل ٹکرا گیا ـــــ وہیں Finished پھڑک گیا ـــــ یار ہم سب اس کی ذہانت سے کتنا کھچتے تھے؟ ـــــ ہم سب اس کو Beat کرنے کی کتنی کوشش کرتے تھے ـــــ کیا شہزادگی سے منہ کی مار گیا ـــــ خدا قسم مجھے اس وقت بڑی Guilt ہو رہی ہے۔"

"یار ابھی تو وہ ہمارے ساتھ تھا ـــــ آفتاب کی شادی پر ـــــ کیسے ـــــ کیوں؟"

"کئی بار میں نے آرزو کی تھی کہ ـــــ کہ اگر وہ امتحان نہ دے تو میں فسٹ آ سکتا ہوں ـــــ یار میری آرزو نے اس کی جان لے لی۔"

"احمق نہ بنو ـــــ ایسی آرزو بھی پوری تھوڑی ہوتی ہے ـــــ لیکن اسے مصیبت کیا تھی کہ آدھی رات کو موٹر سائیکل پر ـــــ"

"وہ فسٹ آنا چاہتا تھا ـــــ کہنے لگا ہوسٹل میں میرا ٹائم ویسٹ ہوتا ہے رات ہی رات پہنچ جاؤں گا ـــــ صبح سے تیاری کروں گا سنجیدگی کے ساتھ۔"

وہ یہ کہتا ہی پھرکی کی جیسا گھوم کر واپس چلا گیا۔

میں واپس آ کر سوشیالوجی کی کھلی کتاب کو پڑھے بغیر دیکھنے لگا۔

ہر منزل پر پہنچنے سے پہلے عموماً راہ گیروں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہے۔

کرسمس کی چھٹیوں سے بعد اور امتحانوں سے کچھ پہلے عموماً عجیب عجیب وقوعات ہونے لگتے ہیں کرسمس کی چھٹیوں کے بعد ہی کالج میں تھیں لوئی فائنل کے امتحانوں سے اس قدر قریب آفتاب کی شادی کا ہو جانا حادثہ تھا پھر اب سیپورٹس مین امجد کی

موت!

کیا ہر امتحان سے پہلے نیچرل سلیکشن بھی ہوتی ہے؟

کیا فطرت کچھ افراد کے قبل ہو جانے سے خود ڈرتی ہے۔

کیا پاس ہو جانے کی خوشی کچھ پر پیش از وقت اثر انداز ہوتی ہے۔

ہر منزل پر پہنچنے سے پہلے امتحان گاہ میں جانے سے پہلے نفری کم ہو جانے کی آخری وجہ کیا ہے؟

آفتاب کی شادی سے بہت پہلے بھی لاہور چھوڑ کر کیوں چلی گئی تھی؟

ایم اے سوشیالوجی کا امتحان دینے کے بعد میں اپنے بڑے بھائی کے پاس سانده چلا گیا۔ میرے پاس جانے کے لیے اور کوئی جگہ نہ تھی۔ میرے بڑے بھائی مختار سیکرٹریٹ میں ملازم تھے اور ان کے لیے یہ رہائش گاہ دفتر سے قریب تھی۔ کرشن نگر کے آخری بس سٹاپ تک ہم بسوں میں آتے اور وہاں سے چل کر سانده پہنچتے۔ راستے میں بوچڑ خانہ گندے نالے سے سیراب کھیت، گدھے اور تعفن ہر روز ملتا۔

سانده کلاں کا یہ گھر دو منزلوں پر مشتمل تھا۔ نچلی منزل میں بھائی مختار ان کی ایف اے پاس بیوی صولت اور دو بیٹے رہتے تھے۔۔۔۔ اوپر والی منزل کے اکلوتے کمرے میں کاسنی رضائی، سیکنڈ ہینڈ کتابیں تیل سے جلنے والے سٹور لیمپ اور میں رہتے تھے۔۔۔۔ باقی ضروریات کی چھوٹی چھوٹی چیزیں بھی تھیں لیکن کاسنی رضائی کتابیں اور سٹور لیمپ میری طرح جاندار تھے ان میں حدت تھی اور وہ اپنی گم سم زندگی بالکل میری طرح چپ چاپ بسر کرتے تھے۔

بھابھی کم گو کم آمیز اور تیوری دار عورت تھی۔ اسے خوش گپی خوش گفتاری اور افسوس بازی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ چھوٹی سی عمر میں اس کے چہرے پر مردنی کا یک غلاف چڑھ گیا تھا۔ بھلبھری جیسے سفید چہرے پر براؤن تتلیوں جیسی چھائیاں پڑی ہوئی تھیں صولت بھابھی کے چہرے کے بجائے ان کے بازو اور پاؤں زیادہ جاذب نظر

تھے۔ ان کے ساتھ رہنے میں سب سے بڑی سہولت یہ تھی کہ وہ کام کی بات کرنے کے بعد جھٹ روپوش ہو جاتی تھیں۔

"تمہارے کپڑے دھوبی کو دے دیے تھے۔"

"اچھا جی۔"

"کھانا نعمت خانے میں دھرا ہے۔"

"اچھا جی۔"

"رات کو دیر سے آؤ گے؟"

"اچھا جی۔"

ہم دونوں کی گفتگو میں ہر دس قدم کے فاصلے پر خود بخود بریک لگ جاتی اس لیے رفتہ رفتہ ہم نے ایک دوسرے سے ضروری باتیں کرنا بھی چھوڑ دیں بھابی کے دو لڑکے کرشن نگر کے کسی سکول میں پڑھنے جاتے تھے، ان کی نیکریں ڈھیلی کف گندے اور بلتے ہمیشہ پھٹے ہوتے تھے۔ کبھی کبھی وہ مجھے گھر سے باہر ایک پیڈل پر سائیکل چلاتے نظر آجاتے تھے پتہ نہیں وہ واقعی بھابی صولت کی طرح کم گو تھے کہ ان کے دل میں اپنے چچا کا تہور بیٹھ گیا تھا۔ گھر پر وہ اول تو محسوس نہ ہوتے اور اگر کبھی پڑھائیوں سے فارغ ہو بھی جاتے تو انہیں ایک ہی کھیل آتی تھی برآمدے میں رکھے ہوئے ایک تخت پوش پر چڑھ کر وہ گھنٹوں ڈیڑھ فٹ نیچے فرش پر چھلانگیں لگاتے رہتے اور ہر چھلانگ کے بعد ان کو پہلے سے زیادہ حظ حاصل ہوتا۔

بھائی مختار درمیانے درجے کے ایسے افسر تھے کہ جن کی ذہنیت کلرک کی ہوتی ہے آفس ڈاک، پالیسی، فائیل، کیس ڈی او وغیرہ ان کا روزمرہ تھا۔ وہ ایم اے پاس تھے، اپنے وقت کے ذہین آدمی تھے لیکن اب نوکری ان پر مسلط ہو گئی تھی وہ نوکری کے علاوہ اور کسی چیز کے متعلق جانداری کے ساتھ سوچنے کے اہل نہ رہے تھے۔

اوپر والی منزل میں رزلٹ آنے تک میں اور میرے خیالات دست بپنجہ رہا کر

رہے۔ کالج کے تمام ساتھی آخری پرچے کے بعد غائب ہو گئے۔ کبھی کبھی اچانک کسی دوکان پر کسی بس میں کوئی آشنا چہرہ مل جاتا رسمی سی گفتگو ہوتی اور پھر راہیں علیحدہ ہو جاتیں میرا معمول تھا کہ ہر روز صبح کے اخبار میں نوکریوں کی تلاش کرتا سینما پیج اور Wanted دیکھنے کے بعد میں تھک کر پلنگ پر جا لیٹتا۔

یہ برساتوں کا موسم تھا۔

بارش نہ ہوتی تو حبس ہوتا۔۔۔۔ بارش ہوتی تو سلاخوں والی کھڑکی سے ہوا اور بارش اچانک آ کر پرانی کتابوں سے لدی ہوئی میز پر حملہ کر دیتی۔ امتحانوں کے بعد ہر موسم چاہے کوئی بھی ہو لیکن برساتوں کا موسم خاص کر فریب خیال کا موسم ہوتا ہے۔۔۔۔ سیمی کرسمس کی چھٹیوں کے بعد کالج نہیں آئی تھی۔ لیکن اب خدا جانے کیوں اور کیسے ہر بارش کے ساتھ وہ اندر آ جاتی اس نے تو موسون کے ساتھ ٹھیکہ کر لیا تھا خوش آمد خوابوں سے لے کر نسیاں تک اور سیمی کے پوتے نواسے پرورش کرنے سے لے کر جنگل تھل بیلے میں الف پھرنے تک ہر دہشت میں پھر چکا تھا۔ کبھی کبھی اپنی جنون آمیز سوچوں کی وجہ سے میں پہروں بغیر پنکھے کے لیٹا رہتا۔ میرا سارا جسم پسینے میں شرابور ہو جاتا گردن کے نیچے نمکین سوئیاں چبھنے لگتیں پھر اسد خوں والی کھڑکی کی خود بخود کھل جاتی اور برسات کی پھوار کے ساتھ سیمی کمرے داخل ہو کر سب کچھ بھگو دیتی

اس روز اخبار میں ایک نوکری کا اشتہار دیکھ کر میں نے درخواست لکھی گو مجھے یقین تھا کہ میں مر رہا ہوں اور مجھے نوکری کی حاجت نہیں ہو گی پھر بھی میں نے بھائی مختار کو خوش کرنے کے لیے ایک عرضی لکھی اور اسے رجسٹرڈ کرانے کے لیے جی پی او چلا گیا۔

یہیں اچانک سیڑھیوں پر میری ملاقات آفتاب سے ہوئی۔ وہ کچھ خدشے اٹھائے برامدے میں آ رہا تھا۔ گو وہ کافی دیر میرا روم میٹ رہا لیکن ہم دونوں میں

دوستی تو یک طرف بے تکلفی بھی نہ تھی یکدم وہ مجھ سے بغل گیر ہو گیا اور بیرونی ممالک سے آئی ہوئی ڈاک کے نیلے لفافے اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئے۔

"واہ قیوم کیا خوش نصیبی ہے میری۔ میری بروقت ملاقات ہوئی"

"کیا کر رہے ہو ـــــ آجکل ـــــ؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں پوسٹ بکس ہے میرا ـــــ ڈاک لینے آیا تھا ـــــ" آفتاب نے فرش سے لفافے چنتے ہوئے کہا۔

"میرا یہ مطلب نہیں ـــــ کیا کر رہے ہو آج کل؟ نوکری، بزنس، یا عیش۔"

"تاجر کا بیٹا کیا کرے گا تاجری ـــــ ابے کا کاروبار ہے ـــــ ہم بھی دھنس گئے ہیں قالینوں میں۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر دیر تک باتیں کرتا رہا ـــــ میں اپنا ہاتھ چھڑانا چاہتا تھا لیکن آفتاب کی مسکراہٹ ہمیشہ سے ایسی رہی کہ اس کی ہر بات سن لینے کو جی چاہتا، ایک دوسرے کو خدا حافظ کہنے کے بعد جب میں بائیں برآمدے کی جانب بڑھا تو پھر آواز آئی۔

"قیوم ـــــ" میں رک گیا۔

آفتاب میرے پاس آیا اور کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا ـــــ "یار میں لندن جا رہا ہوں۔"

"بزنس مین ہو تمہارے لیے یہ عام بات ہے۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے ـــــ میں ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں میری Immigration کے تمام کاغذات پورے ہو چکے ہیں بس اب سٹیٹ بنک کا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔"

"کب؟"

"ہفتے کو شام چار بجے کی فلائیٹ ہے ـــــ پہنچ جانا ایئر پورٹ پر میں تمہارا

انتظار کروں گا۔۔۔۔۔۔ خدا حافظ۔"

میں آفتاب کا دوست نہیں تھا

میں ایئر پورٹ جانا نہیں چاہتا تھا۔

اس کے باوجود میں وہاں گیا کیونکہ آفتاب کا سیمی سے گہرا تعلق رہا تھا۔ آفتاب کو دیکھ کر کئی قسم کے جذبات سے دوچار ہونے کی مجھے عادت تھی۔ یہ تمام جذبات تکلیف دہ تھے مجھے نچوڑتے تھے، میرا سانس بند کرتے تھے پھر بھی میں ایئر پورٹ جانے سے اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔

بڑے ہال میں داخل ہوا تو دور دور تک آفتاب کہیں موجود نہ تھا۔۔۔ مسافر یوں کھچا کھچ بھرے تھے جیسے یہ ریل کا پلیٹ فارم ہو۔ سیلنگ فین بکثرت چل رہے تھے۔ لیکن اتنے جسموں کی گرمی کے باعث ہوا کہیں نہیں لگ رہی تھی۔ ایک گرم گرم ترکی حمام تھا۔ جس میں لوگ Baggage ٹکٹ اور سیٹ نمبر لیے آ جا رہے تھے۔ لوگوں کے ٹخنوں سے لوہے کی ریڑھیاں بچا بچا کر خاکی وردی والے پورٹر آڑے ترچھے راستہ تلاش کر رہے تھے۔۔۔ سیاہ لیدر کے صوفوں کے ارد گرد سوٹ کیس ٹوکریاں وینٹی بکس اپنی اہمیت کی وجہ سے کچھ پھولے پھولے سے تھے۔ اندر جنگلے کی جانب قطاروں میں کھڑے ایسے مسافر جو اکانومی میں سفر کرنیوالے تھے۔ اس کوشش میں مصروف تھے کہ انہیں ہوائی جہاز میں وہاں جگہ ملے جہاں سے فرسٹ کلاس شروع ہوتا ہے اور ٹانگوں کی تنگی خوب کھلی ہوتی ہے۔ غالباً کراچی جانے والے کی ایک اناؤنسمنٹ میرے آنے سے پہلے ہو چکی تھی کیوں کہ کچھ مسافر جنگلے کے پاس کھڑے الوداعی بغل گیریوں میں مشغول تھے۔ پھر ان کے ملنے والے جپھیوں کے فرائض سے سبکدوش ہو کر بغلی رستے سے باہر اس طرف جانے لگے جہاں جنگلے کے ساتھ کھڑے ہو کر کھلا ایئر پورٹ نظر آتا ہے۔ میں نے سب طرف نظر دوڑائی لیکن آفتاب کا کہیں پتہ نہ تھا کہ اس کے ملنے والے بہت امیر ہیں۔ لڑکیاں

کٹے بالوں سے ہوں گی چہروں پر سکوئیر سبز چہروں میں لکڑیوں کی چپل والی بد ہیت جوتیاں اوران پر آہستہ آہستہ ہاتھی کے کان ہلاتے بل باٹم ۔۔۔۔یا نیلی جینز۔

دور پار آفتاب کا پتہ نہ تھا

میں ہر گروپ کو غور سے دیکھتا رہا۔لیکن کوئی چہرہ مجھے آفتاب کا مشابہ نظر نہ آیا۔ ائیر ہوسٹس لڑکیوں کی رودیاں ابھی کچھ دیر پہلے ہی بدل گئی تھیں وہ آتشی گلابی کرتے گہری سبز شلواریں اور پر عذ دوپٹے پہنے آپ کو پاکستانی کم اور فرانسیسی زیادہ محسوس کر رہی تھیں۔ان کے آنے جانے میں خوش اعتمادی اور اپنا پن تھا جو بھی پائیلٹ مسافروں کی جانب آتا۔سفید وردی میں اصیل مغنے کی طرح ذرا ذرا سا ٹیڑھا چلتا دکھائی پڑتا۔پی آئی اے کا عملہ اس احاطے میں کتنا اہم محسوس کر رہا تھا اس کا اندازہ جمعدارنیوں سے لگانا چاہیے جو بڑے بڑے ڈنڈوں کے ساتھ بندھی ہوئی رسیوں کے ساتھ جگہ بناتی موروں کی طرح تھرکتی فرش صاف کرتی پھر رہی تھیں۔

میں سیون اپ پینے کے لیے کیورشاپ کے پاس چلا گیا۔

یہاں سے سارا ہال نظر آرہا تھا۔۔۔۔۔لیکن آفتاب کا کہیں پتہ نہ تھا اور اناؤنسمنٹ ہو چکی تھی۔بیرونی ممالک کو جانے والے مسافروں کی مائیں رو رہی تھیں بیویاں آنسو پونچھتی سوچ میں مبتلا تھیں کہ وہاں سویڈن میں تو آزادی بہت ہے۔جانے یہ خط بھی لکھیں گے کہ بھول جائیں،خرچہ بھی بھیجیں کہ نئی میم بیاہ لیں؟ باپ اپنے جھوٹے پڑتے ہوئے اعضاء کو گھسیٹ کو بہادر بننے کی کوشش میں آنسو روک رہے تھے۔ان کی آرزو تھی کہ جلدی سے الوداعی رسم ختم ہو اور وہ واپس جا کر چارپائی پر بیٹھیں۔۔۔۔بھائیوں کے دلوں میں حسد تھا۔آرزو تھی تو اتنی کہ کب وہ وقت آئے جب ان کی جیب میں بھی پاسپورٹ Vaccination کارڈ ہو اور وہ بھی بار بار ٹکٹ نکال کر دیکھیں اور واپس بریف کیس میں رکھیں۔چچا اپنے بھائی کی اولاد کے ساتھ اپنی اولاد کا موازنہ کر رہے تھے۔یکدم انہیں اپنی بیوی پر خدا جانے

کیوں غصہ آنے لگا تھا۔ جس نے بچوں کی اچھی پرورش نہ کی ورنہ آج وہ بھتیجے کو خدا حافظ کہنے نہ آتے بلکہ اپنے بیٹے کو دعاؤں کے ساتھ رخصت کرنے کے بے حاضر ہوتے۔۔۔۔۔ سوں برادری اداس تھی یکدم انہیں احساس ہونے لگا تھا کہ ان کی بہن بوڑھی ہو گئی ہے اور بھانجے بھانجیاں جوان ہو گئے ہیں۔

ئیر پورٹ کا ہال بچھڑنے اور ملنے کی وجہ سے جذبات سے بوجھل ہو رہا تھا۔ میں شاید اور رنہ ٹھہرتا اچانک دونوں کندھوں پر بیگ لٹکائے سیاہ چشمہ پہنے آفتاب جلدی جلدی چلتا ہوا داخل ہوا اس کے پیچھے زیبا تھی۔ تھوڑی صوفیہ لورین۔۔۔ ذرا سی فردوس ایکٹرس اور کچھ کچھ سکول کی استانی۔

یکدم لیدر کے تین سیاہ صوفوں پر سے بھاری بھرکم سفید عورتیں اٹھیں یک چھوٹا سا دائرہ بن گیا اور آفتاب اور اس کی بیوی اس دائرے میں بوس بازی اور بغل گیری کرنے لگے۔ وقت کم تھا ملاقاتی زیادہ تھے۔ رومال سے آنسو پونچھنے والی نوعمر لڑکیاں دوپٹوں کے کنارے بھگونے والی عورتیں، عینکوں کے پیچھے بھیگی آنکھوں والے مرد خوش خوش مچھی ڈالے والے لڑکے اور دائرے کے باہر سے اندر والوں کا منظر دیکھنے والے لوگوں کا کافی ہجوم تھا۔

میرا ارادہ اس وقت کھسک جانے کا تھا اور شاید میں چلا بھی جاتا اگر یکدم آفتاب کی نظر مجھ پر نہ پڑ جاتی۔ وہ دائرہ توڑ کر مجھ تک آیا۔ زور سے مجھے سینے سے لگا کر بولا۔۔۔۔ "یار دیر ہو گئی وہاں جنگلے کے پاس پہنچو۔"

baggage کارڈ بنوا کر وہ جنگلے کی دوسری طرف آ گیا۔ اس وقت ہم دونوں کے درمیان پھر جنگلا حائل تھا اور اس کی بیوی وینٹی بکس اٹھائے آہستہ آہستہ لاؤنج کی طرف جا رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کے بعد سسرال والوں کو رومال ہلا کر الوداع کہتی اور پھر آفتاب کی طرف دیکھ لیتی۔

ہم چپ چاپ کھڑے تھے، پتہ نہیں وہ کیا کہنا چاہتا تھا

پتہ نہیں مجھے کیا کہنا چاہیے تھا

بالآخر میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ "یار تمہیں دیر ہوگئی ہے اب اندر چلے جاؤ۔"

"گھر پر ایک جم غفیر تھا۔۔۔۔ دراصل ہم کشمیری لوگ کوے ہوتے ہیں۔۔۔ ذرا سی بات ہو تو اکھٹے ہو جاتے ہیں ان ہی کی وجہ سے دیر ہوگئی۔ کبھی لندن آؤ تو میرے پاس ٹھہرنا۔"

"ضرور۔۔۔"

"اچھا بھئی۔۔۔۔۔" اتنا کہہ کر وہ چپ ہو گیا۔

"اچھا بھئی۔۔۔"

"ایسے ہی ہے۔"

"ہاں بس ایسے ہی ہے۔"

"وطن بھی چھوٹ جاتا ہے آخر۔"

میں چپ رہا۔۔۔۔ مجھے وطن سے محبت کرنے کی عادت نہ تھی۔

اسی وقت اس کے ملنے والے گروپ میں سے ایک نوجوان ہمارے پاس آیا وہ جوانی کی اس سٹیج پر تھا جہاں آواز بدلتی ہے۔ اور ایک جملے میں دو تین Tones بدلتیں ہیں۔

"چاچا جی۔۔۔۔ بہت دیر ہو گئی ہے ابا جی کہتے ہیں اب آپ چلے جائیں۔"

"ہاں دیر ہو گئی ہے۔۔۔۔ جا رہا ہوں۔۔۔۔۔ بس ابھی گیا۔"

آفتاب کھویا ہوا تھا جیسے ایئرپورٹ پر دھند میں راستہ تلاش کر رہا ہو۔

فاصلے پر ایک ہاتھ میں ویٹی بکس اور دوسرے میں رومال پکڑے زیبا آفتاب کو دیکھ رہی تھی۔

"جاؤ آفتاب دیر ہو گئی ہے۔"

"ہاں۔"

"خدا حافظ۔" میں نے ہاتھ بڑھایا۔

"تم کسی سے ملے۔۔۔۔۔؟۔۔۔۔" نظریں جھکا کر اس نے پوچھا۔

"تمہاری شادی کے روز ملا تھا پھر وہ پنڈی چلی گئی۔"

"کیسی ہے؟"

"ٹھیک ہی ہوگی۔"

"میں کوشش کروں گا۔"

"کیسی کوشش؟۔۔۔۔" میں نے پوچھا۔

"کہ۔۔۔۔۔کہ پاکستان کبھی نہ آؤں۔۔۔۔۔شاید وقت۔۔۔۔۔فاصلے۔۔۔۔ شاید دوری۔۔۔۔۔اچھا خدا حافظ۔"

"سنو آفتاب۔۔۔۔سنو وہ جب بھی مجھ سے ملے گی ضرور پوچھے گی۔۔۔۔" پتہ نہیں یکدم میں نے کیا سوچ کر کہا۔

"کیا؟۔"

"بس پوچھے گی سب کچھ۔۔۔۔تمہاری بیوی سے لیکر تمہارے متعلق۔"

"مثلاً کیا۔۔۔۔" اب اسے بیگ وزنی لگنے لگے تھے اور وہ کندھے جھٹکنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

"مثلاً یہی کہ۔۔۔۔۔کہ آفتاب خوش تھا؟"

وہ ہنس دیا۔۔۔۔قالین فروش باپ کا بیٹا۔۔۔۔۔۔تازہ ٹیشو پیپر جیسی تازہ مسکراہٹ والا آفتاب۔

"قیوم آگے جانے والے پیچھے رہے ہوئے لوگوں کی طرح کبھی یاد نہیں کرتے گھر سے بندھی ہوئی گائے اور طرح یاد کرتی ہے اور تانگے میں جتا ہو گھوڑا اور طرح جس سے یاد کرتا ہے جس کو کچھ مل جائے۔ اچھا یار اس کی یادداشت کمزور ہونے لگتی ہے جس کو سب کچھ کھو کر اس کا ٹوٹا پھوٹا نعم البدل بھی نہ ملے ان کا حافظہ بہت تیز

ہو جاتا ہے۔ اور ہر یاد بھالے کی طرح گڑتی ہے ۔۔۔۔ دل میں ۔۔۔ کسی ۔۔۔

اور ۔۔۔۔ میری پچویشن میں بہت فرق ہے قیوم۔"

"آفتاب۔"

"کہو۔"

"تمہیں کسی سے محبت ہے؟ ۔۔۔ بولو ۔۔۔ تمہیں کسی سے محبت ہے کہ

نہیں؟ وہ مجھ سے پوچھے گی ۔۔۔ ضرور ۔۔۔۔"

آفتاب نے مڑ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا رشتہ داروں کو ہاتھ ہلا کر الوداع کہا

اور کندھوں پر بیگ درست کرتا ہوا بیوی کی جانب مڑ گیا۔

مجھے خدا جانے کیوں شبہ ہوا کہ وہ رو رہا ہے۔

کچھ دیر وہیں کھڑا رہا پھر باہر نکلا۔ بھائی مختار کی موٹر سائیکل سٹینڈ سے لی اور ایئر

پورٹ سے باہر نکل آیا۔

پتہ نہیں میں ایئر پورٹ کیوں گیا تھا۔

آفتاب میرا دوست نہیں تھا اس سے میری کوئی بے تکلفی نہیں تھی پھر بھی مجھے لگ

رہا تھا کہ پتہ نہیں کیوں اگر میں کبھی لندن گیا تو اس سے ملے بغیر نہ رہ سکوں گا ۔۔۔

۔ دنیا میں آفتاب سے زیادہ کوئی میرے قریب نہ تھا

کیا اس کی وجہ یہی تھی۔

کیا ان دونوں کی محبت کی وجہ سے میں انہیں ملنے پر مجبور تھا؟ ۔۔۔۔ میں سوچتا جا

رہا تھا۔

چھٹی میں پڑنے والی شام کا سکوت میرے موٹر سائیکل کے شور سے ٹوٹ رہا

تھا۔

عجیب بات ہے شام کے وقت بجلی کی روشنی کے باعث غروب آفتاب کو کوئی نہیں

پہچانتا پر ہمارے اندر رہنے والے پتھر اور دھات کے زمانے والے انسان کے ساتھ

بہت کچھ بیت جاتی ہے۔۔۔۔تہذیب کے ہر قیدی کے اندر سانس کے ساتھ شام داخل ہوتی ہے شام چاہے سردیوں کی ہو چاہے برساتوں کی چاہے اس میں گرمی کی ہو شامل ہو یا خزاں دیدہ پتوں کی سرسراہٹ۔۔۔۔شام کا انسان کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے۔۔۔۔کندھے پر شکار کیا ہوا بارہ سنگھا لٹکائے ہزاروں سال پہلے غار کا رہنے والا جس طرح گھر کو بھاگتا تھا۔آج بھی اپنی اپنی جان کو کندھوں پر مشکیزے کی طرح لٹکائے سب شہری لوگ پناہ کی طرف بھاگتے ہیں

سب شام سے بدکتے ہیں

اندھیرے سے ڈرتے ہیں

ان ہونی ان دیکھی ان کہی سے سب کے ہونٹ سوکھتے ہیں

شام کو بسوں کا رنگ، تانگوں کی رفتار، کاروں کا مڑنا، دوکانوں کے شوکیس، سائیکلوں کی گھنٹیاں، رکشے کے گئیر سب۔۔۔۔سارا شہر خطرے کی گھنٹیاں بجانے لگتا ہے بے جان عمارتیں اپنی کھڑکیاں دروازے کھولنے بند کرنے کے عمل میں مصروف ہو جاتی ہیں خوفزدہ لوگ گھروں سے کافی ہاؤس، کلب، سینما، ہوٹل میں پناہ لیتے ہیں۔۔۔کسی آشنا کا چہرہ، کسی محبوب کا لمس، کسی دوست کی نم آشنا آنکھیں، کسی بچے کی کھلی باہیں، کسی عورت کے ڈھیلے قدموں کی چاپ، بریک لگنے والی آواز کسی سٹینڈ پر سائیکل کھڑی کرنے کا شور۔۔۔۔بلانے بٹھانے قریب ہونے کی گھڑی یہ سب کچھ اور اس سے سوا اور بہت کچھ۔۔۔۔

یہ سب شام کو جاننے کا عمل ہے۔۔۔۔کیونکہ شام رات سے زیادہ غمگین ہوتی ہے، جب اتنا اندھیرا نہیں ہوتا کہ سب کچھ چھپ جائے۔ایسے نظر نہیں آتا جیسے دن کو سب کچھ دکھائی دیتا ہے سارے منظر یوں لگتے ہیں جیسے بارش کھڑکی پر پڑ رہی ہو، اور آپ دوسری منزل کی کھڑکی سے دیکھیں کہ آپ کا رقیب نہیں ہے۔کبھی آپ کو گمان گزرے کہ یہ آپ کی محبوبہ نہیں ہو سکتی۔۔۔۔شام خوف اور گمان سے بھری

چلی آتی ہے۔

رات آنے سے پہلے لحاف کی کوکھ میں چھپنے سے بہت پہلے اور نیند کے گھٹنے پر سر رکھنے سے بہت پہلے سب ذی روح سورج سے بچھڑنے کا سوگ کرتے ہیں نظام شمسی کا تعلق سورج سے بہت پرانا ہے وہ دورہ کر ایسے گرم کرتا رہتا ہے کہ موسموں کے آنے جانے کی چھاپ دل پر نہیں رہتی۔ سورج غروب سے پہلے زمین کا روشن حصہ ہر روز شعلہ رو ہو کر سلگتا ہے پھر اس کے کناروں کو آگ لگ جاتی ہے جیسے ستی ہونے والی عورت کے پلو آگ پکڑلیں کچھ سورج گنوانے کا غم کچھ آفتاب کا کسی اور خطے میں طلوع ہونے کا حسد روشن زمین کے حصے کو کانسی جیسا روپ عطا کرتا ہے۔ جب بچھڑنا رفتہ رفتہ یقینی ہو جاتا ہے تو شام بیراگنوں جیسا لباس پہن لیتی ہے جیسے بجھی ہوئی راکھ ہو۔ روشنی رہتی ہے لیکن نور نہیں رہتا اندھیرے میں سیاہی پوری طرح حلول نہیں کر پاتی۔ بھکیاں بن کر سب طرف بکھر جاتی ہے۔

یہ وقت شام کے سے ہر شخص کے لیے بڑا اداس ہوتا ہے۔

لوگ دفتروں کو چھوڑ کر سڑکوں پر نکل آتے ہیں عورتیں گھر چھوڑ کر دہلیز پھاٹکوں اور دروازوں پر جا رکتی ہیں بوڑھے سیر کا بہانہ بنا کر چار دیواری سے باہر بھاگتے جاتے ہیں بچے پارکوں کو پلے گراؤنڈ سے بھاگ کر ماؤں کی طرف سرپٹ آتے ہیں سب وہاں نہیں رہنا چاہتے۔ جہاں وہ پہلے موجود ہوتے ہیں۔

موسموں کے تغیر سے کہیں زیادہ رات کی آمد انسان کو خوفزدہ کرتی ہے۔ انسان کی سائیکی سے نباتات کی روئیدگی سے جانداروں کی نشوونما سے جمادات کی پوشیدہ حاقت وپختگی کے ساتھ، ہواؤں سمندروں چاند ستاروں سے سورج کا رشتہ بہت پرانا ہے اگر کبھی کوئی شخص کھلی جگہ میں ہو، دریا کا کنارہ، پہاڑ کا دامن کھیتوں کی پگڈنڈی، کھلے کھلیان میں اگر وہ سورج سے بچھڑتے تو اس کی سائیکی کا یہ گونگا پن اجتماعی سائیکی کے گونگے پن چھا جاتا ہے اس طرح فرد فرد کی سائیکی کا یہ گونگا پن

اجتماعی سانحی کے گونگے پن کو جنم دیتا ہے ایسی جگہوں میں جہاں لوگوں کا ہجوم ہو، جیسے سینما گھر، ہسپتال، ہوٹل ان میں بھی شام کے وقت عجیب قسم کی خاموشی ٹھہر ٹھہر کر وارد ہوتی ہے بولتے ہوئے چہرے اجتماعی گونگے پن سے نجات حاصل کرنے کے لیے بولتے چلے جاتے ہیں اور خاموش لوگ اور اندر دھنستے جاتے ہیں اور اندر۔۔۔۔۔ اور اندر محفلوں میں تنہائیوں کی نسبت بڑھنے لگتی ہے۔۔۔۔ جلوت خلوت کا روپ دھارتی ہے اور لوگ الگ الگ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا یہ احساس کہ وہ مجلس میں رہ کر کس قدر تنہا ہیں بڑھتا جاتا ہے۔

مجھے شام اس پل پر ملی جو چھاؤنی کو شہر سے ملاتی ہے۔ اس پل کے عقب میں سٹیڈیم تھا اور سامنے دو رویہ سڑک تھی۔ لاہور شہر تھا پل کے نیچے ایک ڈیزل انجن شنٹ کرنے کی حالت میں آ جا رہا تھا کچھ آفتاب سے ملنے کا اثر تھا کچھ پل پر اچانک شام سے ملاقات ہو گئی پھر پل کے نیچے شنٹ کرتے ہوئے انجن نے احساس دلایا کہ میں بھی ساری باتوں نے ایک لخت مجھے اداس کر دیا۔

ان دنوں میری عادت تھی کہ جب بھی میں خود ترسی کا شکار ہوتا تو ہمیشہ لارنس باغ چلا جاتا۔

پتہ نہیں لارنس باغ کا نام بدل کر کیوں جناح باغ کر دیا گیا؟ کچھ شہروالوں کی صلاح سے ملکہ وکٹوریہ کا بت اٹھوا لیا جا چکا ہے یار دوستوں نے سڑکوں کے نام اسلامی دینے ہیں پرانے شہروں کو نئے ناموں سے نواز دیا تا کہ پچھلی تاریخ کا نشان نہ رہے نئی نسل پرانے مظالم کے نشانات نہ دیکھ سکے۔ پھر ان کے دل میں وہ نفرت نہ جاگ سکے جو ایسے سمبل دیکھ کر عموماً جوان سال لوگوں میں جاگتی ہے اس طرح بچے اپنی تاریخ سے بھی کٹے رہیں اور روایت کا حصہ بھی نہ بن سکیں۔

میں منٹگمری ہال کی طرف سے باغ میں داخل ہوا چھوٹے سے ٹی سال کے پاس میں نے اپنی موٹر سائیکل پارک کی ایک ڈبیا سگریٹ خریدی پلٹ کر ان چیڑھ کے

درختوں پر نظر ڈالی جو پہاڑوں کو چھوڑ کر شرمندہ شرمندہ میدانوں میں آباد ہو گئے تھے۔ لیکن جن کے دل میں ابھی تک پہاڑوں کو دیکھنے کی آرزو اتنی شدید تھی کہ وہ آسمان کی طرف بہت اوپر نکل گئے تھے۔

باغوں سے محبت کرنے والے لوگ بنچوں پر سڑکوں پر گھاس کے ٹکڑوں پر موجود تھے کہیں دور ریستوران کے سپیکر سے گانے کی آواز آرہی تھی کھلی ڈنوں میں اب کا دو کا کوے موجود تھے اگر میں گھنٹہ بھر پہلے یہاں پہنچتا تو کووں کی ٹولیاں ہزاروں کی تعداد میں ڈنوں کے گھڑے پانیوں میں نہاتی نظر آتیں۔

میں بار بار آفتاب سے ملاقات کی جگالی ذہن میں کر رہا تھا۔

سیمی کہاں تھی؟ کیا اسے معلوم تھا کہ آفتاب ملک چھوڑ کر جا چکا ہے۔ وہ پنڈی میں کس کے پاس رہتی تھی۔۔۔۔ کیا کرتی تھی سیمی جیسی لڑکیاں کس قدر بے وقوف ہوتی ہیں جو پچھتاتی نہیں۔ عشق لاحاصل کی قلابازی کھا کر۔

ملک التجار کا بچہ!

وہ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے؟

کیا لوگوں کے دل اس لیے ہوتے ہیں کہ اپنے دل بہلانے کے لیے استعمال کیے جائیں۔

کہیں دور باغ میں ایک کوئل بار بار بلک رہی تھی۔

میں آہستہ آہستہ بابا برکت مراد کے مزار کو جانے والی سڑک پر جا رہا تھا۔ پھر میں نے سیمی کو دیکھا۔ کافی فاصلے سے۔۔۔۔ وہ کافور کے درخت تلے زانوؤں پر سر دھرے چپ چاپ بیٹھی تھی۔ کافور کا درخت۔۔۔۔ سیمی۔۔۔۔ اور شام مجھے میرے خوابوں کا حصہ لگے۔۔۔۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب گیا اور دست بستہ اس کے پاس بیٹھ گیا۔

اس نے آنکھیں نہ کھولیں۔ صرف آنسو اس کی گالوں پر بہنے لگے۔ وہ چغتائی کی

تصویروں میں بنی ہوئی غزال رولڑکیوں کی طرح اس وقت عشق بلب تھی۔ اس کی روح کا ہر سوئی کیول زخمی تھا اور وہ عشق کے پانیوں میں یوں اتر اہی تھی جیسے شہر سیلاب کے پانیوں میں غرقاب ہوتے ہیں۔

"تم پنڈی سے کب آئیں سیمی۔"

سیمی نے جواب نہ دیا۔

"تم۔۔۔۔تم آفتاب کو الوداع کہنے آئی تھیں کہ۔۔۔۔"

وہ پہلے سے زیادہ خاموش ہوگئی یعنی جو آنسو بہہ رہے تھے وہ بھی خشک ہو گئے غالباً یہ وقت راجہ گدھ کا وقت تھا۔ شاید میں نے اس مرتی ہوئی سیمی کو چھاؤنی والے پل پر سے دیکھ لیا تھا۔ شاید اس متعفن لاش کی خوشبو میرے نتھنوں میں ایئر پورٹ پر پہنچی تھی وہ اس قدر دبلی ہو چکی تھی کہ اس کی ناک کا تختہ اب چہرے کو دو حصوں میں تقسیم کرتا نظر آتا تھا۔ ماتھے کی ہڈی ابھر واں ہوکر آنکھوں پر چھجے کی صورت باہر نکل آئی تھی۔ لپ سٹک سے آشنا ہونٹ آج پھیکے بے رنگ اور جھڑبیری کے بیروں کی طرح جھریوں سے بھرے ہوئے تھے سارے چہرے کا ہاتھوں کا رنگ یرقان زدہ تھا۔

میں نے اس لاش کو ہاتھ لگایا۔

"تم ہو ناں قیوم۔۔۔۔" اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔

"ہاں۔"

"میں جانتی تھی تم آؤ گے۔۔۔۔۔ مجھے پتہ تھا تم ویسے نہیں ہو۔"

"تمہیں کیسے پتہ سیمی۔۔۔۔" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"بس پتہ ہوتا ہے۔۔۔۔ پتہ چلتا رہتا ہے۔"

"لیکن پھر بھی۔۔۔۔ کیسے؟"

"مجھے پتہ تھا تم پہلے ایئر پورٹ جاؤ گے پھر یہاں آؤ گے۔"

''لیکن کیسے کیونکر؟۔۔۔کیا تم Chairvoyant ہو۔''

''میں نے۔۔۔۔ہی تو تمہیں ائرپورٹ بھیجا تھا قیوم۔۔۔۔جب تم۔۔۔۔ موٹر سائیکل پر واپس آ رہے تھے۔۔۔تو میں نے ہی تو تمہیں آواز دی تھی۔۔۔ بد یا تھا زور سے پوری طاقت سے۔''

''کیا۔۔کیا کہہ رہی ہو؟۔۔۔۔تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں۔۔۔۔۔میں۔۔ ۔۔؟''

''تمہیں شاید معلوم نہ ہو۔۔۔۔کہ آج آفتاب نے جب شیو کی تو اس کی ٹھوڑی پر گہرا کٹ لگ گیا تھا۔۔۔۔۔۔تم نے دیکھا نہیں اس کی ٹھوڑی پر زخم تھا جاتے وقت۔''

میں ہکا بکا رہ گیا۔۔۔جب آفتاب رخصت ہوا تو واقعی اس کی ٹھوڑی پر تازہ زخم کا نشان تھا۔

''تمہیں کیونکر پتہ چلا سیمی۔۔۔۔بولو بتاؤ۔''

سیمی نے کوئی جواب نہ دیا۔ دونوں بازو ڈھیلے چھوڑ دیئے اور کافور کے درخت سے کمر لگا کر بیٹھ گئی۔

میں دم دبائے کتے کی طرح اس کے پاس بیٹھا تھا۔۔۔اس کی آنکھیں بند تھیں پر وہ حیات کی دنیا سے پرے بھی بہت کچھ جانتی تھی۔ میں کھلی آنکھوں پر بس تھا اور یہ بھی نہ جانتا تھا کہ اسے میرے آنے کی خوشی ہوئی ہے کہ غم۔۔۔۔ دراصل مجھے کبھی علم نہ ہو سکا کہ سیمی کے پاس کس وقت جانا چاہیے اور کس وقت اس کے پاس سے اٹھ جانا بہتر ہے۔ کس وقت وہ میری صحبت سے اوب جاتی ہے اور کس وقت اسے میرے پاس رہ کر لطف ملتا ہے۔ دو طرفہ محبت میں گومگوں کی حالت نہیں ہوتی۔ وہاں ہمیشہ لوہے اور مقناطیس کا میل ہوتا ہے۔ خفگی، ناراضگی غم کوئی بھی موڈ کیوں نہ ہو ملاقات احساس خوشی کا باعث بنتی ہے۔ ایسے عاشق بن بلائے مہمان

کی طرح میزبان کے گھر میں داخل ہوتے وقت اندر باہر نہیں ہو رہے ہوتے۔

ڈرتے ڈرتے میں نے اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔

"تمہاری اس خوبی کا کالج میں تو پتہ نہیں تھا کسی کو۔۔۔۔"

"تب مجھ میں یہ خوبی تھی ہی نہیں۔۔۔۔۔ یہ Senstivity مجھ میں اب پیدا ہوئی ہے آفتاب کو کھو کر۔"

"لیکن کیسے کیسے۔۔۔۔ کیسے تمہیں ان باتوں کی اطلاع ہوتی ہے۔"

"محبت کرنے والے دلوں پر کئی بھید کھلتے رہتے ہیں آپی آپ قیوم۔۔۔۔۔ آپی آپ۔۔۔۔۔"

یکدم اس نے آنکھیں کھول دیں۔

اندر دھنسی ہوئی پرکشش آنکھیں۔

"پھر چھوڑ آئے اسے؟۔"

"تم۔۔۔۔ تم کیوں نہیں آئیں"

"آ تو گئی ہوں۔۔۔۔۔ پنڈی سے۔"

"اسے ایئرپورٹ چھوڑنے کیوں نہیں آئیں۔"

وہ کافور کے پتوں کو مٹھی میں لے کر مسلنے لگی۔

"کیا کرتی ایئرپورٹ پر آ کر۔۔۔۔۔ اس کی زنجیر اس کی بیوی کے ہاتھ میں ہوتی۔ میں تو اس کے رشتہ داروں کے سامنے رو بھی نہ سکتی کھل کر۔"

ایک موٹا سا آنسو اس کی گال پر لڑھک آیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ آنکھیں اپنے کوٹے کے تمام آنسو بہا چکی ہیں۔

"بیوی۔۔۔۔ آفتاب کی بیوی۔۔۔۔ کیسا عجیب لگتا ہے کہ۔۔۔۔۔ کہ کوئی اور آفتاب کی بیوی ہو۔۔۔۔۔ زیبا آفتاب۔۔۔۔۔ زیبا آفتاب۔"

وہ زیبا کے لفظ کو یوں دہراتی رہی جیسے نئے کپڑے لے کر کوئی بچہ انہیں ہتھیلیوں

میں پھرا تا ہے۔

میری عقل داڑھ سیکنڈ ایئر میں نکلی تھی ۔۔۔۔ ان دنوں ماموں کے گھر کے یہ یہ ایک بہت بڑا مسئلہ تھا ۔۔۔۔ پچھلے مسوڑھے سوج کر چھوٹی چھوٹی گلابی پلاسٹک کی گلٹیاں بن گئے تھے ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ چیرہ دیے بغیر عقل ڈاڑھ کا نکلنا ناممکن ہے۔ میں راتوں کو لیٹے لیٹے ان سوجے ہوئے مسوڑھوں پر زبان پھیرتا گلٹیوں میں دور رہوتی اس دور ہلکی سی لذت ہوتی ۔ پھر یہ خوف مسلط ہو جاتا کہ جب ڈاکٹر چیرہ دے گا تو کیسی دور ہو گی ۔ بار بار آفتاب کی بیوی کا نام لے کر ویسی بھی یہی ہی خوفزدہ لذت سے آشنا ہو رہی تھی۔

"وہ لندن میں اس کے ساتھ رہے گا کسی Apartment میں ۔۔۔۔ ہیں ناں قیوم۔"

میں چپ رہا۔

"اس کے گھر کی کھڑکی کے آگے تین جرنیم کے گملے ہوں گے ۔ دروازے کی کال بل ڈھیلی ہو گی ۔ جب کبھی آفتاب کال بل پر انگلی رکھے گا۔ زیبا اندر سے جا کر اس کے لیے دروازہ کھولے گی ۔ لندن میں ٹھنڈ شروع ہو گئی ہو گی ۔ زیبا آفتاب کا ٹھنڈا ہاتھ اپنے گرم ہاتھوں میں پکڑ لے گی۔"

"جو اذیت تم نے دیکھی نہیں سہی ۔۔۔۔ اس تخیل کی مدد سے کیوں اس قدر جوت لیوا کر رہی ہو۔"

اس نے میری بات کا نوٹس نہ لیا وہ کافور کے پتے مسلتی ہوئی بولے جا رہی تھی ۔۔

"سردیوں میں ۔۔۔۔ لمبی راتوں میں ایک ہی تکیے پر سر دھرے وہ آدھی آدھی رت تک باتیں کریں گے ۔۔۔۔ اور آفتاب اسے میرے متعلق ایسے سب کچھ بتائے گا جیسے ۔۔۔۔ میں حقیقت نہیں تھی ایک وہم تھی ۔۔۔۔ ایک

Infatuation"

"شاید اپنی بیوی کے ساتھ ایک ہی تکیے پر سر رکھ کر بھی سوتے ہوں۔"

"لیکن کوئی بھی اس سے آدھی رات تک باتیں نہ کرتا ہو"

"سب اسی طرح سوتے ہیں سب اسی طرح باتیں کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔تم چپ رہو تمہاری کوئی شادی ہوئی ہے۔"

میں نے پورے دو سال اس لڑکی سے یک طرفہ محبت کی تھی۔۔۔۔۔ایسی یک طرفہ محبت جس میں اتنی امید بھی نہ تھی کہ میری محبت کو قبول ہی کر لیا جائے گا۔ آفتاب درمیان سے نکل گیا تھا۔ ہوسکتا ہے یہ کافور کے درخت کا اثر تھا یا شاید جان بلب سیمی کے جسم کی خوشبو تھی ہوسکتا ہے کہ سارے باغ میں گرمی میں جھلسا ہوا اندھیرا چھا گیا تھا۔ پتہ نہیں کیا چیز تھی جس نے بغیر امید کے میرے حوصلے بلند کر دیے تھے، اس وقت میری جسمانی جذباتی اور قلبی اشتہابت بڑھ گئی تھی۔ میں کبھی ہنستے چہروں سے پیار نہ کر سکا۔ شاید بہتے آنسو دیکھ کر میری روح میں کسی خاص قسم کا عمل جاری ہو جاتا ہے۔

میں نے اس سارے عشق کے اظہار کا ارادہ کر لیا جو ایک عرصے سے میرے دل میں دفن تھا۔ مجھے علم تھا کہ اس اظہار سے مجھے کچھ حاصل نہ ہوگا۔۔۔۔۔۔نہ ہمدردی، نہ محبت۔ وہ کسی اور نیوکلس کے گرد کسی اور محور پر گھوم رہی تھی۔۔۔۔۔میں جانتا تھا کہ جب تک میں اس کی خاطر اپنی ذات کو مٹاتا رہوں گا وہ میرے وجود کو برداشت کرتی رہے گی۔ لیکن جہاں سے میری ذات کے تقاضے شروع ہوں گے وہ دریا کنارے کھڑی سیاہ چشمہ لگائے ڈوبنے والی کشتی کا منظر دیکھ کر ہاؤ سویٹ کہے گی اور پیٹھ موڑ لے گی۔ میں اس کا کریڈٹ کارڈ تھا جسے دکھا کر بھنوا کر وہ ہمیشہ آفتاب حاصل کرتی تھی میں ہنر ماسٹرز ونس تھا جو نہی اس کی سوئی مجھ پر پڑتی میں آفتاب پکارنے لگتا اس سے پرے کچھ نہ تھا۔

اتنا سب کچھ جاننے کے باوجود میں اس کے سامنے بالکل مجبور تھا۔

میں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر پوچھا۔۔۔۔۔ "کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں کہ۔۔۔۔۔ کہ کبھی آفتاب کو تم سے محبت تھی؟"

وہ ہنس دی۔۔۔۔ اس کا چہرہ اس قدر قریب تھا کہ باسی چیونگ گم کی خوشبو کے بھبکے میری طرف آنے لگے۔

"محبت پانے والا کبھی اس بات پر تو مطمئن نہیں ہو جاتا کہ اسے ایک دن کے لیے مکمل طور پر ایک شخص کی محبت حاصل ہوئی تھی۔ محبت تو تقویم ہر دن کے ساتھ عادہ چاہتی ہے۔ جب تک روز اس تصویر میں رنگ نہ بھرو تصویر فیڈ کرنے لگتی ہے جیسے۔۔۔۔ جیسے روز سورج نہ چڑھے تو دن نہیں ہوتا۔ اسی طرح جس روز محبت آفتاب طلوع نہ ہو رات رہتی ہے۔۔۔۔ تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکتے۔۔۔۔۔ مجھے غم نے فلسفی بنا دیا ہے۔۔۔۔ تمہیں کیا پتہ زمین کا ہر قطعہ سورج کیوں مانگتا ہے۔ جس شخص سے محبت ہو ہمیشہ اسی کے پاس رہنے کو کیوں جی چاہتا ہے۔۔۔۔" وہ خدا جانے کب اور کیسے تنی اردو سیکھ گئی تھی۔

"اب۔۔۔۔ اب وقت ہے۔۔۔۔ اتر رابعہ گدھا اب وقت ہے۔۔۔۔" میں نے جی کی بات سن کر اندر ہی اندر کہا۔

"کچھ لوگوں کو ایک دن کے لیے بھی اپنا من چاہا۔۔۔۔ آفتاب نہیں ملتا۔ ایسی اندھیروں کے متعلق کیا ارشاد ہے جو ہمیشہ روشنیوں سے ہٹ کر رہتے ہیں" میں نے پوچھا۔

اس نے مجھ پر نظر ڈالی اور پھر لاتعلق ہو گئی۔۔۔۔ اسے میرے اندھیروں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میرے اظہار عشق سے اس کا وقت ضائع ہوتا تھا۔ دراصل وہ کوئی ایسی بات سن ہی نہیں سکتی تھی۔ جس کا اس کی اپنی ذات کے ساتھ تعلق نہ ہو۔ اس کے اندر کہیں ایسا کٹ آؤٹ لگا تھا جو اپنا ذکر بند ہوتے ہی فوراً ساری بجلی کا کرنٹ

بند کر دیتا۔۔۔۔۔

''اسے مجھ سے بڑی محبت تھی قیوم۔۔۔۔اب تو۔۔۔۔میں کوئی ثبوت بھی نہیں دے سکتی۔۔۔۔لیکن فقط ائیر میں وہ مجھ سے بڑی شدید محبت کرتا تھا۔۔۔۔کبھی کبھی مجھے لگتا میرے بغیر وہ مر جائے گا۔۔۔۔یا شاید۔۔۔۔یا شاید یہ بھی میرا وہم تھا۔''

''ان باتوں سے حاصل کیا؟ اس توڑ پھوڑ سے کیا بنے گا۔''

''مجھے اب اس سے کچھ نہیں بنانا قیوم۔''

''تم اسے خط لکھنا چاہو گی۔''

''نہیں۔''

''کیوں؟''

''کیا ملے گا خط لکھ کر؟ میرے خط تو شاخوں پر ہی سوکھ گئے نہ میں نے انہیں گلدان میں سجایا نہ کسی نے انہیں گلے کا ہار کیا۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس طرح کسمسائی جیسے غلطی سے ٹھنڈے پانی کا شاور سردیوں میں اپنے اوپر کھل جائے۔

''سنو یسی تم ماڈرن لڑکی ہو۔۔۔۔تمہارے کٹے ہوئے بال ہیں۔ لباس چال ڈھال سب ماڈرن ہے۔ تم نے آفتاب کی نقل میں اپنے آپ کو مشرقی کر لیا۔ اردو سیکھ لی یہ اور بات ہے۔۔۔۔لیکن اندر سے تم Liberated لڑکی ہو۔ خدا قسم اگر لڑکی قتل کرتی تو اچھی لگتی ہے قتل ہوتی کچھ اوپری سی لگتی ہے۔''

''پھر میں کیا کروں کیا کروں قیوم۔۔۔۔اس نے زیبا کو مجھ پر کیوں ترجیح دی۔ کیوں کیوں کیوں؟''

''آج کا ماڈرن مرد اور عورت سمجھوتہ کرتے ہیں ماحول سے اپنی غلطیوں سے اپنی Genetics سے۔''

وہ اب رات کے پہلے اندھیروں میں کھوری تھی۔ صرف اس کی آنکھوں کی دھنسی ہوئی چمک جگنوؤں کی طرح اندھیارا روشن کرنا چاہتی تھی۔

"اس کی خاطر میں نے ایم اے چھوڑا۔۔۔۔ گھر چھوڑا۔۔۔۔ اور وہ مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ میرا دل مانے بھی۔۔۔۔ دل مانتا تو مر جانے کو جی چاہتا ہے۔۔۔۔ آفتاب چلا گیا اب کچھ ہو تھوڑا جا سکتا ہے۔"

میں اس کو سمجھانے کے انداز میں بولا۔۔۔۔ "سنو بیبی ان باتوں سے کچھ نفع نقصان نہیں ہوتا کبھی۔۔۔۔ یہ باتیں ہر جگہ ہر سے ہر رت میں یہاں وہاں ہوتی رہتی ہیں تمہیں کبھی اس اعتقاد سے نہیں ہٹنا چاہیے کہ جیسی محبت اس نے تم سے کی پھر کبھی کسی سے نہ کر سکے گا۔"

"تمہیں کیسے پتہ چلا؟۔۔۔۔ کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟"

"وہ۔۔۔۔ بڑا شرمیلا اور محتاط تھا بیبی۔۔۔۔ میں نے کسی لڑکی سے اسے بات کرتے کبھی نہیں دیکھا تمہاری جانب وہ خود بخود کھنچا جاتا تھا۔ اس کی روح۔۔۔۔ اس کی سائیکی اس کا جسم سب تمہارے تابع تھے۔۔۔۔ اسے نہ بدنامی کا ڈر تھا۔۔۔۔ نہ بربادی کا۔۔۔۔ بس وہ کھنچا رہتا تھا خود بخود۔۔۔۔ خود بخود۔۔۔۔"

"مائی فٹ او تم چھوڑو قیوم۔۔۔۔ اچھا خود بخود تھا اسی لیے اتنی آسانی سے چلا گیا۔"

اسی بیبی کو میں کیا بتاتا کہ میں اس سے پورے دو سال عشق کرتا رہا ہوں۔ شاعروں کا سا عشق۔۔۔۔ مجذوبوں کی سی لگن کے ساتھ۔۔۔۔ میں اس لڑکی کو کیا بتاتا کہ کچھ لوگ پہاڑوں کی اس جانب ہوتے ہیں جہاں سورج کبھی نہیں چمکتا۔۔۔۔ جو سورج کی حدت کو ہواؤں سے اخذ کرتے ہیں کچھ لوگ اپنے جسم پر خوشبو نہیں لگاتے۔ دوسروں کے لباس میں لگی خوشبو کو سانسوں سے اپنے اندر پہنچاتے ہیں۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔۔۔۔ بیبی۔۔۔۔ کیا یہ تمہارے لیے کافی ہو سکتی ہے؟"

میں نے لجاجت سے کہا۔

''آئی ایم سوری لیکن میں تمہاری محبت کو کیا کروں قیوم ۔۔۔۔ اس کا تو نکاح ہو گیا ۔۔۔۔ پورا اور اصل ۔۔۔۔ پکے کاغذوں والا۔''

کسی نو بیاہتا بیوی کی طرح وہ میرے کندھے سے لگ کر ہولے ہولے کراہنے لگی۔

میں نے اس کے سر کو بوسہ دیا ۔۔۔۔ یہ بوسہ میری روح کا تحفہ تھا۔

پھر میں نے اس کے ماتھے کو چوما ۔۔۔۔ اس التفات میں میرے دل کا زور نہ تھا آہستہ سے میں نے اس کی گال پر اپنے ہونٹ ثبت کیے۔ میری ذات دست بستہ جھکی لیکن جس طرح وہ میرے الفاظ سے بے نیاز رہی اسی طرح میرے لمس سے بھی اس میں کوئی حدت پیدا نہ ہوئی۔

''ہائے میں مر جاؤں سید ھا نکاح ۔۔۔۔ دو گواہوں والا ۔۔۔۔ برات والا ۔۔۔۔ ہم میں تو کبھی لڑائی بھی نہیں ہوئی ۔۔۔۔ ہم تو کبھی ایک دوسرے سے ناراض بھی نہیں ہوئے۔ پھر یہ کیسی سزا دی مجھے ۔۔۔۔ کیوں قیوم کیوں؟''

''سنو ہیں نہ شادی کا محبت سے تعلق ہے نہ محبت کا شادی سے ۔۔۔۔ ساختہ کو بے ساختہ سے کیا میل۔''

وہ یکدم سیدھی بیٹھ گئی کبھی کبھی سوشیالوجی کی کلاس میں وہ کسی پروفیسر سے بحثنے لگتی تھی تو اس کے چہرے پر ایسے ہی اتار چڑھاؤ آ جاتے تھے۔

''لیکن شادی کا رفاقت سے تو تعلق ہے ۔۔۔۔ ایک پلنگ ایک چھت ۔۔۔۔ ایک گھر سانجھے بچے ۔۔۔۔ ان چیزوں کو تم پورے طور پر Ignore بھی نہیں کر سکتے قیوم۔''

میں چپ رہا ۔۔۔۔ وہ دیر تک میرا چہرہ دیکھتی رہی لیکن اس دیکھنے میں میری پہچان نہ تھی وہ مجھ سے پرے پروفیسر کی نگاہ سے ایک اہم مسئلے کو ایک تعلیم یافتہ لڑکی

کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس وقت الفاظ تلاش کر رہی تھی جیسے کم بینس والے لوگ چیک لکھتے وقت ذہن میں پتا لگاتے ہیں کہ کتنی رقم کا چیک لکھیں تو پیسے مل جائیں گے۔ وہ بار بار منہ کھولتی اور بند کر لیتی اس کے اندر کا پریشر کھلنے کے لیے بے قرار تھا لیکن نکاس کی کوئی صورت نہ تھی۔

شاید اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں اس کے ماتھے اور گالوں کو چوم چکا تھا۔!

"میں پنڈی واپس جانا نہیں چاہتی۔ حالانکہ وہاں مجھے ایک ٹریول ایجنسی میں نوکری مل گئی ہے۔"

"چلی جاؤ۔"

"نہیں جا سکتی۔"

"پھر۔!"

"یہاں لاہور میں میرے Parents ہیں میں ان کے پاس جا سکتی ہوں۔"

"تو چلو۔۔۔۔۔میں تمہیں چھوڑ آؤں گا۔"

"نہیں جا سکتی۔"

"تو کہاں جاؤ گی اتنی رات گئے۔"

"یہیں رہوں گی۔"

"اتنی گرمی میں ساری رات۔"

"جب تک مجھے سمجھ نہ آجائے قیوم۔۔۔۔۔۔کہ۔۔۔۔۔۔اس نے مجھے کیوں چھوڑا۔ یہ میرا دل نہ مان جائے کہ یہ سب کچھ جھوٹ تھا میں کہاں جا سکتی ہوں بھلا؟ بتاؤ ناں۔۔۔۔۔"

مجھے کچھ سمجھ نہ آتی تھی کہ میں کیا کروں۔ اب گورنمنٹ ہاؤس کے سامنے مال روڈ کے ٹریفک کی آواز بھی کم ہو چکی تھی۔

گرمی تھی حبس تھا۔۔۔۔۔اور سارے میں کافور کی اندھی خوشبو تھی ایک کونونٹ کی

پڑھی لکھی لڑکی کا منہ زور عشق تھا۔

"تم آفتاب کو نہیں جانتیں۔ وہ کسی پریشر تلے کچھ کرنے کا عادی نہ تھا۔۔۔۔ اس نے تمہیں کسی دباؤ تلے نہیں چاہا اور کسی پریشر تلے اس نے شادی نہیں کی ہے۔ اس بات سے تمہیں سمجھوتہ کرنا ہو گا سیمی۔۔۔۔ آفتاب کا جسم ضرور زیبا کا ہے لیکن اس کا دل۔"

وہ اب پھر کلاس میں بیٹھی تھی۔۔۔ اس کا چہرے پر سوال بھی تھے اور جواب بھی۔۔۔۔ جیسے وہ سوشیولوجی کی کوئی دقیق کتاب ساری رات۔۔۔۔۔ پڑھتی رہی ہو۔

"جانے دو قیوم۔۔۔ انسانوں کے حصے بخرے نہیں ہو سکتے۔۔۔۔ آدمی دولت بانٹ سکتا ہے مراعات میں انصاف کر سکتا لیکن اپنے اندر کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے نہیں ڈال سکتا، پتہ نہیں تم میری بات سمجھ بھی رہے ہو کہ نہیں۔۔۔۔ سنو۔۔۔۔ یک مین۔۔۔۔ ٹکڑے ٹکڑے انسان سے کسی کی سیری نہیں ہوتی۔ گر میری اس سے شادی ہو جاتی تو کیا میں برداشت کر لیتی کہ دل میں ہو کسی اور کی پرستش کرتا رہے اور جسمانی طور پر میرا رہے۔ اور جسمانی طور پر میرا رہے۔۔۔۔ کبھی کارڈ آدھے یا پونے پیسے پر بھی چلی ہے؟ آدمی پورا مل جائے تو خلا نہیں بھرتا تم آدھے پونے کی بات کر رہے ہو۔"

میں نے سیمی پر نظر ڈالی۔

میں نے محسوس کیا کہ مجھے کچھ سودا ہے جو میں اس گرمی میں جب کہ زمین اور آسمان دونوں حبس میں لرز رہے ہیں گہری رات کے وقت ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ ایسی لڑکی جس کا محبوب اسے چھوڑ کر لندن چلا گیا اور جو اس کے فراق میں آگے پیچھے دائیں بائیں کچھ نہیں دیکھ سکتی

لیکن ہم تو کرگس کے لوگ ہیں۔ ہم تو ازل سے ان مردوں پر پلے تھے۔ ہم گدھ برادری کے لوگ سیمی کو آدھے پونے کی بات کیا سمجھاتے۔۔۔۔۔ ہم تو گرم خون کے

عادی ہی نہ تھے ہم اسے کیسے سمجھاتے کچھ لوگوں کو صرف جسم کے سہارے زندہ رہنے کا حکم ہوتا ہے

''جب آفتاب نے مجھ سے کہا کہ وہ شادی کر رہا ہے تو۔۔۔۔تو میں نے اس سے پوچھا تھا۔۔۔۔کیوں؟۔۔۔۔کیوں آفتاب؟۔۔۔۔پر اس نے میری کسی بات کا جواب نہیں دیا''

''شاید اس کے پاس ایسا کوئی جواب نہ تھا جو اس کی اپنی تشفی کر سکتا ہو''

''اس روز اس نے آسمانی کے رنگ سے بھی ہلکی چیز کلاتھ کی قمیض پہن رکھی تھی۔ میں نے اسے کالروں سے پکڑا کر اتنی بار پوچھا کہ اس کے کالر کی سلائی نکل گئی قیوم۔۔۔۔''

''کیا پوچھا''

''دل ساتھ نہ ہو تو شادی کا فائدہ آفتاب۔۔۔۔جسم ساتھ نہ دے تو ہمیشہ کے سنجوگ سے حاصل۔۔۔۔میں سے کھینچتی رہی پوچھتی رہی اور وہ کہتا رہا کیا لنگڑے زندہ نہیں رہتے کیا اندھے چلتے پھرتے نہیں۔۔۔۔میں مر رہی تھی اور وہ کمینہ میری بات کا جواب بھی نہ دیتا تھا۔۔۔۔'' یہ کہتے ہوئے وہ دوبارہ مر رہی تھی۔

اس وقت ریسوران سے آنے والی موسیقی کی آواز بند ہو گئی۔ دیر سے جانے والوں کی چاپ بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ کبھی کبھی دور سے کسی سپاہی کی سیٹی اچانک سر سے نکل کر درختوں پر سوئے پرندوں کو جگا دیتی اور تھوڑی دیر کے لیے درختوں پر پھڑ پھڑانے کی ہلچل ہوتی اور پھر سب خاموش ہو جاتا۔

ستمبر کی گرم رات کا پچھلا گرم پہر۔

میں نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔ اس کے دونوں کندھے جھنجھوڑ کر میں نے پوچھا۔۔۔۔''تمہیں محبت چاہیے۔۔۔۔وفا چاہیے۔۔۔۔رفاقت؟''

''ہاں۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔ہاں۔۔۔۔میں بچپن سے بہت

Pampered ہوں قیوم میں محبت کے بغیر زندہ نہ رہ سکوں گی لیکن ---- لیکن اب زندہ رہنے کی ضرورت بھی کیا ہے ----" بار بار متعدی بیماری کی طرح مایوسی اس پر حملہ کر دیتی۔

"میں تمہیں زندہ رکھوں گا۔ جس طرح سات ماہ کے بچے کو ہسپتال کے Incubator میں زندہ رکھتے ہیں۔"

"اچھا قیوم؟ ---- تم مجھے بچا لو گے ---- اس سے بھی سے؟ ---- میں جانتی ہوں تم بھی مجھے مرنے کے لیے چھوڑ دو گے کسی دن۔"

"نہیں نہیں سیمی میں تمہیں اپنی روح کی حدت سے زندہ رکھوں گا ---- خدا قسم میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا Never"

یہ صرف گدھ جاتی کی عقل ہے کہ وہ مرے ہوؤں سے زندگی کا وعدہ کرتے ہیں اس وقت میرے پاس کچھ نہ تھا۔ صرف ہمدردی کا ست رنگا جال ---- آفتاب نے یہ غزال شہر شکار کیا تھا مجھے اس مردہ لاش کو کھانے کا حکم تھا۔ وہ نڈھال کافور کے درخت تلے نیم مردہ پڑی تھی۔ یہ لارنس باغ کا وہ حصہ تھا جہاں شام پڑتے ہی جنات کا پہرہ ہو جاتا ہے کئی صاحب دل لوگوں کو یہ جنات خود مل چکے ہیں۔ کچھ رات کو مشعلیں جلائے درختوں میں غائب ہوتے دیکھا ہے کچھ ان کے گنجے سر، لو گز کے قد دیکھ کر باغ سے سرپٹ بھاگے ہیں اس وقت ان ہی جنات کے خوف ---- سے

کوئی ہی چوکیدار سپاہی ادھر نہیں آتا۔

سارے میں جگنو منقش لگے دوپٹے کی طرح چمک رہے تھے اور سیمی کافور کے تنوں پر ہلکے ہلکے پسینے میں ٹھنڈی بوتل کی طرح ہولے ہولے بھاپ چھوڑ رہی تھی۔

یہاں سیمی سے میرا ایک نیا تعلق پیدا ہوا۔ جسمانی رفاقت کا بانجھ سفر سیمی کو اپنی پروا نہ تھی وہ آفتاب کے بعد کس کی تھی کیوں تھی؟ اس بات کی اسے خبر نہ تھی۔ دراصل

مغربی تعلیم نے اس کے اندر ایک خاص قسم کی منفرد وفا پیدا کر دی تھی جس کا تعلق صرف روح سے تھا اسے جسمانی تعلقات کی رتی برابر بھی پروانہ تھی کا فور کے درخت تلے سیمی سے میں ہمیشہ کے لیے منسلک ہو گیا جیسے اسی کے جسم کا حصہ تھا اور وہ اپنے آپ کو میری تحویل میں دینے کے باوجود بالکل الگ تھلگ رہی۔۔۔۔ جیسے بنک کا ٹوکن۔۔۔ آپ کی مٹھی میں ضرور ہوتا ہے لیکن آپ کی ملکیت نہیں ہوتا۔

جب آفتاب کو اس کے جسم کی ضرورت نہ تھی تو اس کا جسم کوڑے کا ڈھیر تھا۔ اب سے فکر نہ تھی کہ اس کوڑے کے ڈھیر پر کون اپنی غلاظت پھینکتا ہے اپنا جسم میرے سپرد کرنے سے کچھ لمحے پہلے وہ ملامتیہ فرقے میں شامل ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے شہر یار سے بے دریغ ہو گئی سیمی میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ میرا مقابلہ کر سکتی وہ مرنے سے بہت پہلے مرنے کا راز پا گئی تھی اپنے منہ سے ایک لفظ نہ کہا کھلی آنکھوں سے مجھے ایسے دیکھتی رہی جیسے میں موجود نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ اگر آنکھوں کے راستے دل میں داخل ہونے کا راستہ نہ ہو تو دل تک جانے کے اور بھی کئی راستے ہو سکتے ہیں۔ اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ دل صرف ایک راہ جاتی ہے اور وہ جسم کا راستہ نہیں ہے جسم کے جنکشن پر انجن رک سکتا ہے۔ کوئلہ پانی درست کر سکتا ہے لیکن ہمیشہ جنکشن پر کھڑا نہیں رہ سکتا۔ جسموں کے اتصال سے ایک نیا جسم ایک نئی روح جنم لے سکتی ہے لیکن ایک روح دوسری روح سے نہیں مل سکتی۔ بشرطیکہ ان کی روحیں پہلے ہی یک رنگی اختیار نہ کر چکی ہوں ویسی صورت میں یہ ملاپ بندوق کی لبلبی کا کام دیتا ہے تڑاہ تڑاہ کی آواز بھی نکلتی ہے فائر بھی چلتا ہے اور دو شکار ایک وقت میں مرتے ہیں روحوں کا اتصال پہلے نہ ہو چکا ہو تو جسمانی تعلق احساس گناہ بھی ہے۔۔۔ اور ہمہ شکستگی بھی۔

جب میں نے اس کا کف دوبارہ بند کیا تو وہ آنکھیں بند کیے چپ لیٹی تھی وہ نہ میرے ساتھ تھی نہ میرے مخالف۔ وہ کسی ایسے شرابی کی بیوی تھی جو ہزار مجبوریوں

کے باعث مدافعت کے قابل نہیں رہتی۔

یہ بھی عجیب رابطہ تھا۔مردار کو گدھ ہڈیوں تک شفاف کر چکا تھا لیکن وہ اپنی بے عزتی کا نظارہ کرنے کے لیے موجود ہی نہ تھی وہ تو اس وقت کہیں اور کسی اور کے ساتھ تھی یہ بھی اپنی نوعیت کا رابطہ تھا ادھر سے کوئی مدافعت نہ تھی سومنات کا مندر رکھا پڑا تھا۔صرف ارد گرد ایک بھی پجاری نہ تھا کسی قسم کی کوئی روح کوسوں میل تک موجود نہ تھی۔

جس وقت ہم دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ہم مکمل طور پر کھل کھلے تھے۔ میں جانتا تھا کہ سیمی کبھی میری نہ ہو سکے گی۔وہ غالباً سمجھتی تھی کہ اپنے ساتھ میری لعنت لگا کر اس نے آفتاب سے بدلہ لے لیا ہے شاید وہ اپنے آپ کو ذلیل کر کے ہی اپنی ذات کو کچھ دیر کے لیے بچا سکتی تھی۔

رات کے پچھلے پہر کا چاند چیڑ ھ کے درختوں میں قرمس بن منگا ہوا تھا

''چلیں؟----''سیمی نے بالآخر پوچھا۔

''کہاں----؟''

''ڈرو نہیں میں وائی ڈبلیو سی اے جاؤں گی۔''

''میں نہیں ڈرتا کسی چیز سے۔''

''اگر میں تمہارے گھر جانا چاہوں تو-----''

''تو چلو ناں-----''میں نے اس کا بازو گھسیٹ کر کہا۔

''نہیں قیوم میرا کوئی گھر نہیں ہے مجھے وائی ڈبلیو سی اے تک پہنچا دو۔وہاں میری ایک سہیلی رہتی ہے۔''

''اتنی رات گئے۔''

''وہ جانتی ہے میں پاگل ہوں Assignment لکھتے وقت تو مجھے معلوم نہیں تھا لیکن آج پروفیسر سہیل کو بتا سکتی ہوں دیوانے پن کی اصلی وجہ۔''

جس وقت ہم ٹک شاپ کے پچھواڑے پہنچے تو کسی نے میرے بازو کو ہاتھ سے پکڑ لیا۔

"قیوم۔"

"ہاں۔"

"موٹر سائیکل مت چلانا باغ میں۔ مال پر جا کر سٹارٹ کرنا۔"

"کیوں۔"

"اس وقت ہمیں کسی سپاہی نے دیکھ لیا تو تھانے لے جائے گا۔ مجھے اپنی تو فکر نہیں ہے کوئی مجھے تھانے لے جائے کہ جہنم لے جائے لیکن تمہارا رزلٹ نکلنے والا ہے۔ پھر تمہیں ڈگری چاہیے ہوگی۔"

"مجھے پروا نہیں۔"

"ہونی چاہیے ناں پروا۔ سپاہی نازیبا حرکتیں کرنے والوں کو تھانے لے جاتے ہیں گندے بچے۔ نقص امن ہے یہ بھی۔"

"وہ ہلکا سا مسکرائی۔ پہلی بار۔"

میں نے محسوس کیا یہ مسکراہٹ دکھ میں ڈوبی ہوئی تھی میری محبت نے میری جسمانی وارفتگی نے اس کے وجود کو ذرا سا بھی ڈرائی کلین نہیں کیا تھا۔

وائی ڈبلیو سی اے سے میں باہر نکلا تو شہر پوری طرح سویا ہوا تھا۔۔۔ سینٹ انتھونی کے گرجے کی سیاہی مائل عمارت کے پیچھے چاند میری موٹر سائیکل کی رفتار کے ساتھ ساتھ سفید روسی کتے کی طرح بھاگتا چلا رہا تھا۔

دن کے وقت مال کی شکل کچھ اور ہوتی ہے لیکن اس وقت عمارتیں بہت گرانڈیل سڑکیں کشادہ اور بتیاں بہت زیادہ روشن تھیں اکا دکا کاریں آ جا رہی تھیں۔ پرانی کے رنگ اور رفتار کچھ اجنبی سے نظر پڑتے رہے۔۔۔ پوسٹ آفس کی گلابی عمارت

سے لیکر کرشن نگر کے آخری بس سٹاپ تک سارا دن تقریباً بائل تک رہتا ہے لیکن رات گئے یہاں صرف بتیاں پلکیں کھولے کھڑی تھیں اور کسی کسی راہ گیر کو حیرانی سے تک رہی تھیں جس وقت میں کرشن نگر سے نکل کر بوچڑ خانے کے پہلو میں بائیں ہاتھ کو مڑا تو مجھے دودھ کو بوٹے لادے ہوئے ایک گوجر کے ریڑھے نے کراس کیا۔ ابھی صبح کاذب بھی نہیں ہوئی تھی لیکن میں نے اندازہ لگایا کہ شہر کے بیدار ہونے میں اب تھوڑی ہی دیر ہے۔

ساری رات سمی کے ساتھ کافور کے درخت تلے گزارنے کے بعد مجھے پنڈ کمرہ، پرانی زندگی، رات سب کچھ غیر مرئی لگ رہا تھا جب آدمی کافی دیر تک جاگتا رہے اور نیند کو غالب نہ ہونے دے تو اس کے اعضا سست پڑ کر یا تو بہت ہلکے ہو جاتے ہیں اور یا بہت بھاری محسوس ہونے لگتے ہیں اس کے سر سے کچھ بوجھ سا اتر جاتا ہے۔۔۔ حقیقتوں کا بوجھ اور وہ جاگتے میں خواب تو نہیں دیکھتا لیکن اس کی نقل و حرکت کچھ Slow motion جیسی ہو جاتی ہے۔

مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں شہ نشین پر بیٹھا بیٹھا اونگھ گیا ہوں لیکن آنکھ کھلی تو سامنے مختار بھائی کھڑے تھے ان کے سر پر پورا سورج چمک رہا تھا اور وہ تعجب سے مجھے دیکھ رہے تھے۔

"یہ ساری رات یہاں ہی بیٹھے رہے ہو؟۔۔۔۔" انہوں نے اپنی عینک کے ڈبل شیشے صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں میں تو بہت صبح یہاں آ کر بیٹھا تھا۔"

"موٹر سائیکل کہاں ہے۔"

"نیچے گلی میں۔"

میں عموماً جب کبھی ان کی موٹر سائیکل مستعار لیتا تو اسے آنگن کی اس بغلی گلی میں کھڑا کر دیتا۔۔۔ جس میں میرے کمرے کی اوپر آنے والی سیڑھیاں کھلتی تھیں۔

''اچھا۔۔۔۔تم پاس ہو گئے ہو۔۔۔۔رزلٹ آ گیا ہے۔۔۔اخبار میں۔۔۔۔ہے۔''

سیمی کے عشق میں فیل ہو کر مجھے پاس ہونے کی خبر عجیب سی لگی۔

''نیچے اپنی بھابھی سے اخبار لے لینا۔۔۔۔۔مبارک ہو۔''

بھائی مختر رومال سے منہ پونچھتے ہوئے بیرونی سیڑھیوں سے باہر اتر گئے۔

جب رات میں گھر داخل ہوا تو مجھے پورا یقین تھا کہ اب میں سیمی سے کبھی نہیں ملوں گا۔۔۔اس کے بہت قریب رہ کر مجھے علم ہو گیا تھا کہ اس کے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔۔۔لیکن ہمیشہ کی طرح سارا دن میں رزلٹ کے بجائے اسی کے خیالوں میں الجھتا رہا۔۔۔رہ رہ کر اس کی باتیں، بیٹھنے کا طریقہ اس کے بے طور بہنے والے آنسو، آفتاب سے اس کی بے ساختہ اور وارفتہ محبت میرا محاصرہ کرتی رہی۔

جس وقت دھوپ ڈھلے میں وائی ڈبلیو سی اے کے سامنے پہنچا تو مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں سیمی سے ملنے جا رہا ہوں زیادہ سے زیادہ میرا یہ ارادہ تھا کہ اپنی ایک ہم جماعت کو سوشیالوجی کا رزلٹ سنا دوں گا۔وہ بغیر پھاٹک والے بڑے ستون کے پاس کھڑی تھی میں نے مختار بھائی کا ہونڈا اس کے پاس روک۔۔۔یوں لگتا تھا کہ ساری رات جاگنے کے بعد وہ دن بھر بھی نہیں سوئی۔

''آ گئے۔۔۔۔مجھے معلوم تھا کہ تم آؤ گے۔''

''کیسے؟''

''مریض کو معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر آئے گا۔''

''تم کو اتنا کچھ کیسے معلوم ہوتا ہے سیمی۔''

اس نے آج اپنے ابرو Pluck نہیں کیے تھے اور چھوٹے چھوٹے نئے بال

چیونٹیوں کی شکل میں دکھائی دے رہے تھے۔

''ہوتا ہے معصوم ---- تعلق ہو تو سب کچھ پتہ لگ سکتا ہے --- رزلٹ نکل آیا؟''

''ہاں ---- تم نے اخبار دیکھا۔''

''نہیں ---- لڑکیاں کہہ رہی تھیں کہ رزلٹ نکل آیا ہے سوشیالوجی کا ----

میں خبار دیکھ کر کیا کرتی۔''

''میں پاس ہو گیا ہوں۔''

''اچھا؟ ---- مبارک۔''

صبح بھائی مختار نے دن چڑھے بھابھی صولت نے اور اب سیمی نے ایک سے لہجے میں مبارک دی تھی۔

ان تینوں کا تعلق ایک جیسا تھا۔

''کون سی ڈویژن؟''

''سیکنڈ۔''

''اچھا ہے ---- میں اور آفتاب تو یہ بھی حاصل نہ کر سکے۔''

وہ چپ کھڑی تھی۔

آج پھر اس نے جینز پر سفید وائل کا کرتی پہن رکھا تھا --- بس کی باڈس صاف نظر آ رہی تھی ---- کٹے ہوئے بال اس نے تجاہل کے ساتھ ربر بینڈ سے باندھ رکھے تھے کندھے سے لٹکا ہوا کینوس کا تھیلا اس کے گھٹنوں تک تھا۔ اور وہ اس وقت تھوڑی سی فقیری تھوڑی سی ہپی تھوڑی سی فرانسیسی لڑکی نظر آ رہی تھی۔

''چلیں؟ ----'' میں نے سوال کیا۔

''چلو۔''

''کہاں؟''

''کسی ہوٹل میں۔''

''میری ابھی نوکری نہیں لگی ــــ میں زیادہ پیسے نہیں خرچ سکتا۔''

''میری تنخواہ جو ہے ـــ بل میں ادا کروں گی ــــ'' اس نے کینوس کے تھیلے پر ہاتھ رکھ کر کہا

''پھر کسی روز سہی''

''تو پھر آج کہاں چلیں۔'' اس نے پوچھا۔

''وہیں؟۔''

''وہیں کہاں؟ ــــ'' جیسے وہ رات کو، کافور کے درخت کو اور ہر شے سب کچھ یکسر بھول چکی تھی۔

اب ہمارا معمول ہو گیا کہ ہم دونوں شام گئے جناح باغ چلے جاتے۔ اس خطے میں جہاں جنات کا پہرہ تھا اور روحیں آدھی رات کو لالٹین لے کر پھرتی تھیں۔ یہاں بیٹھ کر ہم آدھی آدھی رات تک پچھلی باتیں کرتے رہے۔ بی بی میرے متعلق کچھ جاننا نہیں چاہتی تھی اس لیے میرے تمام دروازے بند رہتے۔ صرف وہ بولتی رہتی ـــ۔ اپنی محرومی کی تمام باتیں ایک ایک کر کے مجھے بتاتی رہتی۔ اپنے بچپن کے واقعات، آفتاب سے ملاقاتیں، آفتاب کے ساتھ گزرے ہوئے سمے ـــ باتیں وہی تھیں لیکن وہ تاش کے پتے کچھ اس طرح پھینکتی کہ ہر بار ہم دونوں کے ہاتھوں میں نئے پتے آ جاتے ـــ میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا کہ میں ان ہی باتوں کی سیڑھی لگا کر اس تک پہنچوں جب میں اس کے بہت قریب ہو جاتا اور اس کی آستین کو رول کرنے لگتا تو وہ ہمیشہ آنکھیں بند کر لیتی ــــ اس کے بعد وہ آفتاب کی آغوش میں ہوتی۔

جسمانی تعلق کے عین تین سیکنڈ بعد وہ ہمیشہ آفتاب کا نام لے کر اٹھ بیٹھتی یہ نام

میری کنپٹی میں گولی کی طرح لگتا۔

''آفتاب تمہارا دوست تھا؟۔۔۔۔۔'' ایک رات اس نے مجھ سے سوال کیا۔

''بہت۔۔۔۔۔'' میں اپنے خیالوں میں گم ہو گیا۔

میں اس وقت کسی کو بتانا چاہتا تھا کہ مجھ جیسوں کا یہاں۔۔۔۔۔وہاں کوئی دوست نہیں ہے ہماری کوئی محبوبہ نہیں ہوتی۔ ہم صرف لوگوں سے ملتے رہتے ہیں جیسے پاپڑ کھانے والے آفتاب کی محبت میں کیسے مبتلا ہو گئی۔ بھنڈی کے پھولوں جیسے زرد رنگ کی آذری ہیر برن نے خدا جانے بھاری بھرکم شلوار قمیض پہننے والے پنجابی سی اونچی اونچی باتیں کرنے والے آفتاب کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا کیوں اختیار کیا؟

شاید آفتاب کی ساری کشش اس بات میں تھی کہ خدا نے اسے سرکش بنایا تھا نہ سرشار۔۔۔۔۔وہ اونچے شملے والوں میں پیدا ہوا تھا لیکن کمائے ہوئے لوگوں سے اسے کوئی نفرت نہ تھی۔ وہ کنول کے پھول کی طرح پانی اور کیچڑ دونوں سے بنا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ ہر ماحول میں ہر انسان کے ساتھ بڑی جلدی ہم آہنگی اختیار کر لیتا۔

ایک روز وہ اپنا صابن تولیہ اور برش لے کر کمرے سے رخصت ہوا۔ لیکن چند لمحے بعد ہی واپس آ گیا میں اس وقت اٹھنے کی سوچ رہا تھا۔

''یار قیوم۔۔۔۔۔ٹیوب ہو گی۔۔۔۔۔ٹوتھ پیسٹ۔''

میں نے الماری میں رکھی ٹیوب کی طرف اشارہ کیا اس نے ٹیوب سے لمبا سا سفید گل نکالا اور احتیاط سے اپنے برش پر جمالیا۔ کندھے پر تولیہ رکھے اس وقت وہ مجھے خدا جانے کیوں کسی پنجابی فلم کا ہیرو لگ رہا تھا میرا خیال تھا کہ اب وہ اتنی تیزی سے ہی لوٹ جائے گا جتنی جلدی وہ آیا تھا لیکن وہ دہلیز کے ساتھ کندھے جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔۔۔۔۔''کشمیری آدمی پتہ نہیں کیوں صبح سویرے ڈھیلا ہوتا ہے۔

''یار یہ ہماری چوکھٹ کو دیمک لگ گئی ہے ــــــ یہ دیکھو۔''

میں نے پلٹ کر چوکھٹ کی طرف دیکھا

''رپورٹ کرنی چاہیے وارڈن صاحب کو۔''

''ہاں کرنی تو چاہیے''

وہ مسکرایا ــــــ ''لیکن کیا فائدہ؟ بڑے بڑے عالی شان قالین بودے ہو جاتے ہیں یہ تو پھر لکڑی ہے دیمک نہ لگے گی تو ویسے اس کی نیچرل لائف ختم ہو جائے گی''

''آدمی بس احتیاط سے تھوڑی دیر کے لیے اس کے آگے بند ھ باندھ سکتا ہے سارے Biocess کو ختم نہیں کر سکتا''

''اچھا۔''

وہ کھڑا رہا چپ چاپ۔

''میں ہاسٹل چھوڑ رہا ہوں۔''

''کیوں؟''

وہ تھوڑی دیر تک سر کھجلاتا رہا ــــــ پھر بولا ــــــ ''یار میرے خیال تھا کہ میں پڑھ لکھ کر کوئی Job کروں گا۔ ایک بڑا افسر بنوں گا۔ لیکن اب مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ سب کچھ یہ Put on میرے لہو میں نہیں ہے۔ میرے باپ دادا قالین بیچتے آئے ہیں کشمیری چائے پیتے رہے ہیں۔ ــــــ کلچے کھاتے رہے ہیں۔ میں پتلون کوٹ اور ٹائی پہن کر بہت اوپرا لگوں گا۔ اپنے آپ کو نکلی پر لگا ہوں گا گورے صاحب کی طرح ــــــ''

''کیا پڑھائی بھی چھوڑ دینے کا ارادہ ہے۔''

''ہاں کچھ ہی۔''

''کیوں؟''

"بھئی کچھ فرق نہیں پڑتا ہماری ٹریڈ میں۔"

میں چپ ہو گیا۔ اس کے چلے جانے سے تھوڑی سی امید بندھتی تھی۔ میں دل ہی دل میں خوش تھا۔

"عجیب بات ہے کچھ لوگوں کو محبت پائیدار کرنے کا بہت شوق ہوتا ہے خاص کر لڑکیوں کو۔۔۔" اس نے سر کھجلا کر کہا۔

وہ شاید بسی کا نام لینا چاہتا تھا۔

"ایسے لوگوں کو وہم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ جوان رہیں گے۔ ہمیشہ محبت کر سکیں گے۔۔۔ ان لڑکیوں کے دماغ میں اس قدر بھوسہ کیوں بھرا ہوتا ہے۔"

"تو کیا آدمی کسی سے ہمیشہ محبت نہیں کر سکتا۔"

"کر سکتا ہے کر سکتا ہے لیکن ہر آدمی نہیں۔۔۔۔ ہم آج کل کی Generation تو بالکل نہیں۔ ہمیشی کی محبت بڑا مشکل کام ہے۔"

"تھوڑا وقت تو رہ گیا ہے اگر امتحان دے دیتے تو کوئی خاص ہرج بھی نہ تھا۔"

"لندن والی برانچ کا منیجر استعفا دے گیا ہے ابا جی آفر دے رہے ہیں اگر میں سوچتا رہا تو پھر یہ جگہ پر ہو جائے گی۔"

اس وقت میرا خیال تھا کہ وہ بسی کو ساتھ لے جائے گا۔ جس روز کلاس میں یہ افواہ پھیلی کہ آفتاب نے نہ صرف کالج چھوڑ دیا ہے بلکہ وہ اپنی کزن سے شادی بھی کر رہا ہے تو مجھے بڑا تعجب اور سکون ہوا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو قیوم۔"

"کچھ نہیں۔۔۔ کالج کی پرانی باتیں۔"

پھر اس نے میرا ہاتھ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ دبلے پن کی وجہ سے اس کی ہاتھوں پر کتنی ہی نسیں ابھری ہوئی تھیں اور تیسری انگلی میں فیروزے کی انگوٹھی آگے پیچھے ڈھلک رہی تھی۔

''مگر تم بھی نہ ہوتے قیوم۔۔۔ ذرا سوچو تم بھی نہ ہوتے تو اس رات میں اس درخت تلے مر جاتی Joke نہیں خدا قسم مر جاتی۔۔۔ پھر دوسری صبح میرے ممی ڈیڈی میری لاش شناخت کرنے تھانے آتے۔''

''بیبی تم اپنے والدین کے پاس واپس کیوں نہیں چلی جاتیں۔''

''گلبرگ تھری میں۔۔۔ امریکی ہسپتال کی پشت پر۔''

''ہاں وہیں۔''

''جیسے اس وقت میں اٹھنا چاہتی ہوں لیکن اٹھ نہیں سکتی۔۔۔ اس طرح میں وہاں جانا چاہتی ہوں لیکن جا نہیں سکتی۔''

''لیکن کیوں آخر کیوں؟''

وہ زار زار رونے لگی۔ اس کے رونے میں ایک ایسے چشمے کی آواز تھی جو پتھریلی جگہ سے سر پھوڑ کر گزر رہا ہو۔

''آؤ آفتاب کی باتیں کریں'' میں نے اسے دلاسہ دے کر کہا۔

یکدم وہ مکمل دلچسپی بن گئی۔

''وہ تمہارا دوست تھا ناں بتاؤ ناں؟ بتاؤ تمہیں اس سے محبت تھی؟ ضرور ہو گی۔ میں نے سنا ہے ہوسٹل میں لڑکے Homo sexual ہوتے ہیں۔ سچ سچ بتانا۔ کیا تمہارا اس کا جسمانی تعلق تھا۔''

میں دنگ رہ گیا۔۔۔ بھنڈی کے زرد پھولوں جیسی رنگت پر اس وقت ہلکی ہلکی سرخی چھا رہی تھی۔۔۔ میں سوچنے لگا شاید مجھ سے جسمانی تعلقات استوار کرنے کی بھی یہی وجہ تھی ہو کہ اسے اپنے جسم کی پرواہ نہیں بلکہ شاید میرے توسط سے اب بھی وہ آفتاب تک پہنچنا چاہتی ہو۔

میں چپ ہو گیا۔۔۔ وہ بہت خطرناک پانیوں میں بغیر لائف سیونگ بلٹ کے تیر رہی تھی۔

"اچھا نہ سہی ۔۔۔۔ تم مجھے اپنے متعلق کچھ بتانا نہیں چاہتے میں نے تو تم سے کچھ نہیں چھپایا قیوم ۔۔۔۔ اندر سے اندر کی باتیں بھی تمہیں بتا دی ہیں نہ بتانے والی بھی ۔۔۔۔"

اس وقت میں نے سیمی کو جو کچھ بتایا وہ میری آپ بیتی تھی لیکن میں نے اپنی کہانی جذبہ بہ جذبہ اور واقعہ در واقعہ آفتاب سے منسوب کر کے اسے سنائی۔ آفتاب کا نام میں نے اس لیے لیا۔ کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میری کوئی بات وہ غور سے نہیں سنے گی سرکٹ آؤٹ کام آئے گا اور بجلی کا کرنٹ اس کے دل تک نہ پہنچ سکے گا۔

میں نے بتایا ذرہ ذرہ احوال ۔۔۔۔ جب پہلی بار وہ کلاس میں آئی تھی۔ اس نے کس سے پہلے بات کی تھی اور وہ کب رخصت ہو گئی۔ میں نے اسے وہ سارے خط سنائے جو میں لکھتا رہا لیکن پوسٹ نہ کر سکا۔ میں نے وہ تمام واقعات بیان کیے جب میں نے اس کا تعاقب کیا اور اسے مل نہ سکا۔ اپنی ڈائری کے صفحات بیان کرنے میں آسمان کا رنگ پرانی چاندی جیسا ہو گیا اور مجھے شبہ ہوا کہ دن چڑھنے والا ہے۔

"لیکن یہ ساری باتیں تو مجھے آفتاب نے کبھی نہیں بتائیں۔"

"وہ جذبات کے اظہار میں گونگا آدمی تھا۔۔۔۔ ایسے آدمی کچھ نہیں بتایا کرتے۔"

"لیکن ۔۔۔۔ ہم دونوں تو گھنٹوں باتیں کرتے تھے ۔۔۔۔ تمہیں بھی تو اس نے سب کچھ بتایا ۔۔۔۔ اتنی ساری محرومیوں کی مجھ سے تو کبھی اس نے شکایت نہیں کی۔ مجھے تو معلوم نہیں کہ وہ مجھے خط لکھتا تھا بغیر پوسٹ کیے۔"

میں اندر ہی اندر ہنسا اور رویا ۔۔۔ میرا تو دوست تھا سیمی ۔۔۔۔ دوست ۔۔۔۔ ہو سو ۔۔۔۔۔

"آؤ ان باتوں کا فائدہ ۔۔۔۔ اور ان سے حاصل ۔۔۔۔؟ شاپنگ کم

ہو جائے تو رسیدوں سے فائدہ؟"

میں نے بازو پھیلا کر اسے اپنے وجود کے ساتھ لپٹا لیا۔ رجہ گدھ کو ایسے لمحوں کا بہت انتظار رہتا ہے جب کوئی شخص دنیا کو بے فائدہ سمجھ کر اس سے منہ موڑنے کی کوشش کرے، اس نے اپنے اعضاء ڈھیلے چھوڑ دیے جیسے طوفان کے بعد ٹوٹی ہوئی کشتی اپنے تختے ساکت پانیوں پر چھوڑ دیتی ہے اس گلدستے میں میرے لیے ان گنت کانٹے تھے۔ لیکن ان کانٹوں کے باوجود میں اسے سینے سے لگانے پر مجبور تھا۔

"سیمی۔۔۔۔محبت کی فریم میں کبھی کبھی تصویر بدلنا پڑتی ہے۔"

اس نے آنکھ کی جھری سے دیکھا وہ اس وقت میرے ساتھ نہیں تھی۔ اندر دھنسی ہوئی آنکھوں میں فیروزی مائل سیاہ آئی شیڈ والے پپوٹوں کے نیچے ان آنکھوں میں آفتاب کی شکل گھوم پھر رہی تھی۔

"جانے دو۔۔۔۔مجھے جانے دو۔۔۔۔میں ان تصورات سے ختم ہو جاؤں گی"

"کیسے تصورات سیمی؟۔۔۔۔کیسے؟"

"وہ دونوں۔۔۔۔ایک ڈبل بیڈ پر ہیں۔ وہ میرا آفتاب۔۔۔۔میرا اسے چوم رہا ہے زیبا کو۔۔۔۔تم نہیں سمجھ سکتے قیوم۔۔۔۔یہ تصورات مجھے ختم کر دیں گے۔ پتہ نہیں سارا سارا دن مجھے کیا کچھ نظر آتا رہتا ہے۔"

میں نے خفگی سے کہا۔۔۔۔"ہم بھی تو ایک دوسرے کو چوم رہے ہیں سیمی۔"

اس نے ندامت سے سر جھکا لیا اور لجاجت سے بولی۔۔۔۔"یہ اور بات ہے قیوم۔۔۔۔اسے اپنی زیبا سے محبت ہو گئی ہے۔۔۔۔وہ بے وفا ہے۔۔۔۔بے وفا۔۔۔۔اتنی جلدی میرے بعد اسے محبت ہو گئی۔۔۔۔وہ زیبا کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے گا۔۔۔۔ہمیں کوئی محبت تھوڑی ہے؟۔۔۔۔ہیں قیوم۔۔۔۔؟"

میں چپ رہا۔

جہاں تک سیمی کا تعلق تھا وہ مجھے چومتی ضرور تھی لیکن اسے مجھ سے محبت نہ تھی، کم از کم یہاں تک وہ سچی تھی۔

سیمی با وفا کیونکہ وہ صرف احساس تشکر میں آ کر قیوم کے وجود کو برداشت کرتی تھی ۔۔۔۔۔اور میں ۔۔۔۔میں ان دونوں کے درمیان کیا تھا؟ ۔۔۔۔ میں اپنے آپ کو کس جتھے کس کلاس کس گریڈ میں رکھتا؟ ۔۔۔۔شاید کرگس جاری کے لوگوں کی کوئی Catagory نہیں ہوتی وہ تو محض لائین ہوتے ہیں نہ دائرہ نہ چوکور نہ مستطیل ۔۔۔ محض لائین ۔۔۔۔جو ان دائروں کی مستطیلوں کی سرحدیں متعین کرتی ہے۔

اس وقت سفید چادر میں ملبوس نو فٹ کا ایک آدمی مشعل لیے سامنے ایک جھاڑی سے نکلا اس کے سر پر کوئی بال نہ تھے اور وہ دائرے میں چلتا تھا اس نے تین مرتبہ اپنی مشعل اونچی کی اور پھر واپس جھاڑی میں گھس گیا ۔۔۔ اس وقت پتہ نہیں کیوں میرے اندر ایک گہرا گیان پیدا ہوا۔ جیسے استخارہ کر لینے کے بعد گومگوں کی حالت ختم ہو جاتی ہے میرے اندر آفتاب نے گھس کر دو چار ہاتھ کرانے کے مارے اور قیوم کو ختم کر دیا۔ اس کے بعد میرے اندر آفتاب ایسے بھرتا گیا جیسے بوتل میں پانی ۔۔۔ سر کی آخروٹی ہڈی سے لے کر پیروں کی پیچیدہ ہڈیوں تک آفتاب بیٹھ گیا۔ اس کے بعد اس آفتاب کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا ۔۔۔ جس وقت وہ چاہتا چلا جاتا اور قیوم سٹنڈ تو ہو جاتا۔ جس وقت وہ آتا قیوم خود ہی ڈرائیور کی سیٹ چھوڑ کر پچھلی نشست پر جا بیٹھتا۔

اس رات کے بعد مشعل والے جن کو کھلی آنکھوں دیکھا اور آفتاب اور قیوم کی ادل بدل سے لطف اٹھانا میرا محبوب مشغلہ بن گیا ۔۔۔ اس وقت کو سیمی جانتی تھی۔

۔۔۔ پہلے میں نے قیوم بن کر اس کے دل میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی ۔۔۔۔ لیکن وہ یلغار بے سود تھی۔ اب میں نے آفتاب بن کر بھیس بدل کر اس پر شبخون مارا

اور اس کی ایک ایک بوٹی اتار لی۔۔۔۔ میں نے اس کی اداسیوں کو چوم چوم کر اس کے وجود سے اکھیڑنا چاہا۔ لیکن جو بیمار عشق ہوتے ہیں ان پہ اس انٹی بائیوٹک کا اثر نہیں ہوتا۔۔۔۔ ان کی اداسی کوئی پوشیدہ پینٹ نہیں جسے کھرچ کر نئے پینٹ کی تہہ جما دی جائے۔۔۔ جوں جوں میں اسے چومتا۔ وہ ہر ہر اداسی کے ساتھ اپنے وجود کی ایک ایک اینٹ بھی اتار پھینکتی جاتی حتیٰ کہ صبح کے قریب وہ صرف ملبہ رہ جاتا۔ پرانی بیٹوں کا تتر بتر ملبہ۔

عموماً محبت میں ناکامی کے بعد لوگ اپنی ہی نفی اور اپنی ذات کی تذلیل میں مصروف ہو جاتے ہیں۔۔۔۔ جب بند سیپی سے برآمد ہونے والے آبدار موتی کو اصل خریدار نہیں ملتا۔۔۔ تو پھر موتی اپنا آپ ریت کے حوالے کر دیتا ہے یہاں پتھروں کے ساتھ رلنے کے علاوہ اس کی اور کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ ناکام عاشقوں کو جسم پر جملہ حقوق محفوظ لکھوانے کی حاجت نہیں رہتی۔۔۔۔ وہ ہر کس ناکس کے ہو کر کسی کے نہیں رہتے۔۔۔۔ رفتہ رفتہ اپنے جسم کی تذلیل میں انہیں لذت محسوس ہونے لگتی ہے۔۔۔ زندگی کا ہر وہ رنگ جو انہیں اپنے آپ پر ہنسنے کا موقع دے انہیں دل سے مرغوب ہو جاتا ہے۔ شراب عورت جواء گئی ذلتوں کی پریس سے مرد نکلتا ہے۔

محبت میں ناکام ہو کر عموماً عورت کے دل سے جسم کی حرمت عصمت اور عزت کو تصور جاتا رہتا ہے۔

کئی بار سیمی جیسی ماڈرن لڑکی کو علم بھی نہیں ہوتا کہ وہ اپنے اوپر لعنت بھیج رہی ہے۔

لیکن آہستہ آہستہ دھنستی وہ بھی چلی ہی جاتی ہے۔

سیمی کو بھی معلوم نہ ہو سکا۔۔۔۔ کہ وہ میری داشتہ بن گئی ہے۔

اور میں بھی پوری طرح سمجھ نہ سکا کہ میں ہی اس کے کفن کا آخری کیل ہوں۔

میں کوٹھے کے فرش پر دری بچھائے پڑا تھا کہ بھائی کے دونوں لڑکے اوپر آئے ان کی نیکریں اور قمیصیں ایک سی تھیں۔ شاید توام بھائی تھے۔ کیونکہ ان کی شکلیں عادتیں، کپڑے بول چال سب ایک طرح کا تھا۔ وہ تخت پوش سے ایک ہی سٹائل میں چھلانگ لگاتے تھے

"آپ کو اماں بلا رہی ہیں۔"

پتہ نہیں کیوں بھابھی صولت۔۔۔۔۔ بہت کم کوٹھے پر آتی تھیں؟

"کیا کام ہے؟"

"پتہ نہیں۔۔۔۔" بڑے بھائی نے کہا۔

"پتہ نہیں۔۔۔۔۔" چھوٹے بھائی نے نقل کی۔

"ادھر آؤ مسعود۔۔۔۔" میں نے محبت سے کہا۔

"ہم جا رہے ہیں۔۔۔۔" مسعود بولا۔

"ہم جا رہے ہیں۔۔۔۔" فرید نے بھی کہا۔

وہ دونوں ہاتھ والے لوٹڑے کی طرح زن سے غائب ہو گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد سفید طباق چہرے پہ چھائیوں کی تتلیاں سجائے بھابھی صولت آ گئیں۔ یہ عورت اس قدر رنجیدہ نہ ہوتی تو مزے دار ہو سکتی تھی۔

"قیوم۔"

"میں آ رہا تھا جی۔۔۔۔ وہ ذرا۔۔۔۔"

"کوئی بات نہیں۔"

"بیٹھے بھابھی۔"

بھابھی صولت کھڑی رہیں

"تم جانتے ہو۔ ابا جی کی زمینوں سے اب کچھ نہیں ملتا۔۔۔ مختار صاحب مجھے یہ

اخبار دے گئے ہیں اس میں جو نوکری ہے اس کے لیے عرضی دے دو آج ہی۔"

"آپ۔۔۔۔آپ چاہتی ہیں۔۔۔۔میں یہاں سے چلا جاؤں۔۔۔۔" میں نے سوال کیا۔

"ہے نا پاگل۔۔۔۔ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ اب تم بے کار نہ رہو، نوکری کر لو۔۔۔۔"

میرے سامنے اخبار رکھ کر بھابھی صولت چپ چاپ نیچے چلی گئی۔

خبر میں ریڈیو سٹیشن کی طرف سے پروڈیوسر کی آسامی کا اعلان چھپا تھا۔۔۔۔ اس نوکری کے لیے میری تعلیمی سند کافی تھی لیکن پتہ نہیں یہ دن اور راتیں کیسے گزر رہی تھیں۔ میں کہیں پارٹ ٹائم نوکری تو کرنا چاہتا تھا۔ لیکن کسی مستقل نوکری کے لیے ابھی ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔

رات گئے تک میں کوٹھے کے بیرونی صحن میں ٹہلتا رہتا۔۔۔۔چاندرات میں گھر کی چھت سے لگ کر جب چاند مجھے دیکھتا تو ٹہلتے کرتے میں میرا سایہ گدھ کی طرح نظر آتا۔ میری انگلیاں ہونٹ دانت سب مسلسل سگریٹ نوشی کے باعث براؤن ہو چکے تھے۔ میں نے ان لمبی راتوں میں ہستی سے لے کر Abiogeneus تک ہر مسئلے پر دماغ کو کھپایا تھا ان سوچوں کی وجہ سے میرے وجود کی حالت بھوسے بھرے ہوئے مرا دچیتے جیسی ہو جاتی۔۔۔۔جسے دیکھ کر بچے ڈرتے ہیں اور جو بالکل بے ضرر ہوا کرتا ہے۔

بھائی مختار اور ان کا گھرانہ بڑے سکھی لوگ تھے۔

بھائی مختار اپنے گھر بیوی اور بچوں سے پیار کرتے تھے۔ انہیں اپنی ساری ملکیت سے پیار تھا۔ متوسط عقل، متوسط اخلاقی قدریں ڈیموکریسی کی پرستش اور سرمایہ دار نظام کی برکتوں کے سہارے ان کا گزارا چلتا تھا۔۔۔۔بھائی مختار کی ساری منزلیں مادی تھیں۔۔۔۔وہ سانڈے سے گلبرگ تک پہنچنا چاہتے تھے۔۔۔۔ان کے

سامنے بچوں کی اعلےٰ تعلیم کا گوں تھا سوڑ سائیکل سے جاپانی کار تک کا سفر، بیوی کے کپڑے زیورات کی فکر، سوسائٹی میں اچھی پوزیشن اور ساکھ کے لے کوشش اپنی نوکری میں سالانہ رپورٹ کی عمدگی اور سال بہ سال ترقی کے امکانات کے بے جدوجہد۔۔۔۔۔ نچلی منزل میں کبھی چاند نے شکل نہ دکھائی تھی۔۔۔۔۔ وہاں دن چڑھتے ہی چیونٹیوں کا سفر شروع ہو جاتا۔ مختار بھائی تفریح کے وقت ٹرانسسٹر سنتے۔ جس طرح کاسٹیم جیولری سے عورت میں کچھ ٹین پن کچھ مستعمل فیشن شامل ہو جاتا ہے اسی طرح زیادہ ریڈیو سننے والوں کے نکتہ نظر بڑے عقلی، مادی، جمہوریت پسند ہو جاتے ہیں وہ ریڈیو پر ہونے والے مباحثوں سے ضمنی مسائل چن کر باتیں کرتے ہیں۔۔۔ ان کی زندگیوں سے چاند کا سفر ختم ہو جاتا ہے صرف چیونٹیوں کی منزلیں باقی رہ جاتی ہیں۔

میرا خیال تھا کہ مجھے زیادہ دیر تک نوکری کی ضرورت نہ ہوگی۔ کیونکہ اندر ہی اندر مجھے شبہ تھا کہ جس طرح میں رات رات بھر تصور جاناں کیے ہوئے بیٹھا رہتا ہوں۔ یہ کیفیت مجھے زیادہ دن زندہ رہنے کی مہلت نہیں دے گی۔ پکی نوکری، ترقی، پھر اس نوکری کی دیکھ ریکھ یہ سب کچھ میرے حالیہ پروگرام کی نفی تھا۔ اس کے باوجود بھائی مختار کو خوش کرنے کے لیے میں نے ریڈیو سٹیشن کی نوکری کے لیے درخواست بھیج دی۔

سیمی کچھ دنوں کے لیے لاہور آئی تھی لیکن جلد ہی اس نے پنڈی استعفیٰ بھجوا دیا اور وائی ڈبلیو سی اے میں اپنا کمرہ لے کر رہنے لگی جب بھی میں اس سے پوچھتا کہ اب اس کا کیا ارادہ ہے؟ تو وہ بیزار ہو کر جواب دیتی۔۔۔۔ "کوئی ارادہ نہیں۔۔۔ "

"پھر بھی۔۔۔ کوئی نوکری کوئی۔۔۔ اور پروگرام۔"

وہ چپ رہتی جیسے اندر ہی اندر اس نے کوئی پروگرام بنا رکھا تھا لیکن وہ اسے مجھے بتانا نہ چاہتی تھی۔

ایک روز میں نے بہت عملی بن کر کہا۔۔۔۔ "آج کے اخبار میں ایئر ہوسٹس کا Job نکلا ہے تم اس کے لیے اپلائی کیوں نہیں کر دیتیں؟"

وہ مسکرائی پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔۔۔۔ "اچھا Idea ہے۔"

"سچ سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں تمہارا فگر بھی اچھا ہے انگریزی خوب بولتی ہو تمہیں بہت جلد Select کر لیا جائے گا۔"

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور کہتی گئی۔۔۔۔ "پھر میں فورن فلائیٹ پر لگ جاؤں گی۔۔۔ کراچی بیروت لندن۔۔۔۔ لندن فرانکفرٹ تہران کراچی۔"

پھر کسی روز آفتاب میرے طیارے میں چڑھے گا اپنے چھوٹے سے بیٹے کی انگلی پکڑ کر۔۔۔ اس کی زیبا کے ہاتھ میں وینٹی بکس ہوگا۔۔۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ سیٹوں پر بیٹھیں گے اور میں ان کے سامنے ناشتے کی ٹرے لگاؤں گی۔۔۔ کافی کی پیالی بنا کر دوں گی۔ آفتاب مجھ سے کہے گا ذرا اس منے کا نام تو پکڑا دیجیے۔۔۔۔ میں جب اسے نام تم پکڑانے کے لیے بڑھاؤں گی تو اس کی بیوی پہلے رسالہ مجھ سے پکڑے گی اور کہے گی دیکھیے ہمارے ٹوی کو ذرا باتھ روم لے جائیے۔

"چپ کرو یہ بکواس۔"

"اور جب میں ٹوی کو باتھ روم میں لے جاؤں گی تو وہ مجھے کہے گا آپ مجھے چوم کیوں رہی ہیں مس۔"

"تم اپنے آپ کو اذیت دینے کے لیے کیا کچھ سوچتی رہتی ہو۔"

وہ بولتی چلی گئی۔۔۔۔ "اور جب میں ٹوی کی نیکر کے بٹن بند کر کے اس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھ کو لون سے بھیگے ہوئے ٹیشو سے پونچھوں گی تو وہ پوچھے گا مس آپ رو کیوں رہی ہیں۔۔۔ بتائیں ناں کسی نے کچھ کہا ہے؟"

"خدا کے لیے یہ ــــــــ باتیں چھوڑ دو"

"ٹھیک ہے۔۔۔۔ٹھیک ہے مجھے ایئر ہوسٹس لگنا چاہیے یہی میری سزا ہے یہی یہی یہی۔"

میں اپنے مشورے پر عجیب طرح سے شرمندہ ہو گیا

دراصل آفتاب سے بچھڑ کر سیمی کشش ثقل سے آزاد ہو گئی تھی۔۔۔۔۔لیکن کشش ثقل سے آزاد ہونے اور آزاد رہنے کے بعد جو بے سمتی پیدا ہوتی ہے اس سلسلے میں اسے کوئی ٹریننگ نہ دی گئی تھی خلا بازوں کو فضائی سفر میں جہاں اور بہت سی تربیت دی جاتی ہے وہاں دو طرح کی ٹریننگ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے جب وہ فضا سے نکل کر خلاء میں جاتے ہیں اس وقت جسم کا اندرونی پریشر تو رہتا ہے لیکن اس کا کاؤنٹر بیلنس کرنے کے لیے بیرونی دباؤ نہیں رہتا ایسے میں تمام شریانوں کے پھٹ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اندر اور باہر کے پریشر برابر رکھنے کے لیے خاص قسم کے Space Suit بنائے جاتے ہیں اور ان کے استعمال کا طریقہ سکھایا جاتا ہے دوسرا مسئلہ کشش ثقل سے آزاد ہو کر بے سمت وقت گزارنے کی ٹریننگ ہوتی ہے اس کی ٹریننگ کے لیے خلاء بازوں کو ایک Capsule میں بند کر کے چھوٹی چھوٹی ڈھبریوں کے سے روٹی کھانے خلائی جہاز میں آنے جانے کی ٹریننگ دی جاتی ہے

سیمی کے اندر پریشر بہت بڑھا ہوا تھا
سیمی کشش ثقل سے آزاد ہو چکی تھی۔

لیکن بے سمت زندگی گزارنے کی ابھی تک اسے کوئی ٹریننگ نہیں ملی تھی۔

وہ گویا ان دنوں سوفیا تلے سانس لے رہی تھی۔جہاں بیٹھ جاتی پہروں بیٹھی رہتی کہیں جب اس کی نظر جم جاتی تو پھر چینی گڑیا کی طرح اسی طرف دیکھے جاتی ایسے میں آفتاب کے نام کے علاوہ اور کوئی ٹیک کارگر نہ ہوتا۔اس خلائی دور سے کئی کیفیتیں وابستہ ہوتیں۔خودترسی، بیزاری، تنہائی پسندی، مردم گزیدہ محرومی۔۔۔

غرضیکہ آفتاب کی کشش باقی نہ رہی تو کئی سمتیں پیدا ہوئیں۔ لیکن ہر سمت کے آگے ہمیشہ خلا ہوتا۔ خاموشی ہوتی۔۔۔ اندر کا پریشر بڑھتا چلا جاتا۔

ہم دونوں گھنٹوں پہروں، دنوں آفتاب کی باتیں کرتے رہتے اس کا ہاتھ میرے ہاتھوں میں رہتا۔ میں تسلی آمیز محبت کے ساتھ اسے چومتا رہتا۔ وہ کبھی مدافعت نہ کرتی۔ بلکہ کبھی کبھی شکر گزاری کے ساتھ مجھے دیکھ لیتی۔ لیکن جونہی آفتاب کی باتیں ختم ہو جاتیں وہ یکدم اندر کی لفٹ بند کر کے کہیں اوپر چلی جاتی۔

ان دنوں وہ خود ترسی سے حسد کی طرف مائل تھی۔ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ سیمی کے ساتھ جو بھی وقت گزرا وہ ایک طرح سے بہت عجیب تھا بیرونی وقت کے مطابق کوئی قابل ذکر واقعہ نہ ہوئے۔ لیکن اندر جو ایک ریگستانی کا سفر جاری تھا۔ اس میں ہم پڑاؤ پڑاؤ ٹھہرتے پتہ نہیں کہاں آ نکلے تھے۔ شاید یہ جگہ پاکستان تھی ہی نہیں۔ بلکہ شمالی امریکہ کے جنوب میں کہیں رایو گرینڈ کے ارد گرد کا پڑاؤ تھا جہاں پر ریڈ انڈین کے شامین قبیلہ کی روحیں اپنے اکتارے پر دریا کی روح کو بلا رہی تھیں۔۔۔ ۔ سیمی بظاہر تو بے حس تھی لیکن جذباتی سیڑھیوں پر اس کا سفر بہت تھکا دینے والا تھا۔ اسی سفر میں اس کا ساتھ دینے کی وجہ سے میرا بدن چور چور رہتا۔ وہ اپنی محبت میں کئی ریگستان چھان چکی تھی۔

اب وہ حسد کی تپتی ہوئی سفید ریت پر بھاگ رہی تھی۔ آفتاب سوانیزے پر تھا پیاس سے اس کے ہونٹ خشک تھے۔ فاصلے سے جپسم کے تودے جمی ہوئی برف کی طرح نظر آتے۔ لیکن قریب پہنچنے پر سب کچھ سفید ریت ڈھل جاتا تھا۔

ہر طرف جلا دینے والی پھونک دینے والی راکھ کر دینے والی حسد کی سفید ریت پھیلی تھی اور اس ریت پر سیمی کسی کی طرح ننگے پیر ننگے سر بھاگ رہی تھی بے سمت

ان دنوں سیمی مجھ سے ملتے ہوئے کتراتی تھی۔۔۔۔ وہ کسی فیصلے پر نعوذ باللہ پہنچنے کی کوشش میں مبتلا تھی۔

جس وقت میں ریگل کے چوک میں بس پر سے اترا تو مجھے معلوم تھا کہ سیمی مجھے آج وائی ڈبلیو سی اے میں نہیں ملے گی۔ اس کے باوجود میں آہستہ آہستہ اس کے ہوسٹل کی طرف چلنے لگا۔ دھوپ میں اب حدت نہ رہی تھی اور سینٹ انتھونی سکول سے ملحق گرجا آج سورج کی کرنوں میں دھلا ہوا نظر آتا تھا۔ ایک فادر سیاہ چغے میں ملبوس گرجے کے مرکزی پھاٹک کو کھول کر اندر چلا گیا گرجے کا دروازہ بند ہو گیا۔ اور میں سوچتا رہ گیا کہ اندر جانے والا کون تھا۔۔۔۔؟ دیسی عیسائی۔۔۔ امریکی فادر۔۔۔ یا ڈچ برادر۔۔۔۔؟ لوگ اپنے دیس کو چھوڑ کر کیوں پردیس میں جا بیٹھتے ہیں۔۔۔؟ پردیس میں کیا چیز انہیں باندھے رکھتی ہے۔۔۔۔؟ عقیدہ؟۔۔۔ محبت؟۔۔۔ عورت۔۔۔ یا انا؟

اس مختصر سڑک کے اختتام پر پٹرول پمپ کے پاس میں بائیں مڑ گیا۔ لیکن پٹرول پمپ سے شارٹ کٹ کرنے سے پہلے میں نے پلازا سینما کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اس وقت میں چاہتا تو سیدھا جناح باغ جناح جا سکتا تھا لیکن پھر میں نے سوچا شاید سیمی ابھی وائی ڈبلیو سی اے میں موجود ہو پلازہ سینما میں ابھی ساڑھے تین بجے کا شو ٹوٹا تھا۔ فری میسن کی بلڈنگ سے لے کر پٹرول پمپ والے چوراہے تک کاریں۔ رکشا سائیکلیں پیدل سب بڑی افراتفری کے ساتھ جلدی گزر جانے کی آرزو میں ٹریفک کے لیے اڑچنیں پیدا کر رہے تھے۔

میں نے ساری بھیڑ کی طرف نگاہ دوڑائی اور جی میں سوچا۔۔۔ اس ساری خلقت کو علم نہیں کہ وائی ڈبلیو سی اے میں ایک دبلی پتلی لڑکی۔۔۔۔ ایک ڈرٹی لڑکی اپنے آپ پر تیل چھڑک کر مرنے کے لیے تیار کھڑی ہے ہم شہر والے ایک دوسرے سے کتنے بے خبر تھے۔ پٹرول پمپ کے سامنے بڑے سائن بورڈ پر ایک پنجابی فلم کا اشتہار لگا تھا۔ ہیروین کی آنکھیں حیران کن حد تک سیمی جیسی تھیں۔ آفتاب کا نام سنتے ہی جیسی کیفیت سیمی کی ہوتی ویسی ہی سائن بورڈ والی لڑکی کی

انکھوں سے عیاں تھی میں نے ہاتھ ہلا کر قلم والی کو خدا حافظ کہا اور وائی ڈبلیو سی اے چلا گیا۔

یہ ہوسٹل بھی چمگادڑوں کی آماجگاہ تھی۔

اس ہوسٹل سے لے کر فاطمہ جناح تک آزاد عورتیں اور لڑکیوں کا ٹریننگ کیمپ تھا گھروں سے بیزار، روزگار کی تلاش میں پریشان، ڈاکٹر بننے اور مستقبل سنوارنے کی آرزو میں بے قرار، عاشقوں سے رنجیدہ، شوہروں کی تلاش پر مصر، گھر رہتی تھیں رات کے پچھلے پہر جب کبھی میں یہاں سے گزرا ہوں مجھے فاطمہ جناح کالج سے لے کر وائی ڈبلیو سی اے کے ہوسٹل تک اور حضرت یعقوب زنجانی کے مزار تک آہوں کا ایک مرغولہ اس رقبے پر معلق نظر آیا خاموشی ہوتی تو ہلکی ہلکی سرگوشیاں اور آہیں بھی سنائی دیتی ہیں جیسے ایک ساتھ کئی چپ ٹھہرے ہوئے پانیوں میں ہولے سے اتریں۔

ڈاکٹری سیکھنے والیاں چوک کے اس پار رہتی ہیں ٹائپ کی کلاسوں میں حاضر باش رہنے والیوں سے کئی بار میرا ٹکراؤ وائی ڈبلیو سی اے میں پلازہ سینما کے شو کے ساتھ ساتھ یہاں بھی کلاس ٹوٹا کرتی تھی۔۔۔ سب خوش لگتی تھیں۔۔۔۔

سب کی سب خوش فہمیوں میں مبتلا تھیں۔۔۔۔ شام کے باوجود اکثریت کے چہرے پر سیاہ چشمے ہوتے جو سائیکلوں پر تھیں وہ اپنے آپ کو زیادہ ماڈرن سمجھ رہی تھیں۔ جو پیدل تھیں وہ اپنے آپ کو زیادہ باحیا سمجھنے پر مجبور تھیں۔۔۔۔ لیکن سب کے چہرے پر کسی نہ کسی طرح کی Disillussionment ہلکی سی گرد۔۔۔ ازالہ سحر کی عدم میلان طبعیت۔۔۔ کی۔۔۔ ہلکی سی میک اپ کی تہہ۔۔۔۔

یہ تمام عورتیں لڑکیاں کسی نہ کسی طرح مردوں کے نارمل نیوکلس سے کٹی ہوئی تھیں ہو سکتا ہے ان میں سے بیشتر عورتوں کو مردوں کا قرب زیادہ ملتا ہو، لیکن معاشرے کے رسمی طریقے کے مطابق وہ Carrier گرلز تھیں۔ ایسی مینڈکیاں جن کو ہلکا ہلکا زکام ہو چکا تھا وہ اعلانیہ سگریٹ پیتی تھیں کماؤ سپوت کی طرح گھروں میں پیسے بھیجتی

تھیں ان کے بھائی چچا ماموں نہ جانے کون تھے۔۔۔۔کہاں تھے اور اگر تھے تو کس حد تک ان کی زندگیوں پر اثر انداز ہو سکتے تھے؟۔۔۔۔یہ سب تو چھپکلی کی کٹی ہوئی دم کی طرح پھڑک رہی تھیں۔۔۔۔تڑپ رہی تھیں اور اپنے اصلی ریڑھ کی ہڈی کی تلاش میں تھیں۔

سیمی بھی ان ہی چہروں میں سے ایک تھی۔۔۔۔اس کے چہرے پر بھی ہلکی سی گرد ہی تھی میک اپ کی۔۔۔۔ازلی سحر کی۔۔۔۔عدم میلان طبیعت کی۔۔۔۔فریب آرزو کی۔۔۔۔

میں نے پورچ میں کھڑے ہو کر دوسرا سگریٹ پیا۔ اندر پیام بھجوایا اور گو مجھے معلوم تھا کہ سیمی اندر نہیں ہے پھر بھی میں منتظر رہا۔ اور جب تصدیق ہو گئی کہ وہ صبح کی کہیں گئی ہوئی ہے تو میں ٹائپ سیکھنے والی لڑکیوں میں راستہ بناتا جناح باغ کی طرف چل دیا۔

مین پھاٹک میں داخل ہونے سے پہلے میں نے ایک نگاہ ہمایوں رسالے کے مسکن پر ڈالی۔۔۔۔بڑے بڑے درختوں سے گھرا ہوا گھر۔۔۔۔یہاں سے کبھی ہمایوں رسالہ نکلتا تھا۔

ہمایوں رسالہ۔۔۔۔اودھ پنچ؟۔۔۔۔ادبی دنیا۔۔۔۔یہ سب کہاں تھے۔ ان کے خالق کہاں تھے؟ ہر عہد میں کچھ ایسے لوگ ضرور پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ جو اپنے عہد کے لوگوں کو بڑے فلک پیما لگتے ہیں مگر رفتہ رفتہ وقت انہیں یوں ڈھانپ لیتا ہے جیسے اونچی پرانی قبروں میں اونچی اونچی گھاس آگے آئے اور کتنے گر جائیں قبریں بوتی رہیں لیکن دیئے جلانے والے کسی اور قبرستان میں جا کر رت جگا کریں۔ کچھ بڑے لوگ تو اپنا نام وقت کی لہروں پر ثبت کر جاتے ہیں کچھ سیمی کی طرح کوئی نشان چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔

سیمی کا عشق سیمی سے کیسے بہتر تھا؟

اگر کسی مرگئی میں نے پہلی بار سوچا تو کیا میرے علاوہ کوئی جان سکے گا کہ اسے کیا بیماری تھی۔۔۔۔۔۔؟ میرے پاس تو نہ کوئی ہمایوں تھا نہ اور وہ شیخ نہ ادبی دنیا۔ پھر میں تو اس کے بے اپنے عہد والوں تک بھی کوئی داستان چھوڑ کر نہ جا سکوں گا اپنے عہد میں بھی اس کے عشق کی داستان فلک پیما نہ ہو سکے گی۔۔۔۔۔۔ یہ عہد کیسا المیہ تھا؟

باغ بہت رونق تھی۔ عنگری ہال پر شام کی آخری روشنی پڑ رہی تھی۔ بار بار کہیں سے پاپڑ بیچنے والے کی آواز باغ کی خاموشی پر گرتی اور برف کی طرح چکنا چور کر دیتی تھی۔ مدت کا باغوں کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ جب گھروں کی گھٹن بہت بڑھ جاتی ہے جب مرد کسی عورت سے بند کمر میں مل نہیں سکتا یا ملنا چاہتا تو پھر وہ باغوں کا رخ کرتا ہے باغوں میں انتظار، وصل، بجوگ اور بیوگ کے بوٹے جھاڑیوں کے پیچھے بیٹھے ملتے ہیں درخت پودے گھاس پھول سب ان عنصرتیوں کی کھیلوں میں بار بر کے شریک رہتے ہیں، اسی لیے باغوں کی خوشبو میں ایک سحر ہوتا ہے یہاں کئی کہانیاں ایک ساتھ بوتی ہیں جیسے ستاروں کے اوپر والے تار مضراب سے چھیڑو تو تربیں آپ ہی آپ بول اٹھتی ہیں۔

میں نے سارے میں تلاش کیا لیکن سیمی کہیں نہیں تھی۔۔۔۔۔۔ میں نے تیسرا سگریٹ سلگایا اور کافور کے درخت تلے بیٹھ گیا۔ لوگ شاید اپنے گم شدہ وجود، اپنی ساتیکی آزادی اور جبلی آرزوؤں کی تلاش میں گھوم رہے تھے۔ کیونکہ آج خلاف معمول سڑکوں پر بہت ہجوم تھا لوگ کس خوشی سے باغوں کا رخ کرتے ہیں اور کتنی جلدی کیسی بیوی کے ساتھ لوٹ جاتے ہیں شاید مصنوعی باغوں میں بڑھوں سے، فواروں میں، بنچوں پر، کیاریوں سے کینٹی کی میز کرسیوں کے اوپر نیچے باغ میں پھیلی پکی سڑکوں سے مہذب جبری زندگی کا بلاوا اتارتا ہے ہمارے اندر کا ریڈیو اس آواز کو ہوا سے پکڑتا رہتا ہے ایسے میں سیر کرنے والے دوستوں میں گھٹتے ہیں۔ فطرت سے رشتہ بحال کرنے والے بادل، درخت پھول ہریاول، پرندے سب اسے جنگلوں

کی طرف کھینچتے ہیں اور مصنوعی فوارے، سڑکیں، کینٹے، موزیک، کی پتھریلی بنچیں،

اسے تہذیب کلچر اور شہر کی طرف موڑتی ہیں اسی کشمکش میں کئی بار اندر سے نسان

بدکے ہوئے گھوڑے کی طرف الف ہو جاتا ہے لیکن چھوٹ نہیں سکتا۔

باغوں کی سائیکی بہت اداس ہوتی ہے رکے ہوئے آنسو بند خیالات، جمع ہوئی

آہیں۔۔۔۔ قدرتی اداسی پولن کی طرح جھڑتی ہے اسی لیے کسی عہد کسی قوم کسی چہر

کی سائیکی کو سمجھنے کے لیے اس کے باغوں میں بیٹھنا بہر ضرور ہے۔

جس وقت رت گئے سیمی آئی تو مجھے پہچانے بغیر میرے پاس سے گزر گئی۔۔۔۔

میں نے سگریٹ کی خالی ڈبیا درخت تلے پھینکی اور اس کے تعاقب میں چلنے لگا۔

حالانکہ میں اس سے صرف دو قدم پیچھے تھا۔ لیکن میں نے اسے آواز نہ دی۔ ہاہو

ترت مراد کے مزار کے پاس جا کر وہ اچانک رک گئی اس نے جوتیاں اتاریں۔ سر

پر ایک پھول دار رومال باندھا اور مزار کی دیوار کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ بڑی دیر

تک وہ وہاں ایک ٹرسٹ کی طرح کھڑی قوالی سنتی رہی۔ پھر سر سے پھول دار ریشمی

و ل چشمہ اتار کر اور لکڑی کی ہیل والی جوتیاں پہن لیں میں نے اسے بلانا چاہا لیکن

کوئی شے مجھے بھی مانع رکھ رہی تھی۔

وہ بجری کو اپنی کذھب جوتیوں سے کوٹتی آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ پھر اس نے

رک کر دیہاتی لوگوں کی طرح ہاتھ سے ناک صاف کیا تو میں نے آگے بڑھ کر اسے

رومال پیش کر دیا۔

"تم کب آئے قیوم؟"۔

"میں تمہارے ساتھ تھا۔"

"کب سے۔"

"کافی دیر سے"

"پھر بھی؟۔۔۔۔ تم مجھے نظر کیوں نہیں آئے"

”کیونکہ نظر آنے اور نظر نہ آنے کی کوئی خاص وجہ نہیں ہوتی۔“

اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ لب خشک تھے اور میک اپ کی ہلکی تہہ کے باوجود وہ تمام تر بے رونق تھی۔

”تم کو معلوم ہے مجھے لگتا ہے آج کل میں زلزلہ آئے گا لاہور میں۔“

”کیوں؟“

”بس لگتا ہے بڑی دیر ہوگئی زلزلہ آئے۔“

”زلزلے کی یہ کوئی خاص وجہ نہیں۔“

وہ کافور کے درخت کے پاس پہنچ کر حادثاً گراؤنڈ میں اتر گئی۔

”کیا ہی اچھا ہو اگر اس بار زلزلے میں گورنمنٹ کالج کا ٹاور گر جائے۔“

”کیوں کیوں۔۔۔۔کیوں۔“

”ہائے کچھ تو گر جائے اس سال کرسمس سے پہلے پہلے۔“

”کرسمس کی کیا شرط ہے بھئی۔“

”پچھلے کرسمس کو میں آخری بار آفتاب سے ملی تھی۔۔۔۔قائداعظم کی سالگرہ والے دن اس سال بھی کچھ ہونا چاہیے بخدا۔۔۔۔۔اور کچھ نہیں تو گورنمنٹ کالج کا ٹاور ہی گر جائے۔“

”یہ بخاری آڈیٹوریم۔۔۔۔۔میں آگ لگ جائے۔“

”ہاں کچھ تو ہو۔۔۔۔کچھ تو ہو پرانی یادوں کی یاد تازہ کرنے کو۔“

بڑی دیر تک ہم سو مرتبہ دوہرائی ہوئی باتیں از سر نو یاد کرتے رہے آفتاب کا پوسٹ مارٹم ہوا۔ لیکن آج اس پر حسد غالب تھا۔ اس کا لب ولہجہ زہریلا اور باتیں کڑوی تھیں۔ حسد کی گیس پیلے رنگ کی ایسی مسموم گیس ہے جس میں کاربن مونو آکسائیڈ کی تمام خوبیاں موجود ہیں جہاں یہ موجود ہو انسانی پھیپھڑے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پچھلی ملاقات سے اب تک اس گیس کے اثر تلے وہ بہت بدل گئی

تھی۔ماتھے پر سوچوں کی وجہ سے ایک نس ابھری ہوئی تھی۔لہجے میں قطعیت اور لب

بھینچے ہوئے تھے ہاتھوں میں ہلکا ہلکا پسینہ تھا جیسے وہ نوکری کا انٹرویو دینے آئی بیٹھی ہو۔

''یہ مجھے ہوا کیا ہے۔۔۔۔میں تو کبھی حسد سے آشنا نہ تھی۔۔۔۔بتاؤ قیوم کیا ہوا

ہے؟اب مجھے آفتاب کا خیال کیوں نہیں آتا۔۔۔۔۔میں سارا دن زیبا کے متعلق

کیوں سوچتی رہتی ہوں۔۔۔ایک بات بتاؤں''

''کہو''

''زیبا حاملہ ہے۔''

''تمہیں کیسے پتہ چلا۔''

''بس مجھے پتہ چل جاتا ہے۔۔۔پہلے ہی۔۔۔۔مجھے ہوتا ہے ناں پتہ۔۔۔

۔وہ آج کل سونف کھاتی ہے سارا دن۔۔۔ہتھیلی پر لے بھرتی ہے سونف۔''

''چپ کرو۔''

''مجھے نظر آتی ہے زیبا۔۔۔میں اسے دیکھ سکتی ہوں پانچ مہینے کی

Pregrancy کے ساتھ۔''

''لیکن تم نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔''

''دیکھا ہے دیکھا۔۔۔۔۔ہے میں تو اسے فوراً پہچان لوں لاکھوں میں۔''

وہ چپ چاپ ہاتھ مروڑنے لگی۔

سامنے جھاڑی میں سے ایک نوگزا آدمی نکلا۔اس نے بدھ مت کے بھکشوؤں جیسا

لباس پہن رکھا تھا ہاتھ میں اونچا بانس تھا۔اس بانس پر ایک سبز رنگ کی مشعل روشن

تھی۔وہ دائرے میں چلتا رہا اور پھر مشعل کو نگل کر جھاڑیوں کے پیچھے چلا گیا۔۔۔

تھوڑی دیر مشعل سمیت جھاڑی چکر لگاتی رہی اور پھر جھاڑی مشعل نوگزا سب کچھ

غائب ہو گیا۔

''یہ سب کیا ہے؟''

"جو سامنے ہو رہا ہے۔"

"نہیں جو میرے دل میں پھوٹ رہا ہے لاوے کی طرح۔"

"حسد میں یہ خوبی ہے ہمی کہ انسان اس میں کھو کر محبوب کے تصور کو کھو بیٹھتا ہے۔ پھر رقیب کے خیالات غالب رہتے ہیں یہ خیالات اس قدر غصیلے زہر آلود اور ہم نگیز ہوتے ہیں کہ محبت کی نازک سوچیں اس گیس بھری فضا میں سانس نہیں لے سکتیں۔ ایسے میں انسان محبت کرتا ہے لیکن بازگشت سے۔۔۔۔ اصل آواز سے نہیں۔۔۔۔ اصلی محبوب تو کہیں اندر ہی اندر گم ہو جاتا ہے حسد کا محبت سے کیا تعلق؟؟"

وہ احسان مندی سے بولی۔۔۔۔ "تم بڑے ذہین ہو قیوم۔۔۔۔ سوشیالوجی کی کلاس میں بھی سب تمہاری تعریف کرتے تھے۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ لیکن پتہ نہیں تمہاری ان باتوں سے میری تسلی کیوں نہیں ہوتی۔"

اس کے ماتھے پر چڑھی ہوئی نس پر میں نے انگلی پھیری۔

"یہ بتاؤ اب میں کروں تو کیا کروں"

"اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔۔۔۔ تمہیں کیا پتہ قیوم۔۔۔۔ تم میری کتنی بڑی کمزوری بن گئے ہو اگر میں تمہیں نہ ملوں۔۔۔۔ اگر میں کسی سے آفتاب کی باتیں نہ کرسکوں تو اس کی یادوں کے پریشر تلے میں پھٹ جاؤں۔۔۔۔ سارے شہر میں اس کی باتیں کس سے کروں قیوم۔۔۔۔ بتاؤ ناں؟۔"

میں نے کمینگی کے ساتھ کہا۔۔۔۔ "تم مجھے صرف اس لیے ملتی ہو۔۔۔۔ ہمی کہ تم مجھ سے اس کی باتیں کرسکو۔"

چور سپاہی کے کھیل میں وہ اچانک پکڑی گئی۔

"اور بھی وجہ ہے۔۔۔۔ وجہ ہے ایک اور۔۔۔۔ پر پر۔۔۔۔"

"اور کیا وجہ ہے ہمی۔۔۔۔" میں نے امید سے پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ اس

وقت وہ اعتراف کرے گی کہ رفتہ رفتہ وہ میری محبت میں مبتلا ہو گئی ہے اور اب وہ آفتاب کا نام بھی لینا نہیں چاہتی لیکن اس کی بات سن کر میرے اندر پیہ جام سٹر نیک ہونے لگی۔۔۔۔

''اگر تم نہ ہوتے قیوم۔۔۔۔ اگر تمہاری ہمدردی محبت نہ ہوتی تو میں کبھی کی خود کشی کر لیتی۔ تمہاری محبت نے مجھے یہ قدم اٹھانے نہیں دیا جب مجھے پترا یقین ہو جاتا ہے کہ میں کسی قابل نہیں۔۔۔۔ تو یہ تمہاری ہمدردی ہے تمہاری محبت جو مجھ میں خود اعتمادی بحال کرتی ہے۔ تم سمجھ نہیں سکتے قیوم میری انا کس حد تک مجروح ہو چکی ہے مجھے اپنی شکل، عقل، عادات، گھرانے اپنے مکمل وجود سے نفرت ہے۔ مجھ میں اگر کچھ بھی اچھا ہوتا تو کیا آفتاب مجھے چھوڑ کر جاتا؟۔۔۔۔ جا سکتا۔۔۔۔؟ بتاؤ نا قیوم بولو۔۔۔۔ کبھی وہ مجھے چھوڑ سکتا؟''

گفتگو کا کروما میٹر پھر آفتاب کی ٹک ٹک بجانے لگا۔

''میں شاید احساس کمتری کا شکار ہوں ان دنوں۔۔۔۔ میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتی ہوں تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔۔۔۔ پھر بتاؤ ناں۔۔۔۔ تم میرے محسن نہیں تو اور کیا ہو۔۔۔۔ تم نے تمہاری محبت نے۔۔۔۔ مجھے روک رکھا ہے اس دنیا میں۔''

فقط دائیر کی سی سے یہ لڑکی کتنی مختلف تھی۔ گفتگو میں۔۔۔۔ لباس میں کردار میں۔

''صرف محسن؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''اور اور۔۔۔۔ کیا؟'' لاتعلقی سے اس نے منہ پھیر لیا۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ اگر اوپر سے دل سے بھی انکار و جود مان لیتی تو بھی میرے لیے بہت کافی ہوتا۔

''قیوم کیا وہ بھی ایسی باتیں کرتا ہوگا زیبا سے؟''

میں اس نام سے اچھی طرح آشنا تھا۔ بارش سے پہلے چلنے والا جھکڑ۔۔۔۔ جبلی

کے کھمبے، چھتنار سے درخت بوسیدہ دیواریں گرانے والی ہائی وولٹیج کی بجلی۔

''کیسی باتیں بہی؟''

''وہی باتیں بیڈروم تون میں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر۔۔۔ کرنے نہ کرنے والی سب باتیں۔۔۔''

''کیا تم بے وفا ہو بہی؟''

''نہیں قیامت تک نہیں۔۔۔ مجھے آفتاب سے محبت ہے اور قیامت تک رہے گی لیکن وہ بے وفا ہے۔''

میں نے کہنا چاہا کہ اچھی وفا ہے کہ تم میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس کا سمجھ رہی ہو۔ لیکن کوئی چیز میرے اندر بتا رہی تھی کہ وہ سچی ہے اور درست کہہ رہی ہے۔

''شادی کا خوشی سے اور محبت کا اختیار سے کوئی تعلق نہیں۔۔۔ حقوق و فرائض کا وارفتگی سے کیا ناطہ؟''

اس وقت میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں نئے بوٹ پہن کر سیدھا سندھا کلب سے چلا آ رہا ہوں۔ میرے انگوٹھے کے قریب گھٹے پڑ گئے ہیں۔ جن میں اس وقت بہت درد ہو رہا ہے۔ لیکن وہ کب سنتی۔ کب سمجھتی؟

''کچھ کہو ناں۔۔۔ کوئی فیصلہ کن بات جس سے یہ حسد کی آگ ٹھنڈی پڑ جائے قیوم بولو۔۔۔ تو بہی۔۔۔ اپنے جوتوں کو پھر Admire کر لینا۔''

میں نے لمبی سانس لی اور اس کی تشفی لے کیے کہا۔ ''ہر شخص کی یہی مجبوری ہوتی ہے بہی۔ وہ ساری عمر ایک ہی سزا نہیں بھگت سکتا ایک ہی خوشی کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔ پھانسی کے تختے سے اتر کر بجلی کی کرسی پر بیٹھنا۔۔۔ بجلی کی کرسی سے اٹھ کر صلیب چڑھنا، تہہ آب ہونا اور نہ مرنا۔ پانی کی گہرائیوں سے نکل کر سر کو ہسارے سے چھت تک لگا جانا۔ بہی جان ہم سب ایک کرب سے نکل کر کسی دوسری

تکلیف کے حوالے ہو جانا چاہتے ہیں۔ ایک خوشی سے منہ موڑ کر کسی اور خوشی میں ڈوبنا چاہتے ہیں۔ یہ انسان کے لیے اتنا ہی نیچرل ہے جیسے وہ ایک ٹانگ پر ہمیشہ کے لیے کھڑا نہ رہ سکے۔ آفتاب بھی تمہارے ناآسودہ لاحاصل عشق کے کرب سے نکلنا چاہتا تھا۔ شاید اس تکلیف سے نکل کر وہ پہلے سے بھی زیادہ مصیبت میں ہو لیکن انسانی دل ایک ہی مصیبت ایک ہی غم ایک ہی بوجھ ساری عمر نہیں اٹھا سکتا۔ کرب بھی رنگ بدلتا ہی رہے تو قابل برداشت رہتا ہے۔"

"تمہارا بہت بڑا دل ہے قیوم ۔۔۔۔ ہیوپوٹمس جتنا ۔۔۔۔ میں تم سے محبت نہیں بھی کرتی پھر بھی تم مجھے تسلیاں دیتے رہتے ہو ۔۔۔۔ تھینک یو ۔۔۔۔ تھینک یو ۔۔۔۔ تھینکس۔"

اس وقت میں سیمی کا کف اوپر کر رہا تھا

معاً میرے دل میں خیال آیا کہ قلب کا راستہ جسم سے ہو کر نہیں گزرتا۔ قلب تک پہنچنے کے لیے صرف ٹیلی پیتھی، وجدان، ہپنوٹزم میزمرزم کی ضرورت ہے۔ جسم روحانی عمل کو زمین میں ارتھ کر دیتا ہے میں نے بڑی تقدس سے سیمی کے کف بند کیے اور دل میں عہد کیا کہ اب میں اس سے کبھی نہیں ملوں گا۔

انسانی روح کے لیے سب سے زیادہ معطر اور طیب محبت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن جب سے نئی قابیل نئی ہابیل پر غالب آئے اصلی اور صادق محبت کا چشمہ قریب قریب سوکھ گیا اب جا بجا ہوس تھی ۔۔۔۔ جنسی تجربات تھے ۔۔۔۔ معکوس رابطے، نافراہمی اور ناآسودگی کی محبت تھی لوگ ایک دوسرے کو تاجیض کی طرح استعمال کرتے اور چھوڑ جاتے۔ محبت میں کجی اور کم فہمی کا رواج عام ہو گیا۔

محلوں میں ان کی ناآسودگی کہانیاں بکھرنے لگیں۔ اخباروں میں بے امن قصے بیان ہونے لگے۔ جب سے نئی قابیل غالب آئے تھے سچی اور پاک محبت کی بارش

کے بے کوئی دعا نہ گنتا۔ سب ہی جنسی محرومی، قلبی تھکن اور روح کے کلاء کی وجہ سے دیوانے ہو رہے تھے ہر وہ شخص جس کی روح میں حرام مال پہنچ رہا ہو، چہرے بشرے سے راجہ گدھ بن جاتا ہے۔۔۔ اس کی آنکھیں وحشی ہو یہ چہرہ سبزی مائل پیلا، بال بکھرے ہوئے اور ہڈیاں نمایاں ہوتی ہیں روح کا حرام کھانے والا ہزاروں میں پہنچا جاتا ہے ہزاروں میں لاکھوں میں پھر عجیب تھا کہ میرا ہمشکل ساندھا کلاس میں دوسرا کوئی نہ تھا۔

میں اپنے محلہ کا اپنے کالج کا سب سے بڑا راجہ گدھ تھا!

سیمی کی نا آسودہ محبت اب اپنے اثرات دکھانے لگی تھی۔۔۔ گو اسے مرے مجھے کئی دن ہو چکے تھے لیکن میں ابھی تک اس کے مورفیا تلے پھرتا تھا۔ چاند راتوں رات کے پچھلے پہر مجھے Visious دکھائی دینے لگے Ballueination کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی مجھے اپنا سر گھومتا نظر آتا۔۔۔ گلاس کے پانی میں مجھے چھوٹے چھوٹے، مائیکروسکوپ سے نظر آنے والے جرثومہ صاف نظر آتے۔۔۔۔ پھر بجلی کی تار پر آنے والی چھپکلی ڈائنا سور جیسی بڑی اور مہیب دکھائی دیتی۔ آسمان پر بادلوں کے رنگ آپس میں جڑ کر بڑی بڑی مادہ ناز شاندار عورتوں کی تصویریں بنکر تنگ جاتے اور اخبار کی اصلی سرخیوں کے اندر اور الفاظ اور ان الفاظ کے اندر اور تصویریں پرمعنی نظر آتیں۔ ان دنوں میں تلاوت الوجود میں مبتلا تھا بچپن سے لے کر اب تک کے تمام واقعات اور ان واقعات سے منسلک تمام لوگوں کی ورق گردانی میں دن کا زیادہ حصہ گزرتا ہے میں بظاہر شیو کرتا کرتا کپڑے بدلتا، بھائی مختار کی موٹر سائیکل مانگ کر ریڈیو سٹیشن جاتا وہاں اپنی درخواست کی پیروی کرتا۔۔۔ لیکن میرے اندر کا توازن بالکل بگڑ چکا تھا میں بیرونی حالات وواقعات میں زندہ نہیں تھا۔ میرے اندر شرح در شرح ایک ہی کتاب لکھی جا رہی تھی۔۔۔ اور جو کچھ لکھا جاتا تھا وہ انتہائی بے ربط تھا جیسے بندروں کا ایک جتھا ٹائپ رائیٹروں پر کتاب لکھنے

کی کوشش کر رہا ہو۔۔۔۔۔۔

یہ راجہ گدھ کی زندگی ہے۔

بیرونی کوائف سے کٹی ہوئی۔۔۔۔۔اندرونی ہیجان میں اس صراحی کی طرح معلق۔۔۔۔ایسی صراحی جس سے قل قل کر آواز تو آتی رہے لیکن ایک بوند پانی بھی کبھی نہ گر سکے۔

شاید ہمارا سارا گھرانہ ہی بن باسیوں کا تھا

ہم پرانے گدھ جاتی کے وہ راجپوتی لوگ تھے جنہوں نے راجستھان میں پناہ لی تھی اور جو کھیتی باڑی کو منفعت بخش کام سمجھ کر اب پنجاب کی سرزمین میں آباد ہو گئے ہم راجپوتی لوگ اب غیرت اور ان کی تمام کہانیاں بھول چکے تھے وہ تلواریں خدا جانے کہاں تھیں جنہیں میدان کارزار بلاتا رہتا تھا اب محبت غیرت سچائی ساری غیر مرئی باتوں پر کٹ مرنے کی روایات ختم ہو گئی تھیں صرف تھوڑا تھوڑا دیوانہ پن رہ گیا تھا۔اسی سے کچھ کچھ وارداتیں اب بھی ہو جاتیں۔۔۔۔۔۔ہماری ناکیں عقاب جیسی اور مونچھوں کے بال گرگٹ کے پنجوں کی طرح تنے ہوتے تلوار کی سچی زبان ہمیں بھول چکی تھی لیکن اس کے باوجود لمبی چوڑی بحث، کٹ حجتی اور بے ہودگی میں ہم نے پناہ لی تھی بس خواب ہمیں پریشان کرتے تھے۔ہر دیوالے کی طرح خوابوں میں ہمیں زیادہ حقیقت نظر آتی ماڈرن آدمی پر تہذیب اور تعلیم کا شہری زندگی کا جو بھی بوجھ ہے وہ ہمارے ہم قوم لوگوں پر بھی پڑ رہا تھا ہماری اندر کی جبلت ہمیں مرنے مرنے پر اکساتی تھی۔کھلی ہوا چوڑے میدان کی طرف کھینچتی تھی اور معاشرہ ہمیں تال میل سمجھوتے پر اکساتا تھا۔اسی لیے ہم بھی کئی صدیوں سے چوراہے پر کھڑے تھے ایک ایسی اندھی بتی کے نیچے جس کی بتیاں فیوز ہو چکی تھیں۔لیکن ہم اشارے کے منتظر تھے ہمیں پتہ نہیں چلتا تھا کہ چاروں راستوں میں سے کون سا بہتر ہے، ہم کس راستے پر چل کر نجات ملے گی؟۔

ایک رہ گاؤں کو جاتی تھی۔۔۔۔جہاں دن لمبے ہوتے ہیں نیند سکون سے آتی ہے لیکن غریبی میں تفریح کے بغیر قناعت کی ڈھال نہ ہوتے ہوئی یہ سفر بہت لمبا اور تھکا دینے والا ہوتا ہے جہاں آدمی ہر روز کے اطمینان سے گھبرا جاتا ہے۔۔۔

دوسرا رشتہ شہر کو جاتا ہے چھوٹے شہر کی سڑکیں بڑے شہروں کو بڑے شہروں کے ہوئی جہاز اور بڑے چہروں کو اور وہاں سے جانے والے راستے کئی اور ملکوں میں نکلتے ہیں نئی کلچر، نئی تعلیمات، نئے لباس نئی زبانیں نئی چہرے نئی آگاہی۔۔۔۔اس راستے کے ہر سنگ میل پر نہ صرف اپنے اعتقادات مذہب کلچر اور سوچ کا پٹرول ہی جلتا ہے بلکہ ہر موڑ ہر سیاح بے اطمینانی کی سوغاتیں سوہان روح یادوں کے بیج ٹکٹ اپنے پرس میں اکھٹے کرتا جاتا ہے ہر جگہ اسے اپنی ذات، مذہب ملک اور قوم کا ٹریول چیک بھنوانا پڑتا ہے اور دوسرے ملک کی نعم البدل کرنسی حاصل کرنا ہوتی ہے

تیسری پگڈنڈی جنگل کو نکلتی ہے

یہاں ساری طرف اونچی اونچی گھاس ہے جس میں انسان کی اپنی ہی آرزوئیں چھپن چھپائے کھڑی رہتی ہیں ہر آرزو دلاویز بھی ہوتی ہے اور سر پر کلہاڑی مار کر ختم کرنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے آرزوؤں کا یہ جنگل بڑا طلسماتی ہے اس میں اپنے مرنے اور دوسرے کو مارنے کا کھٹکا ساتھ ساتھ رہتا ہے تہذیب کی زنجیروں میں جکڑے انسان کو یہاں پہنچ کر بھی ہارا کیری کرنے کے سوائے اور کچھ نظر نہیں اتا۔ کیونکہ یہ راستہ بھی منزل ناآشنا ہے صرف اسی گرینڈ ٹرنک میں اور کئی راستے آ کر ملتے ہیں سڑک اور چوڑی ہو جاتی ہے لیکن ہمیشہ جنگل میں ہی چلتی ہے اس راستے میں اتنے پل آبشاریں نشیب اونچائیاں آتی ہیں کہ جبلت کی تلوار ہاتھ میں رہ جاتی ہے ور اسی زرہ کے بوجھ تلے آدمی مر جاتا ہے

چوتھا راستہ غاروں کی طرف جا نکلتا تھا اور کسی کو معلوم نہیں کہ یہ غاریں کہاں جا نکلتیں ہیں۔سب ان بدروحوں جنوں اور آسیبی رنگوں سے ڈرتے ہیں جن میں ڈوبو

ڈبو کر انسان ہر پڑاؤ پر رنگ بدلتا جاتا ہے۔۔۔۔۔یہ مافوق الفطرت راستہ گو مشکل نظر آتا ہے لیکن غاروں کے اندر کبھی کبھی بینائی بھی ملتی ہے اور ٹھنڈک بھی

ہم راجپوت تھے اور آج تک اسی چوراہے پر کھڑے تھے کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے ہم سب کے اندر خواب اور حقیقت گڈمڈ ہو گئی تھی۔

بھابھی صولت کا چہرہ؟

بھائی مختار کی شکل؟

اماں۔۔۔۔؟ ابا۔۔۔۔۔کیا ہم سب انسانوں میں سے تھے؟

کیا ہماری شکلیں گدھوں سے مشابہہ نہ تھیں

ہم لوگ ضلع شیخوپورہ کے چندرا گاؤں میں رہتے تھے۔ جس طرح چندرے آدمی کا ساتھ بالآخر چھوڑنا پڑتا ہے اسی طرح بالآخر ہم سے بھی یہ گاؤں چھوٹ گیا پتہ نہیں چندراں چندرماں سے بگڑا ہوا لفظ تھا کیونکہ جب بھی ہم گاؤں سے نکلے اس کی یاد چاندی کی طرح دمکنے لگتی۔

چندراں کو جانے والی کچی سڑک جس کے اردگرد ڈیلے کی خودرو خاردار جھاڑیاں تھیں بہت لمبی تھی۔ گاؤں میں غریب غربا کے استعمال کی چیزیں بیچنے والی دوکانیں، آٹا پیسنے والی خراس تال میں ڈوبی بھینسیں، مٹی اڑانے والے یکے، چارہ کترنے والی مشینیں دو تنور اور بہت سی یادیں تھیں جو فاصلے کی وجہ سے خوبصورت ہو گئی تھیں بی اے کے بعد ان ساری یادوں کو تازہ کرنے میں دوبارہ چندرا گیا۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ سارا گاؤں سیم اور تھور کی وجہ سے اس حد تک برباد ہو چکا ہوگا پورے چار سال گاؤں سے باہر رہنے کی وجہ سے میں ان خبروں کی عینی شہادت نہ رکھتا تھا جو کبھی کبھار ابا کے خطوں میں درج ہوتی تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد ہم دونوں بھائی چندراں نہیں گئے۔ پہلے بھائی مختار نے ایک رسالے میں سب ایڈیٹری کی اور پھر جب وہ سیکرٹریٹ میں ملازم ہوئے تو اپنے خاندان سمیت وہ

سا ندہ کلاں میں آ گئے۔

گاؤں میں وہ جو نہیں تھی!

گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے میں ہمیشہ ماموں کے پاس قصور چلا جاتا۔ کبھی مجھے چندراں کا خیال نہیں آیا۔

جس وقت بیگ اٹھائے گاؤں پہنچا میں نے دیکھا

ردگرد بڑے بڑے سور کے ڈھیر تھے کلر کے تختوں میں پرانے مرے ہوئے جانوروں کے ڈھانچے تھے کہیں کہیں زمین میں دلدل تھی کھارے پانی کے جوہڑ تھے۔ جن کے کنارے سبز کائی رنگی مٹی میں پیاسے جانوروں کے کھروں کے نشان گہرے ہو کر خشک ہو چکے تھے یہ جانور پانی کی تلاش میں آئے تو ضرور لیکن پیاسے لوٹ گئے۔

سارا گاؤں بے آباد پڑا تھا کسی کسی آنگن سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ لیکن گلیاں سونی تھیں بہت سے کچے پکے گھروں کے دروازے جانے والے مکینوں کی یاد میں کھلے پڑے تھے اب ان گھروں میں چرانے کو بھی کچھ باقی نہ رہا تھا اول تو جانور کم تھے اور جو ہوتی تھے ان کی ہڈیوں کو بھی ٹکلے ہوئے تھے۔ بیلوں کی آنکھوں میں اداسی تھی اور بھینسیں ہراس کی وجہ سے آنکھیں نہ ملاتی تھیں بچے دہلیزوں پر چپ چاپ بیٹھے وقت گزارنے کی راہ دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں اور گھٹنے بہت نمایاں ہو چکے تھے۔

یہ وہ چندراں نہیں تھا جس سے چار سال پہلے میں رخصت ہوا تھا

تب تو ہرے ہرے کھیتوں میں تانگہ جاتا ہوا نظر بھی نہ آتا تھا۔ تب تو ہماری حویلی میں بڑی رونق ہوا کرتی تھی قیام پاکستان کے بعد اس گاؤں میں کئی رنگ کے پکھیرو آباد ہو گئے تھے بڑے لونگ اور ستواں ناک والی راجپوتنیاں، گول گول ریشوں والی کشمیرنیں چوڑے طباق والی مٹی رنگی جاٹ عورتیں، چکنی جلد پر نارنگی کے چھلکے ملنے والی مغل زادیاں، خوشامد سے دوسہری ہو جانے والی میراثنیں، بلی میں

صحن کا رنگ بدل دینے والی لکے زمین ماپ تول کی تکڑی کے باٹ جیسی زندگی بسر کرتی شیخانیاں، جلدی ڈھل جانے والی زرد زرد آرائیں استریاں کھلی بیسن سے نہائی دھوئی گجریاں چوڑے چھنکانے اور طعنے دینے والی مسلنیں ۔۔۔۔۔ ماں زندہ تھی تو چندراں کا گاؤں اور پھر ہماری حویلی کچھ اور ہی چیز تھی۔

سارے درخت ہرے بھرے تھے سب کھیت لہلہاتے تھے۔ ہر کنوئیں میں میٹھا پانی تھا ہر کسان کے گھر میں دانے تھے اب سارے میں کلر ہی کلر تھا موت ہی موت تھی۔ اور ماں کہیں بھی نہیں تھی۔

جب میری ماں زندہ تھی تو حویلی کے آنگن میں ہر سمے میلے کی سی کیفیت رہتی دو آرہی ہیں دو جا رہی ہیں میری ماں ان عورتوں میں نظر نہ آتی۔ پھر بھی اس کی وجہ سے میلہ لگا رہتا۔ وہ جہاں بیٹھی وہی جگہ آباد ہو گئی اور کچھ نہیں تو اس کی چارپائی تلے چیونٹیوں ہی راستہ بنا لیتیں۔ ماں عام طور پر حویلی میں کسی جگہ بھی نہ ہوتی تھی پر اس کے کیے ہوئے کام ہر جگہ اس کی گواہی دیتے کہیں چارہ کترا ہوا ملتا کہیں نارنگیوں کے چھلکے سوکھنے کے لیے پڑے ہوتے۔ سوتی کپڑوں کی رنگین کترنیں مکئی کے خالی تکلے گنوں کے چھلکے ۔۔۔۔ بادام کی زاہ کھلی ۔۔۔۔ ماں تھی تو آنگن آباد تھا۔ گاؤں زندہ تھا۔

اب ہماری حویلی کے تمام دروازے کھڑکیاں کھلی تھیں ۔۔۔۔ میں نے ابا کو آواز دی ۔۔۔۔ "ابا" ۔۔۔۔۔ اندر والے کمرے سے ایک کبڑا بوڑھا کچھ بچ بچ کرتا کچھ بھدتا میری طرف بڑھنے لگا۔

اس بڈھے گدھ کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے

آنگن کے سارے فرش کی کی اینٹیں کلر چاٹ گئی تھی اور اب جب ان پر پاؤں پڑتا تو پھک سے سفید ذرات اوپر کو اٹھتے تھے ٹوٹی ہوئی ربڑ کی ہوائی چپل میں جو شخص مجھے بھولتا اور بچ بچ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا جس کے سر کے تمام بال سفید تھے۔ اور

جبڑے کی ہڈیاں کسی ہوئی تھیں۔ یہ شخص میرا باپ تھا۔

چار سال سے میں نے کبھی اس کا پتہ نہیں لیا تھا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ زمین کلرزدہ ہوجانے پر اب وہ کیسے گزر بسر کرتا ہے۔

آنکھوں کا چشمہ ناک پر جماتے ہوئے وہ بڑھتا آ رہا تھا۔۔۔ "کون ہے کون ہے بھئی بولتے کیوں نہیں؟"

میں سوٹ کیس ہاتھ میں لیے کھڑا رہا۔ جو حویلی کے کئی طاق کھلے تھے کئی دروازے ہوا میں جھول رہے تھے۔۔۔ ہوا میں ایسا نمک تھا جو پسینے والے بدن سے چپک کر خارش میں بدل جاتا ہے۔

"کون ہے بھئی۔" ابا نے پاس آ کر کہا۔

پھر اور قریب آ کر اس نے بازو پھیلائے۔ لمحہ بھر کو بازو پھیلے رہے پھر شرمندہ ہو کر اس اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ لیا اور بولا۔۔۔ "آؤ قیوم آؤ کھڑے کیوں ہو۔"

ہم دونوں چپ چاپ اس تخت پوش پہ بیٹھ گئے جس پر بیٹھ کر کبھی اماں سارے گاؤں میں حکم چلایا کرتی تھی

"ابا۔۔۔ بھائی مختار نے کہا ہے۔"

"کس نے؟"

وہ اونچا سننے لگا تھا

"بھائی مختار نے کہا ہے۔۔۔ کہ اب تو چورا چھوڑ دے میں تجھے لینے آیا ہوں۔"

"آ میرے ساتھ۔۔۔ آ۔۔۔ ذرا۔۔۔"

میں ابا کے ساتھ چلنے لگا وہ مجھے ساری حویلی میں لیے پھرا۔۔۔ گھر کی حالت سوختہ تھی، کہیں رنگین پائے کا پلنگ آخری دموں پر تھا، کہیں جستی ٹرنک کلر میں ڈوبے

تھے۔۔۔۔ساری حویلی آسیب زدہ تھی وہ گھوم پھر کر میرے ساتھ باہر آ گیا اور پھر تخت پوش پر بیٹھ کر بولا۔۔۔۔"دیکھتا نہیں تیری ماں کی کتنی نشانیاں ہیں یہاں۔۔۔۔ کس کس کو چھوڑ کر جاؤں؟"

میں چپ ہو گیا۔

"ابا بھائی مختار سندھا کلاں میں رہتے ہیں۔"

"رہے جم جم جی صدقے۔"

"بھی صولت نے بھی ہاتھ جوڑ کر کہا۔۔۔۔ ہے۔۔۔۔ تو میرے ساتھ تو چل ابا۔۔۔۔ میری پڑھائی کے بھی دو سال باقی رہ گئے ہیں۔"

وہ کھسیانے لگا مدافعت کے طور پر۔۔۔۔ شرمندگی کے احساس تلے وہ اس وقت مجھے اپنا باپ نہیں بلکہ ایک چھوٹا سا جانور لگ رہا تھا۔۔۔۔ معصوم جانور جس نے سونے کے فریم کی عینک پہن رکھی تھی۔

"تو نہیں سمجھتا ناں۔۔۔۔ یہاں وہ اور میں باتیں کرتے رہتے ہیں سارا دن وہاں شاید شہر میں وہ میرے ساتھ جانا پسند نہ کرے۔"

میں نے غور سے ابا کی طرف دیکھا۔

جب ماں زندہ تھی تو ہم نے ان دونوں کو کبھی باتیں کرتے نہیں دیکھا تھا لیکن جب ماں مر گئی تو پھر ابا اس کے شیشے لگے بڑے پلنگ پر لیٹ کر پہروں منہ میں باتیں کرتا نظر آتا۔ اماں کے ہوتے ہوئے ابا ہمیشہ کھیتوں پر رہتا تھا اندر صحن میں رنگ رنگ کی عورتوں کا میلہ دیکھ کر گھر لوٹنے پر بھی وہ حویلی کے باہر ہی موڑھا منگوا لیتا۔ لیکن اس کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ امریکہ کا پریذیڈنٹ ہو۔ اس کے حقے کی نے موڑھے کی بناوٹ اور نشست وہاں سے صاف نظر آتی جہاں صحن کے اندر ماں کا تخت بچھا ہوتا۔ دونوں میں شاید کوئی پیغام جاری رہتے ہوں اس کا ہمیں علم نہ تھا۔

ماں کے مرنے کے بعد حویلی دم چھوڑ گئی ۔۔۔۔ میلہ ٹوٹ گیا ۔۔۔ گاؤں کے اردگرد تو بہت پہلے سے سیم نالہ بہتا تھا اور زمین شور زدہ ہو رہی تھی لیکن اب ابا بھی پڑا رہا آہستہ آہستہ ہماری زمینوں پر بھی کلر رینگنے لگا ابا کی آواز میں خوف پیدا ہو گیا۔ اس کے بازوؤں پر جھریاں نظر آنے لگیں۔ اب ابا جھکتا تو کھڑے ہونے سے پہلے کمر پر ہاتھ رکھ لیتا۔ اس کی آنکھوں میں اب تیل والے خشک چراغ جیسی کیفیت تھی۔ جیسے کبھی جلتا تھا لیکن اب صرف گیلا رہتا ہو۔ دسویں جماعت میں نے قصور میں ماموں کے پاس رہ کر پاس کی۔ اس وقت تک مختار بھائی لاہور میں ملازم ہو گئے تھے ان کی بیوہ اور بڑا بیٹا سانده کلاں میں کرائے کا مکان لے کر رہنے لگے تھے میں نے باقی تعلیم ہوسٹل میں رہ کر مکمل کی۔ لیکن ساری چھٹیاں میں ماموں کے پاس قصور میں گزارتا تھا۔ مجھے کبھی چندرا جانے کا خیال نہیں آیا ۔۔۔۔ میں اماں کے بغیر چندرا کا تصور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ابا سے ملنے کو جی چاہتا۔ لیکن ہم دونوں بھائی ہمیشہ سے ابا سے دور دور رہے میرے ذہن میں ابا سانڈل کا سانڈ تھا جس کا جسم لس لس کرتا ہے، جو کھیتوں میں کھڑا چرتا ہے بے ضرر لگتا ہے لیکن کوئی کسان اسے کھیت سے نکالنے کی جرات نہیں کرتا۔ پاس جانے پر آمادہ بھی نہیں ہوتا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے گاؤں کو کلر نگل رہا ہے۔ لیکن میں کلر کھائے گاؤں کو کبھی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہتا تھا ۔۔۔۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ ایک کلر ایسا بھی ہوتا ہے جو سانڈل بار کے سانڈ کو بھی کھا جاتا ہے۔

"دیکھو قیوم ۔۔۔ یہ میرا گھر ہے ۔۔۔ میرا ۔۔۔ اگر میں اسے چھوڑ گیا تو گاؤں والے کیا کہیں گے۔"

میں پلٹ کر اپنے باپ کو دیکھا۔ وہ کسان نہیں تھا۔ سانڈل بار کا سانڈ نہیں تھا۔ وہ صرف راج گدھ جو ایک مری ہوئی عورت کے لاحاصل تصور میں اپنی زندگی کی ڈوری لٹکائے بیٹھا تھا

میرا باپ دیوانہ ہو چکا تھا۔۔۔۔اس کی آنکھوں میں کلر نے چھپڑ کاڑ کر رکھا تھا۔

"ابا یہاں اکیلا مت رہ ناں۔۔۔۔وہاں ہم دونوں ہیں تیری خدمت کریں گے۔۔۔۔چل ناں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ایک تھا بڈھے کی مجروح ہنسی۔

"اور اس کی قبر کو کلر کے حوالے کر دوں؟۔۔۔۔یہاں تو روز قبر دیکھنے نہ جاؤں تو چوتھے دن قبر کا منہ پھٹ جاتا ہے۔"

"ابا۔۔۔۔یہاں بڑی مشکل ہے وہاں۔"

ابا نے حویلی پر نظر دوڑائی اور بولا۔۔۔۔"یہاں وہاں کچھ نہیں بیٹے۔۔۔۔مجھے جسم کا آرام نہیں چاہیے۔۔۔۔یہاں میری روح خوش ہے وہ اسی گھر میں آئی تھی۔ یہیں سے اس کا جنازہ نکلا۔۔۔۔اوئے احمق مجھے مرد ہو کر اتنی توفیق نہیں کہ میں اس کے مرنے کے بعد اس کے گھر خیال رکھوں؟۔۔۔۔اس نے تو ساری عمر میرے گھر کی اینٹ اینٹ سے پیار کیا۔"

میں ساری دوپہر ابا کے پاس چپ بیٹھا رہا دھوپ ڈھلنے کے وقت میں لے سوٹ کیس اٹھایا اور سٹیشن کی طرف چلنے لگا۔

آخری بار اس جگہ کھڑے ہو کر میں نے اندر نظر ڈالی جہاں جوانی میں ابا کا مونڈھا ہوتا تھا

سارا صحن خالی تھا

تین طرف بنے ہوئے کمروں کے کچھ دروازے کھلے کچھ بند تھے۔لیکن سب کا پلستر کلر کی ہوا چاٹ گئی تھی۔۔۔۔جہاں ماں کا تخت پوش اینٹوں کے پایوں پر پڑا تھا اس کے نیچے دو دو انچ شور کھڑا تھا۔۔۔۔سارے آنگن میں نوکیلی جھاڑیاں اگ آئی تھیں نہ کہیں اناج تھا نہ پانی۔۔۔۔نارنگیوں کے کٹے ہوئے چاند، سوکھے ہوئے گنوں کا انبار، چارپائیاں گھڑونچی۔۔۔۔چارہ کاٹنے والی مشین اماں کی پیڑھی

بکریاں۔۔۔ مدیدی بلیاں۔۔۔ چھوٹے چھوٹے لڑکے۔۔۔ مینھڈیاں کروانے والی تیل میں سنے ماتھے نکالے لڑکیاں۔

چولہا۔۔۔ دھواں۔۔۔ اماں کے پیچھے۔۔۔ اناج تولنے والا ترازو۔۔۔ تو شکیں اور رات میں نگندے ڈالنے والی عورتیں

وہ سارا کاروبار۔۔۔ وہ ساری زندگی کہاں گئی؟ کیا کلر صرف ماں کے جانے کا منتظر کر رہا تھا۔

جب میں گلی میں کافی دور نکل گیا تو میں نے پلٹ کر ایک بار پھر حویلی کی طرف نظر کی۔

ابا اوپر ممٹی پر کھڑا تھا۔۔۔ اس کے دونوں بازو آگے کو بڑھے ہوئے تھے۔

راجہ گدھ۔۔۔ عمارت کی آخری اونچائی پر مالیخولیا کی لپیٹ میں کھڑا تھا۔

میں نے دل میں سوچا جب بھی روح لاحاصل محبت کرتی ہے یہ دیوانے اپن سے کیوں ہمکنار ہو جاتی ہے؟

کیا روح ہمیشہ لاحاصل راستوں پر جانا پسند کرتی ہے۔

کیا اس کے پاس دیوانگی کے علاوہ اور کوئی پناہ نہیں۔۔۔؟ کوئی پناہ نہیں؟

سٹیشن کے سامنے ٹیکے پر سے سامان اتارتے ہوئے غریب کوچوان نے شرمساری سے کہا۔۔۔ ”قیوم بھائی آپ بہت دیر بعد گاؤں آئے ہیں۔“

میں نے اسے پہچاننے کے لیے غور سے دیکھا۔

”میں عزیز گاتن کا چاچا ہوں فضل کریم۔“

”عزیز گاتن؟“

”ہاں عزیز گاتن۔“

میں نے فضل کریم کو جپھی ڈالی وہ میرے گرمجوشی سے واضح طور پر متاثر ہو گیا۔

غالباً پینٹ سوٹ والے سے اس کا یہ پہلا معانقہ تھا۔

"عزیز گاتن کا کچھ پتہ چلا؟"

"کہاں جی ۔۔۔۔ وہ تو پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا اچانک؟"

فضل کریم مجھے سلام کر کے بڑے مودب طریقے سے واپس چلا گیا۔ میں پلیٹ فارم پر اکیلا مسافر تھا۔ جب تک گاڑی نہیں آئی میں اپنے اکلوتے سوٹ کیس پر ہاتھ رکھے سوچتا رہا۔

عزیز گاتن، پھجا، ہملی شاہ، سب کہاں گئے؟ ۔۔۔۔ گاؤں میں پہنچ کر میں نے ان میں سے کسی کو بھی تو یاد نہیں کیا؟

ہم نے کئی سال اکٹھے شیانا پو کھیلا تھا ۔۔۔۔ کوئلے سے دیواروں پر لکیریں کھینچی تھیں۔ گاؤں کی ہر چھوٹی بڑی پگڈنڈی اور بڑے چھوٹے درخت پر ساتھ رہے تھے۔

یہ وقت کیا کرتا رہتا ہے

یہ وقت ۔۔۔۔ آخر چاہتا کیا ہے؟

عزیز گاتن؟ ۔۔۔۔ فضل کریم کا بھتیجا ۔۔۔ عزیز گاتن؟

وہ قصیر رتھا۔ گاؤں کے بڑے پیپل تلے اس کی ماں تندور تپایا کرتی تھی۔ سردیوں کے موسم میں سہ پہر کے وقت روٹیاں لگانے سے بہت پہلے جب وہ مچھیوں کا بن جلا کر تندور کو ابتدائی سینک دیتی تو گاؤں کی لڑکیاں لڑکے اس سے دانے بھنوانے آیا کرتے، میں بھی دو چار بھٹوں کے دانے اتار کر چھابے میں ڈالتا اور ماسی اقفت کے تندور پر پہنچ جاتا۔

عزیز گاتن سے میری بچپن کی دوستی تھی۔ وہ ناٹے قد کا چوڑا چکلا لڑکا تھا اس کے سر پر ہمیشہ استرا پھرا ہوتا۔ جو اکنی دوانی اس کی ماں اسے خرچنے کے لیے وہ اپنے کان کے اندر والے کٹاؤ میں پھنسا کر رکھتا۔ اس کی قمیض کو کبھی بٹن نصیب نہ

ہوئے۔ اسی لیے سیاہ گانی والا تعویذ ذرا سا جھکنے پر آگے کو جھولنے لگتا۔ وہ ایک پاؤں کا پنجہ اندر کو ڈال کر چلتا تھا۔ اسی لیے رات کے وقت اس کی چال میں تھوڑا سا چھلیدا پن پیدا ہو جاتا۔

عزیز ے گاتن کا اوپر والا ہونٹ پیدائشی کٹا ہوا تھا۔۔۔۔ اسی لیے وہ ہمیشہ ہنستا دکھائی دیتا۔ لیکن میں تو عزیز گاتن کو بچپن سے جانتا ہوں وہ چھوٹی عمر سے غلیظ باتیں سننے کا عادی ہو گیا تھا۔ پرانے بھٹے کے پاس جہاں مائی توبتے کی جھونپڑی تھی۔۔۔۔ وہاں مجھے اور آملی کو لے جا کر وہ ایسی ایسی گالیاں سکھاتا کہ ان کے معنی نہ سمجھتے ہوئے بھی ہم دونوں کے کان جلنے لگتے۔

شاید عزیز گاتن ہنستا نہیں تھا بچپن سے اسے اپنی ماں کے متعلق باتیں سننی پڑی تھیں۔ جب کبھی اس کی ماں کے متعلق گفتگو ہوتی۔ لوگ اچانک ہی بہت بے پروا منہ زور، ننگے اور جنسی ہو جاتے کسی کو خیال بھی نہ رہتا کہ عزیز گاتن سن رہا ہے وہ چوکنے جانور کی طرح ادھر ادھر دیکھتا رہتا۔ ایسے میں اس کے کان میں پھنسی ہوئی اکنی چونی بہت چمکنے لگتی۔۔۔۔ پہلے وہ نظروں سے بھاگ جانے کی راہ تلاش کرتا لیکن راہ نہ پا کر کھڑا رہتا۔۔۔۔ یوں لگتا جیسے وہ ہنس رہا ہے سب کے ساتھ۔۔۔۔ اپنی ماں پر۔۔۔۔ ماسی الفت کی ننگی حرکتوں پر۔

شاید اس کی پیدائشی بے بسی تھی جو ہنستی رہتی تھی۔ شاید اوپر والا کٹا ہوا ہونٹ اسے مصنوعی ہنسی ہنسنے میں مدد دیتا تھا!

ماسی الفت موہنجوداڑو کے زمانے کی پکی تھی۔ اس کا رنگ بھٹی میں پکی ہوئی سرخ اینٹ جیسا تھا ہاتھ روٹیاں گھڑنے میں جتنے تیز تھے اتنے ہی چٹائی پر دھرے ہوئے اس کے بھاری کولہے سست تھے۔ وہ ہمیشہ چھینٹ کی شلوار اور ململ کا سیاہ کرتا پہنتی تھی شاید تھنوں کا اسے کبھی خیال نہیں آیا کیونکہ جب کبھی وہ رفیدے پر روٹی ڈال کر تنور کے اندر جھکتی تو گلے سے رسنے والا پسینہ اندر جذب ہوتے ہوئے پیروں پر گرتا

نظر آتا۔ میں نویں جماعت میں تھا۔ جب مجھے احساس ہوا کہ ماسی اکفت بڑی شے ہے وہ سر پر بھاری کھیس ڈالے روٹیاں نکالنے والی سیخ پکڑتی سے تندوری میں ڈالتی۔ ایسے میں اس کے ست کو لہے کئی زاویے بناتے جب کبھی وہ مجھے چوری چوری اپنی طرف دیکھتا پالیتی تو سادگی سے ہنس دیتی۔ "لے لو۔۔۔۔۔ اب تو حویلی والوں کا قیوم بھی جوان ہو گیا۔"

ماسی اکفت کی بہت بکری تھی۔۔۔۔۔ اپنی بھی اور روٹیوں کی بھی اس کے گاہک روٹیوں کی قیمت علیحدہ چکاتے تھے اور اس کے لیے الگ نذرانے لاتے تھے لیکن سنا ہے وہ سارا مال جوڑتی رہتی تھی عزیز گاتن کے لیے۔

لیکن یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب چندراں کے باہر سیم نالہ دور سے نکلا کرتا تھا اور گاؤں کی صرف باہر والی زمینیں سیم سے متاثر ہوئی تھیں۔ چندرا سے کچھ دور شورہ دلدل اور پھٹے ہوئے کھیت تھے۔ لیکن گاؤں کے ساری طرف لہلہاتے کھیت تھے۔ لیکن گاؤں کے ساری طرف لہلہاتے کھیت تھے۔ جھڑ بیریوں کو بیر لگتے، نیم کی نمکولیوں سے آنگن بھر جاتے تھے اور سیاہ تنے والے کیکروں پر پیلے پیلے پھول اگتے ابھی چندرا میں بر سیم کے کھیت اتنے گھنے تھے کہ عزیز گاتن گن چوستا اس میں جاتا دھوتی کھولتا اور دوبارہ باندھ لیتا کسی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ کیا ہوا ہے اور کیوں ہوا ہے۔؟

آج اگر عزیز گاتن چندرا میں ہوتا تو کیا میں اسے یسی کی محبت کے متعلق کچھ بتا سکتا؟ حالانکہ جب تک میں گاؤں میں رہا۔ ہماری آپس میں کوئی بھید نہ تھا۔ وہ سجراں، سیوں، ماکی، جھنتے کی محبت کو تو سمجھ سکتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن یسی کی محبت اسے اب سمجھ نہ آتی شاید میرے حالات سن کر وہ کہتا۔۔۔۔۔ "اچھا جب وہ تمہارے ساتھ سوتی ہے تو پھر تی کیا تکلیف ہے اور کیا چاہیے تمہیں۔"

اگر میں اسے گاؤں میں مل بھی لیتا تو اس کو اپنی محبت کے متعلق کچھ سمجھ نہ سکتا ایک

محبت جو جبلی تقاضوں کی آسودگی کے باوجود آسودہ رہتی ہے جس میں ہر وصل میں ہجر کا مزا ہوتا ہے جس میں ہاتھ ضرور پڑ جاتا ہے لیکن ایسے ہی جیسے بس میں آدمی ہینڈل کو پکڑ کر سوار ہو جائے اور اندر نہ گھس سکے۔

دیوانگی کی سرحدوں کو چھونے والی محبت کا کچا چٹھہ میں عزیز گاتن کو کیسے سمجھ سکتا۔۔۔۔

لیکن چاچا فضل کریم کا عزیز گاتن تھا کہاں

ماسی الفت کی آنکھ کا تارا جانے کہاں چھپ گیا تھا؟ گاؤں سے اچانک غائب ہو جانے کی بھی عجیب داستان تھی۔

اس روز عزیز گاتن حویلی میں داخل ہوا تو اس کے کان میں دس پیسے کا سکہ چمک رہا تھا اس نے کھدر کی قمیض پہن رکھی تھی اور قمیض کی جھولی اس طرح اٹھا رکھی تھی کہ چارخانے والی تہمد کے ڈب اور ناف صاف نظر آتی تھی

"اوئے قیوم۔۔۔۔" اس نے حویلی میں داخل ہو کر آواز دی

کئی عورتوں نے انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا ماسی الفت اور عزیز گاتن سارے گاؤں کے لیے تفریح کا باعث تھے۔ پھر اس نے اماں کے تخت پر جھولی کھول کر کچے پکے پیلو ڈھیر کر دیے ہم دونوں کچے پکے پیلو علیحدہ کرنے میں مصروف تھے کہ چاچا غدم رسول اندر سے نکلا۔

چاچا غدم رسول ابا کا کچھ ہتاں سا رشتہ دار تھا کیونکہ اماں اس سے کا نا پردہ کرتی تھی جس وقت چاچا آنگن میں آتا۔ اماں کی ساری کلب منتشر ہو جاتی۔ لونگ والی چوڑے والیاں، چھاج چھٹکتی، مسالہ پیستی، آٹا گوندھتی مخلوق میں زلزلہ سا آ جاتا، جیسے اچانک فائرنگ کر چڑیاں اڑ جاتی تھیں۔ ایسے ہی ترنت عورتیں چلنے لگتیں۔ لڑکیاں سروں پر آنچل کر لیتیں اور جوان عورتوں کو اپنی چادریں یاد آ جاتیں

چاچا غدم اشتہاری مجرم جیسا اشتہاری عاشق تھا شروع شروع میں پونے سات

معشوقے چندرا میں بھی دھڑلے کے ہوئے لیکن دوکان کی مشہوری سے بہت پہلے بات پھیل گئی کہ سارا سودا ناکارہ ہے۔ آنگن میں پہنچ کر عموماً چاچا غلام اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتا کان کی میل نکالتا۔ کسی چھوٹے بچے کو شیشہ پکڑا کر مونچھوں کے بال تراشتا۔ جو بھی باورچی خانے میں موجود ہوتی اس سے باسی روٹی اور مکھن مانگ کر کھاتا اور پھر ڈل نری کی جوتی میں سے لٹھے کی شلوار جیسی شراق شراق آواز نکالتا، وہ کبھی آنگن میں یہاں جاتا کبھی وہاں۔۔۔۔چاچا بڑا اعکتی آدمی تھا اسے ہر لڑکی ہر عورت کی پرسنل ہسٹری معلوم تھی۔ کون سیدانی کس میراثی کے ساتھ کتنی دیر پھنسی رہی۔ کونسی شیخانی کا پانچواں بچہ حرامی تھا کس مغلانی نے اپنے مزارع کے بیٹے سے دوستی لگا رکھی ہے کون سی آرائیں گھر سے اودھل گئی تھی۔۔۔۔ایسے قصے اسے بڑی چٹ پٹی تفصیلوں کے ساتھ یاد تھے۔ ایسی کہانیوں کی وجہ سے جوان لڑکے اس کے پاس بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ وہ جوانوں کو محبت کرنے کے طریقے ایسے سکھاتا جیسے پہلوان اپنے پٹھوں کو داؤ پیچ ازبر کراتے ہیں

ابا نے ہمیں چاچا کی صحبت میں بیٹھنے کی سختی سے ممانعت کر رکھی تھی۔ اس کے باوجود جب وہ باتیں کیا کرتا ہم کسی نہ کسی بہانے وہیں منڈلایا کرتے۔۔۔۔باتیں کرتے کرتے وہ یکدم گھر سے نکل کھڑا ہوتا۔ دراصل جونہی کوئی لڑکی اس کی باتیں سن کر ہنستی ہوئی حویلی سے رخصت ہوتی۔۔۔۔چاچا غلام کو بھی کوئی بہت ضروری کام یاد آ جاتا۔

ابا کو چاچا غدم پسند نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ کئی سال ہمارے گھر رہا چاچا غدم کوئی کام نہیں کرتا تھا، لیکن بیگار لینا خوب جانتا تھا۔ ہم نے اسے کبھی ابا کے ساتھ کھیتوں پر جاتے نہیں دیکھا۔ وہ گھر کے کسی کام میں بھی دلچسپی نہ لیتا، لیکن کوئی ایسی بات ضرور تھی جس کی وجہ سے ابا اس سے دبکتا تھا۔

پتہ نہیں ابا نے چاچا غلام سے کوئی بڑی رقم پکڑی ہوئی تھی

پتہ نہیں ابا کا کوئی گہرا راز چاچا غلام کے پاس تھا

یا شاید وہ دونوں کسی جرم میں شریک رہے تھے؟

ہم چھوٹے تھے ہمیں اصلی وجہ معلوم نہ تھی۔ لیکن ہم دیکھتے کہ چاچا کی تھالی میں ہمیشہ بوٹیاں زیادہ ہوتیں۔ اسے ملائی مکھن اور پراٹھوں کے علاوہ مکھن میں تلے ہوئے انڈے بھی ناشتے پر ملتے۔ اس کی چارپائی پر کڑھے ہوئے تکیے کے غلاف رہتے جب بھی وہ کوئی فرمائش کر دیتا تو پھر اماں اور ابا اسے ضرور پوری کرتے۔ بو چاچا غلام کو پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس کا خیال بہت رکھتا تھا۔

عزیز گاتن اور میں صحن میں اماں کے تخت پوش پر پہلو علیحدہ کر رہے تھے کہ لٹھے کی دھوتی اور لیس لگا کرتا پہنے چاچا غلام اندر سے نکلا۔ چند منٹوں میں آنگن خالی ہو گیا۔ صرف باورچی خانے میں دو عورتیں ہماری طرف پشت کیے بیٹھی آٹا گوندھتی رہیں۔۔۔

عزیز گاتن اس روز بہت خوش تھا

"دنیا داراں دے گھر دیندا بیٹے ولی الٰہی۔ ولیاں دے گھر پیدا کردا میرے وانگ گناہی۔۔۔" زور زور سے عزیز یوسف زلیخاں گا رہا تھا کہ پیچھے سے آ کر چاچا غلام نے اس کی گدی میں دھول ماری۔ عزیز گاتن کی آنکھیں یکدم خوف سے کھلی ہو گئیں۔۔۔ اماں تو بتو سے بھی زیادہ ہم چاچا غلام سے ڈرتے تھے۔

"اوئے تیری ماں کو کچھ عقل ہے کہ نہیں؟۔۔۔ پلید کہیں کی۔"

عزیز گاتن مسکرانے لگا

جب بھی عزیز گاتن سنجیدہ ہو جاتا، ایسے لگتا کہ مسکرا رہا ہے کیونکہ اس کے اوپر والے ہونٹ میں پیدائشی شگاف تھا اور منہ سختی سے بند کرنے کی صورت میں وہ مسکراتا ہو نظر آتا۔

عزیز گاتن اپنی ماں کے متعلق بہت سی باتیں سننے کا عادی تھا اسی کو بیوہ ہوئے

چھ سال ہوئے تھے۔ وہ بالکل آزاد تھی اور اسے اپنی آزادی بڑی پیاری تھی۔ عزیز گاتن تو باتیں سن کر مسکرانے لگتا۔ لیکن میرے ہاتھوں میں پسینہ آجاتا۔

''اوئے بول تیری ماں ہے ناں اجڑ گنوار ناپاک''

گاتن چپ چاپ سنتا رہا۔

''سن رہا ہے میری بات بل بھتیا؟''

''جی۔''

پتہ نہیں کیوں میرا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔

''حرامی! اپنی فیشن کی ماری ہوئی ماں کو کہنا، پہلے جسم کی صفائی سیکھے۔۔۔۔ بتانا اسے جسم کے بال ناپاک ہوتے ہیں اسے میرا یقین نہ آئے تو جا کر ماجی سے پوچھ لے مجلس میں۔۔۔۔ ویسے تو اسے بڑے مسئلے آتے ہیں جسم کے بالوں کا مسئلہ نہیں اتا کو ڈوکو۔۔۔۔؟''

''اچھا جی کہہ دوں گا۔''

عزیز نے ہاتھ میں چنے ہوئے پیلو تخت پوش پر رکھ دیے۔ اس سے پہلے کئی بار میں نے اسے لوگوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھا تھا لوگ اس کے منہ پر اس کی ماں کو گالیاں دیتے، لیکن وہ کبھی چپ نہ ہوا تھا۔

پہلی بار بل بھتیا کے چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی۔

چاچا غلام نے مٹھی بھر کے پکے پیلو اٹھائے اور باورچی خانے کے ڈھارے کی جانب مڑ گیا۔ گاتن نے کچھ نہ کہا گلے کے تعویذ کو قمیص کے اندر کیا اور باہر چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد وہ خود ہی لوٹ آئے گا لیکن اس روز کے بعد سے کسی نے گاؤں میں نہیں دیکھا۔۔۔۔ کچھ دن ماسی الفت نے اس کی تلاش کی پھر ایک دن اس کی ماں نے گلا اپنے گاہکوں کو دھنوں دے دے کر جمع کیا تھا تندور کے دہانے پر مار کر توڑا اور بڑ کے درخت تلے سارے روپے اٹھنیاں چونیاں

دس پیسے نوٹ یوں پھینکنے جیسے عزیز گاتن کی برات پر سے سوٹ کر رہی ہو۔ وہ پیسے پھینکتی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی۔۔۔۔"اٹھا لو کتو۔۔۔۔اٹھا لو۔۔۔۔ میں نے عزیز گاتن پر وارے اٹھا لو۔۔۔۔۔"

اس شام میں پرانے بھٹے پر ہمسلی کے ساتھ غلیل لے کر شکار کے لیے گیا ہوا تھا جب شام پڑنے لگی اور ہم نے گھر لوٹنے کا ارادہ کیا تو میں نے دیکھا کہ چندر کی طرف سے ایک بڑا سا گدھ بھاگتا ہوا آیا اور سیم نالے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اس گدھ نے خاکی رنگ کے قمیص کی بکل مار رکھی تھی اور پیروں میں کچھ نہ تھا۔

پھر راجہ گدھ سیم نالے کے ساتھ گرتا پڑتا چلنے لگا۔ کبھی کبھی اس کے دونوں بازو آپی آپ آسمان کی طرف اٹھ جاتے اور پھر بغیر ٹھوکر کھائے گر جاتا۔۔۔۔ کچھ فاصلے تک میری نگاہوں نے اس راجہ گدھ کا تعاقب کیا اس کے بعد ماسی افت ہمیشہ کے لیے افق میں کھو گئی۔

اچانک ماسی افت اور عزیز گاتن کے غائب ہونے پر اور تو کچھ نہ ہوا، صرف چندرا گاؤں کے باہر پھیلنے والا کلر گاؤں کے اندر بڑھنے لگا ہر آندھی کے ساتھ ہر بارش کے ساتھ۔۔۔۔ ہر موسم میں اس رفتار تیز تر ہونے لگی۔ اونچے اونچے درخت ٹنڈ منڈ ہوئے۔۔۔۔ کھیتوں میں لہلہاتے سبزے کی جگہ دلدل، شور اور نمکین پانی کے جوہڑ بننے لگے۔ کنوئیں کھاری ہو گئے۔ ہتھی والے نلکوں کی نالوں پر قلمی شورا چڑھ گیا۔ گھروں کی دیواروں سے کلر جھڑنے لگا۔۔۔۔ فرش پھول گئے۔ چاگاٹیں ڈھیلی ہو گئیں۔ زنجیروں پر زنگ جھڑنے لگا۔ اور آدمیوں کے چہرے پرانے سکے جیسے گھسے ہوئے نظر آنے لگے۔

اب رفتہ رفتہ لوگ گاؤں چھوڑ کر جانے لگے۔۔۔۔ گھروں کے چولہے سرد پڑ گئے اور رستوں کی پھولی ہوئی مٹی پر جانور، چھکڑے، ریڑھے تانگے سامان سے لد لد کر جانے لگے۔ اب پیلو کا بور جھڑ جاتا۔ کیکر کے درختوں میں زرد پھول نہ آتے۔

جب میں ماموں کے پاس قصور گیا ہوں۔ اس سے کچھ پہلے سارے گاؤں میں کلر نے دھاوا بول دیا تھا۔

ٹرین ہوئی میں سوار ہو گیا چندرا کے پاس سے پرانے بھٹے کے عقب میں مانی توبہ توبہ کی جھگی سے لے کر اندر تک کلر کا سیلاب تھا۔ ساری زمین انڈے کی سفیدی جیسی پھینٹی ہوئی تھی جس وقت چندرا کی حد ختم ہوئی میں نے دیکھا وہ اونچے درختوں پر کئی گدھ بیٹھے تھے نیچے سیم نالے کے پاس ایک بھینس کا ڈھانچہ پڑا تھا۔

شام اتر رہی تھی۔ ہوا میں نمک تھا

پتہ نہیں مجھے کیوں لگا جیسے ایک درخت سے تیزی کے ساتھ ایک گدھ اترا اور ٹرین کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ اس گدھ کو غور سے دیکھنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ لیکن وہ گا رہا تھا۔ بھاگ رہا تھا۔ ٹرین کی آواز کے ساتھ آواز ملا کر بہر اونچے اونچے

صبح گیارہ بجے میری آنکھ کھلی تو ابھی تک میں چندراں میں تھا۔

دانت صاف کرتے ہوئے مجھے خیال آنے لگا کہ کسی نوکری پر لگنے سے پہلے مجھے ایک بات پھر چندراں جانا چاہیے شاید اماں کی قبر کسی نے پکی کروادی ہو۔ شاید کلر کی وجہ سے قبر پھٹ گئی ہو اور اماں کا ڈھانچہ چاندنی راتوں میں ڈراؤنا لگتا ہو۔ پتہ نہیں بھائی مختار چندرا جانے پر کبھی رضامند کیوں نہ ہوتے تھے۔۔۔ میں ابھی دل میں یہ پروگرام بنا ہی رہا تھا کہ کسی نے غسل خانے پر دستک دی عام طور پر اوپر آنے کا رواج کم تھا

"قیوم"۔۔۔۔ بھابھی صولت نے آواز آئی۔

میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا

"کہیں جا رہے ہو؟"۔

"جی ریڈیو سٹیشن جاؤں گا۔"

"اچھا؟ ۔۔۔۔۔" وہ پوچھنا چاہتی تھیں کہ مجھے وہاں کیا کام ہے لیکن میری ان کی بے تکلفی نہ تھی۔

"جی ۔۔۔ وہاں مجھے آج ایک سکرپٹ دینا ہے۔"

"سکرپٹ؟"

ریڈیو سٹیشن میں ان دنوں میرا ایک دوست پروڈیوسر لگا ہوا تھا ۔۔۔۔۔ وہ بچوں کا پروگرام پرڈیوس کرتا تھا۔ وہ مجھ سے عموماً معلوماتی سکرپٹ لکھوا لیتا۔

"ایک کہانی لکھی ہے بھابھی ٹیپو سلطان پر۔"

"اچھا ۔۔۔ یہ میری ڈرائی کلینرز کی چٹ ہے چار دوپٹے رنگنے کے لیے دیئے ہوئے ہیں، نولکھا بازار میں وہ لے آؤ گے نا؟"

"لے آؤں گا ۔۔۔۔ جی۔"

انہوں نے دس روپے کا نوٹ ڈرائی کلینرز کی رسید کے ساتھ میز پر رکھ دیا۔

"نوکری کا کچھ پتہ چلا؟"

"ابھی انٹرویو کے لیے طلب نہیں کیا۔"

"اچھا ۔۔۔" دوپٹے کھول کر دیکھ لینا کہیں ڈب وغیرہ نہ ہوں۔"

بھابھی صولت جس لاتعلقی سے آئی تھی ویسے ہی چلی گئیں۔ ان کا میرا بھابھی دیور کا رشتہ نہ تھا۔ چور سپاہی کی طرح ہم دونوں ایک دوسرے سے بھاگتے تھے۔

جونہی کسی سے اچانک کنارہ کشی ہوئی تھی۔ میں کبھی کبھی ریڈیو سٹیشن سعید کے پاس جا بیٹھتا۔ اس کے کمرے میں بڑی رونق ہوتی۔ افسر، ڈرامہ آرٹسٹ، مراثی، طوائفیں، اناؤنسر آتے جاتے رہتے۔ چھوٹے موٹے اخراجات پورے کرنے کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ سعید مجھ سے کبھی کبھی کوئی فیچر کوئی اناؤنسمنٹ کوئی کہانی لکھوا لیتا ۔۔۔ بھابھی یا بھائی کے آگے ہاتھ پھیلانے سے یہ بہتر طریقہ تھا۔ کیونکہ فی

حال میں ذہنی خواری سے ملتا۔ منت سماجت بھی کرنی پڑتی، لیکن میری آزادی میں کوئی خلل واقع نہ ہوتا۔

بھابھی کے دس روپے اور چیٹ اٹھا کر میں پیدل کرشن نگر تک پہنچا۔ وہاں سے میں نے سکرٹریٹ تک بس لی۔ چونکہ یہ بس مال پر نہ جاتی تھی اس لیے یہاں سے میں ریڈیو سٹیشن پیدل پہنچنے کا عزم کر کے مال پر چلنے لگا۔ بڑی دیر بعد مجھے پیدل چلنے میں عجیب قسم کی راحت محسوس ہوئی۔ چلنے کی مکینکل انرجی نے خیالات کی چھان پھٹک میں واضح طور پر مدد دی بڑے دنوں بعد مجھے اپنا وجود ایک نارمل صحت مند شہری کا لگا اس وقت میرا سایہ میرے بھائی مختار کے خود اعتماد سائے سے مشابہ تھا۔ سیمی کا عشق ضرور اپنی جگہ تھا لیکن ذمہ دار شہری کی طرح ان جذباتی مسائل کو سلجھانا میرے بس کی بات تھی۔ اس وقت مجھے کئی پلان سوجھے جس وقت میں جی پی او کے سامنے سے گزر رہا تھا تو چوک جی کے سامنے انتظار کرتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے مقابلے کے امتحان میں داخلہ لینا ہوگا۔ اس وقت یہ امتحان مجھے بہت آسان نظر آیا۔ اپنے وہ دو پروفیسر یاد آگئے جو بالکل نالائق تھے اور اس امتحان کو پاس کرنے کی وجہ سے آج کل اسلام آباد کے فیڈرل سکرٹریٹ میں بہت بڑے سفید کار عہدوں پر متعین تھے ریگل کے چوک تک پہنچتے پہنچتے میں بہت جاہ طلب ہو چکا تھا میری سوچ یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ میں سویڈن ہالینڈ یا سپین میں آپنے آپ کو ایمبیسی میں فسٹ سیکرٹری کے عہدے پر فائز دیکھ سکتا تھا۔ میری ڈاک پاکستان ایمبیسی کے تھیلے میں آ جا رہی تھی اور میں جینوا پیرس فرینک فرٹ ک ہوم سے پکچر پوسٹ کارڈ خرید خرید کر وطن بھیجنے میں مشغول تھا جس وقت میں واپڈا کی بلڈنگ کے پیچھے سے نکل کر فلیٹی ہوٹل والی سڑک پر نکلا کار میں بیٹھی ہر خوبصورت لڑکی مجھے اپنی بیوی نظر آئی اور بڑی کار پر اپنی ہونے کا شبہ ہونے لگا۔

ریڈیو سٹیشن سے پہلے چوک میں پہنچتے پہنچتے میں اپنے آپ کو جسمانی، ذہنی،

جذباتی طور پر صحت مند سمجھ رہا تھا اس وقت مجھے شبہ بھی نہ تھا کہ رجعہ گدھ کی جاتی سے کوئی بھی زیادہ دیر تک صحت مند نہیں رہ سکتا۔ پاگل پن اس پر Quantums میں بڑھتا رہتا ہے جب بھی وہ اپنے نیوکلس کے قریب ہوتا ہے اسے شبہ بھی نہیں گزرتا کہ غیر صحت مند عناصر اس پر اثر انداز ہو سکتے ہیں ذرا سا وہ نیوکلس سے ہٹتا ہے اور وہی سراسیمگی وہی دیوانگی ہی دشت نوردی صحرا پیائی جو اس کے اندرونی سفر کا حصہ ہے اس پر غالب آجاتی ہے

ریڈیو سٹیشن پہنچ کر حسب معمول میں سعید کے دفتر میں چلا گیا۔ وہ کچھ فلمی گیتوں کی ڈسکیں اٹھائے کھڑا تھا اور اس کے سامنے کرسی پر سیمی بیٹھی تھی۔۔۔ سیمی کے ساتھ والی کرسی پر حیدر تھا اور ان کے ساتھ پروفیسر سہیل چائے پینے میں مشغول تھے

"آؤ سر جی آؤ۔۔۔ آؤ آؤ۔۔۔ سعید نے پرتپاک لہجے میں کہا۔"

میں ہلکے سے اشارے سے سیمی کو سلام کیا

"آج تمہاری کہانی وہ یہ پڑھیں گی۔۔۔ سکرپٹ لکھ لائے ہو۔۔۔ پہلے مباحثہ ہوگا، پروفیسر سہیل اور حیدر صاحب کے درمیان پھر۔۔۔"

"ہاں۔"

"انہیں دے دو۔۔۔ ذرا ایک نظر اس پر ڈال لیں۔"

میں نے کہانی سیمی کے سپرد کر دی۔ اس نے اپنے چہرے سے گلابی چشمہ اتارا۔ پھر کرسی کی پشت سے لٹکے ہوئے تھیلے میں سے پڑھنے کی عینک نکالی اور کہانی پڑھنے لگی۔

وہ پہلے سے بہت زیادہ دبلی ہو گئی تھی۔۔۔ اس کی آنکھوں تلے گہرے سیاہ حلقے تھے اور ہونٹوں کا رنگ کاسنی نظر آتا تھا۔ ہاتھوں کی نسیں بہت ابھری ہوئی تھیں ور کہانی کا سکرپٹ پکڑتے وقت اس کا ہاتھ تھوڑا سا لرزا تھا۔

پتہ نہیں میری خوخ اعتمادی ساری کی ساری کہاں گئی۔

"میں ذرا سٹوڈیو کا چکر لگا آؤں ۔۔۔۔۔۔" سعید یہ کہہ کر باہر چلا گیا ۔۔۔۔اور پروفیسر سہیل لاتعلق سے چائے پیتے رہے انہوں نے مجھ سے کوئی بات ہی نہ کی،

جس وقت میں گھر پہنچا تو وہ پہلے سے میرے کمرے میں موجود تھی۔ اس نے بال دھو رکھے تھے اور پانی کی ننھی بوندیں اس کالی شال پر چمک رہی تھیں۔

'یہ وقت ہے گھر آنے کا'۔

میں نے ہنس کر کہا 'یہ وقت ہے سر دھونے کا اور وہ بھی سردیوں میں'۔

وہ یک ہی جملے سے سیدھی ہو گئی۔

کہاں رہے ہو سارا دن؟'

'پہلے ریڈیو سٹیشن گیا تھا۔ وہاں سے پروفیسر سہیل کے پاس چلا گیا'۔

'یہ مرجانا سہیل کون ہے اب؟'

'ہے ایک پڑھا لکھا آدمی بے حد پاکستان میں اس جیسا دوسرا کوئی نہیں'۔

'پڑھا لکھا ہی ہے نرا کہ آدمی بھی ہے؟'

میں اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں میں مشغول ہو گیا اور وہ چپ چاپ مونگ پھلیاں کھانے میں جت گئی۔ اچانک مجھے الماری میں ایک موم بتی نظر آ گئی۔ میں نے اس کاسنی رنگ کی موم بتی کو روشن کیا۔ اس کے سامنے کاسی رن کا گڈی کاغذ کتابوں کی مدد سے کھڑا کیا اور بجلی کا بٹن بند کر دیا۔

'ہائے یہ کیا اندھیرا کر دیا قیومی؟'

'دیکھو یہ کاسنی روشنی کتنی پیاری ہے عابدہ۔ اسی روشنی میں چائے پئیں گے'۔

اب وہ اپنے اور وحید کے بے مزہ واقعات بیان کرنے لگی۔

ایک روز وحید نے کیا کیا' ایک بیڈ اور لیمپ خرید کر لایا۔ کسی فلم میں دیکھا تھا اس نے کہ ہیرو بیڈ لیمپ جلا کر پڑھتا ہے۔ گھر آ کر اس نے ساری شام بیڈ لیمپ

فٹ کرنے میں لگ دی۔ تین سوئچ بدلے۔ دو بلب فیوز کیے۔ جب بیڈ لیمپ فٹ ہو گئی تو اس کی روشنی میں بیٹھ کر حساب کتاب دیکھنے لگا بد بخت کا چھوٹا سا چہرہ ہے اوپر سے رکھی ہوئی ہیں لمبی لمبی راجپوتی مونچھیں توبہ بیڈ لیمپ کے سامنے تو پورا اودھر لگتا تھا بیٹھا ہوا۔"

آج میں سیمی کے متعلق باتیں نہیں کرنا چاہتا تھا' لیکن میں نے صرف مدافعت کے طور پر کہا جب آفتاب لندن چلا گیا عابدہ تو سیمی پر حسد کا دورہ پڑ گیا۔ وہ سارا سارا دن ایسے خیالوں سے اپنے آپ کو لہولہان کرتی رہتی تھی جو آفتاب اور زیبا سے متعلق ہوتے آدمی کتنا اذیت پسند ہے۔"

جب آفتاب نے شادی ہی کر لی تھی تو پھر سیمی کو تم سے شادی کر لینی چاہیے تھی۔ میں خلاف ہوں ایسی باتوں کے۔"

"وہ شادی نہیں محبت کی آرزومند تھی۔"

"ہائے شادی کا محبت سے کیا تعلق کسی نکاح نامے پر کبھی تم نے دیکھا ہے محبت کا خانہ مجلّل اور غیر مجلّل کا تو ہوا ہاں خانہ۔"

"اگر شادی لائسنس بنتا تو تین قسم کے نکاح نامے ہوتے۔ سفید نکاح نامے ان لوگوں کے لیے جو دن رات ایک دوسرے کے قرب کی آرزو رکھتے ہیں۔ گلابی کارڈ دنیوی وجوہات والوں کے لیے مثلاً تنہائی سے بچنے کے لیے ماں باپ کی ناک بچانے کے لیے وغیرہ وغیرہ اور سبز کارڈ صرف ان کو دیا جاتا جو افزائش نسل کے لیے لائسنس چاہتے ہیں۔ صرف سبز کارڈ مستقل ہوتا' باقی سب کارڈ سال دو سال کے بعد renew کرانے پڑتے"۔

"لائسنس سب سفید رنگ کا بنواتے اور بچے سب کے ہو جاتے پھر نئے منہ یہی سوچ پر۔" وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔

میں شرمندہ سا ہو گیا۔ کاسنی گنڈی کاغذ موم بتی کر طرف جھک کر ہلکا سا جھلس گیا

تھا۔ لیکن کمرے کی روشنی اس وقت بڑی دل فریب تھی۔ میرا دماغ خودبخود دکھیل کی باتوں سے گونجنے لگا۔

"بھائی صاحب محبت نہیں ملتی کہیں بھی چاہے سفید کارڈ ہو اور چاہے گلابی دنیا میں تو گزارہ ہی کرنا پڑتا ہے اور گزارے کے لیے شادی اچھی ہے۔" اس نے مجھے مشورہ دیا۔

میں نے چائے کی پیالی اس کے ہاتھ سے لی اور قریباً اپنے آپ سے بولا۔

"تمہیں کیا پتہ عابدہ شکر کرو شکر تم سوچتی نہیں ہو۔ وجوہات تلاش نہیں کرتی ہو۔ معنی کی جستجو نہیں کرتی ہو ورنہ تمہیں بھی سورج کے اردگرد کئی غدف نظر آنے لگتے۔"

"اب کیا سوچ رہے ہو موم بتی بجھا دوں کہیں آگ نہ لگ جائے۔"

"لگ جانے دو آگ۔"

ایسے جملوں کا اس پر کوئی اثر نہ ہوتا وہ کند چھری سے حلال ہونے والی نہ تھی۔

"میں نے تو محبت کے متعلق کبھی زیادہ نہیں سوچا۔" عابدہ بولی۔

"اور میں اس کے علاوہ اور کسی چیز کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔"

"پھر کیا سوچا ہے تم نے آج تک؟"

"یہی کہ دولت اور محبت کی ایک سی سرشت ہے۔ دولت کبھی ان جانے میں چھپر پھاڑ کر ملتی ہے۔ کبھی وراثت کا روپ دھار کر ایسے ڈھب سے ملتی ہے کہ چھوٹی انگلی تک ہلانی نہیں ہوتی اور آدمی مالا مال ہو جاتا ہے۔ پھر اکلوتے لاڈلے کی طرح دولت کو اجاڑنے برباد کرنے میں مزہ ملتا ہے۔ کبھی پائی پائی جوڑتے رہنے پر بھی پورا روپیہ نہیں ہوتا۔ کبھی محبت اور دولت ملتی رہتی ہے لیکن سیری کی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ چادر پوری نہیں ہوتی تن پر کبھی محبت رشوت کے روپے کی طرح ڈھکی چھپی ملتی ہے لوگوں کو پتہ چل جائے تو بڑی تھڑی ہوتی ہے۔ کبھی

کاسے میں پڑنے والی اکنی دونی کی خاطر ساری عمر تیرا بھلا ہو کہنا پڑتا ہے۔ تجھے کیا پتہ عابدہ محبت اور دولت نے انسانی دل پر کیا کیا حکمرانی کی ہے۔ چاہتے تو سیلاب کی طرح بستی اجڑ جائے' ان کے ہاتھوں چاہتے تو بوند بھرہ برسے اور ریگستان کے اوپر سے گرجتی چمکتی چلی جائے ان سگی بہنوں سے تو جس قدر رابطہ کم ہو آرام ہے۔"

کاسنی کاغذ جھلس کر کالا ہو چکا ہے۔ عابدہ اٹھی اور سانس کی لمبی پھونک سے اس نے موم بتی بجھا دی۔ از سر نو بجلی کا بلب جلنے لگا۔

"قیوم تمہیں کسی دماغی ڈاکٹر سے ملنا چاہیے۔"

"کیوں؟"

"مجھے یوں لگتا ہے تمہارے سر کو گرمی ہو گئی ہے۔"

"تمہارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔"

"میری اماں ایک چٹنی بنایا کرتی تھیں۔ بادام کی گریاں چار مغز سونٹ۔ چھوٹی الائچی مصری ....."

"تم کچھ نہیں بنا سکتیں۔؟"

"میں کیا کر سکتی ہوں مجھے وہ نسخہ ہی نہیں آتا۔"

"میرے ایک دوست نے بتایا ہے کہ تم شکتی ہو تم مجھ زبل کو طاقت دے سکتی ہو۔"

"کیسے؟"

اس وقت تک مجھے علم نہ تھا کہ میں سہیل کی باتوں کو عابدہ سے دوہراؤں گا۔ مجھے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ عابدہ اور مجھ میں کوئی رابطہ ممکن بھی ہے؟

"مرد اور عورت کے درمیان آخر قسم کا لگاؤ ہوتا ہے اور ہر لگاؤ سے انسان کو ایک خاص قسم کی شکتی ملتی ہے۔"

وہ حیرانی سے میرا منہ تکنے لگی۔

"پہلا تعلق خیال کا ہے جب کسی کا خیال دماغ میں بس جاتا ہے اور نکالے نہیں نکلتا تو اسے سمرنا نام کہتے ہیں۔ جب اس تعلق کا ذکر کسی سے کریں تو یہ دوسری سٹیج ہے۔ جنس لطیف کی صحبت میں رہنا تیسرا تعلق ہے۔ عورتوں کے ساتھ ہنسی دل لگی چوتھی عورت سے دلی گفتگو کرنا پانچویں سٹیج ہے۔ اس کے بعد جسمانی تعلق کی آرزو چھٹی حالت ہے۔ اس آرزو کو ارادے سے پختہ کرنا ساتواں تعلق ہے اور آخری اور مکمل سیڑھی وہ ہے۔ جب شوجی اور شکتی ملتے ہیں اور ایسی روح کو جنم دیتے ہیں جو نہ مرد ہوتی ہے نہ عورت۔"

"ہائے ہائے کہیں باتیں کرنا بھی گناہ ہی نہ ہو" وہ کرسی سے اٹھی۔ چھلکے مونگ پھلی کا لفافہ ایک جھٹکے سے فرش پر گرا' میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی چادر پکڑی اور بولا "بیٹھ جاؤ" آرام سے مرد اور عورت جب سچے دل سے پریم بھگتی کرتے ہیں۔ تو پھر وہ گناہ نہیں کرتے بلکہ اپنی کنڈالنی کو آزاد کراتے ہیں۔"

"وہ بدبخت کیا چیز ہے؟"

عابدہ چپ چاپ بیٹھ گئی۔

"انسان کے جسم کا ایک حصہ نظر آتا ہے اور دوسرا حصہ نگاہوں سے اوجھل ہے ہمارے غدودی نظام کے ساتھ ساتھ طاقت کا ایک اور وجود بھی چلتا ہے' یہ وہ سرچشمہ طاقت ہے جو آدمی کی orative evergy کہلاتا ہے۔"

"یہ ساری باتیں تم کتابوں سے سیکھتے ہو؟"

"کچھ کتابوں سے کچھ تجاول خیالات سے۔"

"بند کر دو ان دونوں کو۔"

"کیوں؟"

"لادین ہو جاؤ گے دیوانے ہو جاؤ گے بچی۔"

وہ میرے سامنے لب سکیڑ کر بیٹھی تھی ایسے لگتا تھا جیسے وہ ابھی رونے لگے گی ' ہم

دونوں تھوڑی دیر خاموش رہے پھر وہ بولی یہ کنڈالنی چنڈالنی کون ہے؟"

" واقعی یہ کنڈالنی ہی چنڈالنی ہے یہ وہ سانپ ہے جو ہمارے مقعد اور عضو

تناسل کے درمیان استراحت کرتا ہے۔"

"ہائے میں مری۔"

'' یہی کنڈالنی کی قوت آہستہ آہستہ اوپر کو سر اٹھانے لگتی ہے پھر ایک چکر تک پہنچتی

ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اوپر اٹھتی جاتی ہے۔ حتی کہ ہمارے سر تک پھن اٹھا کر جا

پہنچتی ہے اس کو کنڈالنی کے سفر میں انسانی کی بقا یا فنا ہے وہ کس سطح تک پہنچتا

ہے اور کیوں پہنچتا ہے۔ یہ سب ارتقا کنڈالنی کی وجہ سے ہے۔"

" یہ چکر کیا ہے؟ تمہیں آج کیا ہو گیا ہے " وہ مجوب سی ہو کر میرے

پاس بیٹھ گئی۔

"پہلا چکر مقعد اور آلات تناسل کے درمیان ہے۔ اسے مولادھارا کہتے ہیں۔

اس کی چار سرخ پتیاں ہیں۔ اس کے درمیان میں ایک مربع زمین کی علامت ہے۔

اس مربع کے اندر ایک تکون ہے جس میں تمام psyclie energy بند ہے جسے

کنڈالنی کہتے ہیں۔ اس کنڈالنی نے سانپ کی مانند ریڑھ کی بنیاد پر چکر بنا رکھا اور

اس کنول جیسے چکر میں چمکتی ہے ' بجلیوں کی طرح روشن ہے جو شخص اس جگہ پر دھیان

لگاتا ہے وہ آرزو ' حسد ' غصہ پر قابو پا سکتا ہے۔"

تجھے تو کچھ ہو گیا ہے قیوی خدا کی قسم۔"

" اور کچھ نہیں تو بات ہی سن لو عابدہ۔" میں نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔ دراصل

مجھے سہیل نے اس قدر پمپ کر دیا تھا کہ میں ساری گیس کسی اور ذی روح پر نکالنا

چاہتا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا عابدہ میری باتیں سننے کی عادی نہیں۔ اگر وہ سن بھی

لے تو ان کا ادراک اس سے ممکن نہیں پھر بھی بولتا گیا۔

"سودھس تھا نہ دوسرا چکر ہے۔ اس کی چھ سرخ پنکھڑیاں ہیں۔ درمیان میں ایک سفید ہلال ہے اور پانی کے عنصر کی علامت ہے۔ یہ آلات تناسل کی جڑ میں ہوتا ہے اگر یہاں دھیان لگایا جائے تو انسان ostral worlds میں بسنے والوں سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔"

اب عابدہ مکمل طور پر مجھ سے علیحدہ ہو چکی تھی۔

"آج صبح میں ہسپتال گئی تھی' ڈاکٹرنی کہنے لگی۔ تم میں کوئی نقص نہیں۔ تم اپنے میاں کو لاؤ بتاؤ قیوم وحید مانے گا اس بات پر؟"

ہمیشہ کی طرح ہم دونوں الگ الگ پٹری پر چلنے لگے۔

"ناف کے پیچھے ایک سرخ نارنجی تکونی ہے۔ صاحب نظر لوگوں کو اس مقام کا رنگ گھمبیر بادلوں جیسا نظر آتا ہے۔ اس کے وسط میں نارنجی سرخ رنگ کا تکون ہے جس کے تینوں طرف سوستکا کا نشان ہے۔ یہ جگہ آگ کے عنصر سے مطابقت رکھتی ہے۔ اس جگہ کو منی پورا کہتے ہیں اور اس solar plaxus پر توجہ رکھنے سے انسان پر دوسرے لوگوں کی شعوری اور غیر گھمبیان آپی آپ کھلتی جاتی ہیں۔ اسی مقام پر دھیان لگانے والے جلتی آگ پر چلنے کی شکتی رکھتے ہیں۔"

"تم میری بات کیوں نہیں سنتے؟"

"تم بھی تو میری بات سنو ناں" میں نے ضد سے کہا۔

"تم کو تو کچھ کر دیا ہے اس چنڈال نسی نے۔"

"تم کو بھی کچھ ہو چکا ہے لیکن میں نہیں جانتا کرنے والا کون ہے؟"

"سنو قیومی!"

"سنو عابدہ! میں جستجو کی بات کر رہا ہوں اپنی جستجو اپنی بقا کی انسان کو تلاش ہے اپنی اپنے خدا کی۔"

"بقا تو صرف بچے میں ہے قیومی جن کے بچے نہیں وہ مر جاتے ہیں جن کے

سے بچے ہوتے جاتے ہیں وہ زنجیر میں پروتے جاتے ہیں ان کا نام رہتا ہے نسل رہتی ہے۔"

"تم صرف جسم کے بقا کی سوچتی ہو۔"

"جسم نہ ہوا تو روح کس مکان میں رہے گی ہمارا تو ہوتا ہی نہ لگا دکھ دفعہ کہا میں نے وحید سے کہ تم علاج کروا لوں پر مانے بھی وہ خبیث۔"

سنو عابدہ جب کنڈلنی چوتھے چکر میں پہنچتی ہے تو اسے اناہاتا کہتے ہیں۔ یہ دل کا کنول ہے۔ اس کا رنگ گہرا سرخ ہے۔ اس میں عارف نہ پر رہتے ہیں۔ اس کنول کے وسط میں دو تکون ہیں۔ اس میں ہماری ذات چراغ کے شعلے کی طرح رہتی ہے یہ شعلہ آبشاروں جیسی ہے یہاں شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ چاندی کی زنجیریں سرکی ہوئی بانسری گھنٹیاں بڑے بڑے ڈھمک اور مردنگ بجتے ہیں۔ کائنات کی صدا یہاں سے آسکتی ہے۔ ہوا کے عنصر پر اس کا مدار ہے۔ اگر آدمی یہاں دھیان لگائے تو اس میں کئی روپ دھارنے کی شکتی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ کائناتی محبت پانے والا بن جاتا ہے۔ اسی راستے پر وہ نروان بھی حاصل کر سکتا ہے۔"

"اور میں تم کو کیا بتا رہی ہوں۔؟ ڈاکٹرنی کہہ رہی تھی۔ دو تین معمولی ٹیسٹ ہیں۔ کوئی تکلیف بھی نہیں ہوگی لیکن وحید کو رضامند کون کرے گا میں بھی صولت سے کہوں؟ بتاؤ ناں؟"

مجھے وحید اور وحید سے جنم لینے والی اولاد میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"ریڑھ کی ہڈی کے راستے ہم پانچویں چکر پر پہنچتے ہیں۔ اسے وشودھا کہتے ہیں۔ یہ طاہر طیب پاک مقام ہے۔ یہاں سے ازلی علم حاصل ہوتا ہے۔ یہ گلے میں جہاں ریڑھ کی ہڈی دماغ سے ملتی ہے۔ واقع ہے۔ اس چکر کی روشنی پورے چاند جیسی ہے جو بھی thyrird glands پر توجہ دے وہ جوگیوں میں شہزادہ بن کر

رہے گا وہ عقل و دانش میں مقدس علم کا پاسبان ہو گا۔"

"اگر بالفرض وحید نہ مانے تو یہ بتاؤ مجھے طلاق لے لینا چاہیے ناں؟ اس کی وجہ سے میں بچے کے بغیر کیوں رہوں؟"

"عین دونوں ابروؤں کے وسط میں جہاں کائناتی مشاہدے کیلئے تیسری آنکھ ہے۔ یہاں چھٹا چکر ہے۔ سردیوں کے چاند جیسی روشنی سے منور یہاں دو بڑے بڑے پنکھ ہیں۔ جو سچائی کا مظہر ہیں۔ یہاں پر دھیان کرنے والے کو اس کے سچے گرو کی آواز آنے لگتی ہے۔"

جب پران جسم چھوڑتے ہیں تو اس جگہ دھیان لگانے والے کی روح پچھلے تمام جنم کے کرموں سے آزاد ہو کر خالق سے جا ملتی ہے' یہ وہی جگہ ہے جہاں pitutay gland ہے۔"

"تم کو سوائے اپنے کسی کی پروا ہے قیومی؟"

"نہیں۔"

"تم کیا سمجھتے ہو میں یہ تمہاری بکواس سن رہی ہوں؟"

"نہیں۔"

"پھر نعوذ باللہ کیوں ایسی بکواس کر رہے ہو۔"

"شاید کہیں سکون ہو تلاش ہے جستجو ہے شاید کہیں ان سوالوں کا جواب ملے جو میرے دل میں رات کے وقت آتش بازی کی طرح چھوٹتے ہیں۔"

"آیۃ الکرسی پڑھ کر سویا کرو ہر رات"

"آخری چکر کنول کا ایسا پھول ہے جس کی ایک ہزار پتیاں ہیں۔ یہاں شکتی و رشو کا ملن ہوتا ہے اجتماع ضدین ہوتا ہے۔ چاند سورج کا ملاپ' بجلی اور مقناطیس کا سنجوگ یہ سر کا قطبی حصہ ہے اور نچلے چھ کے چھ چکر اس کے تابع

ہیں یک رنگت شروع شروع میں زرد ہوتی ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ ہیرے جواہرات کی طرح چمکنے لگتی ہے جو شخص کنڈالنی کے اس مقام پر قابض ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے دو سو ہے دشمن پر قابو پالیتا ہے۔"

"دشمن کون؟"

"وقت اور موت! یہ دنوں پھر ایسے تنزک کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

اس وقت عابدہ پلنگ سے دوبارہ اٹھی۔ اس کی جھولی سے مونگ پھلیوں کے چھلکے خزاں کے پتوں کی طرح ایک بار پھر گرے اونچی قمیض تلے کاسنی شلوار کا پورا گھیر گنبد پر چڑھے غلاف کی طرح نظر آیا۔

"تم واقعی پاگل ہو گئے خدا قسم کیا بک رہے ہو۔"

"تم شکتی ہو شکتی عابدہ! تمہارے ملاپ سے مجھے اپنی روح کا نروان میرا اخذ اصل سکتا ہے میری لا انتہائی تلاش ختم ہو سکتی ہے' تمہاری آرزو کی تکمیل ہو سکتی ہے تم ماں بن سکتی ہو ماں۔" میں نے اسے لالچ دیا۔ پھر منت کے انداز میں مقدس گنبد پر ہاتھ رکھا پتہ نہیں عابدہ کیوں خاموش بیٹھ گئی۔

اس کی آنکھوں میں بڑی حیرانی تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا تم چاہتے ہو میرے بچہ ہو قیوم سچ؟ سچ؟ بتاؤ تمہیں ترس آ رہا ہے ناں مجھ پر۔"

شکتی اور شوا کا ملن میری کنڈالنی کو اپنے سفر پر روانہ کر سکا۔ میری کنڈالنی حسب عادت ناف سے کہیں نیچے بیٹھی رہی پھنکارتی رہی۔ ریڑھ کے سفر پر ماڑو کے پہاڑ پر چڑھنے سے اس نے انکار کر دیا۔ لیکن بیکار جستجو کا ایک دروازہ کھول کر میں نے پیچھے سے ٹنڈ منڈ درخت کو سردیوں کی تیخ ہواؤں کے سپرد کر دیا۔ دیوانگی کی ایک اور سمت مجھ پر کھل گئی۔

اس سے پہلے عابدہ اپنے شوہر کی گفتگو کرتی رہتی تھی مجھے کسی کے واقعات کے ان دیے کا جنون تھا۔ میں وقت اور موت کو گفتگو میں بند کر کے گھڑی پیچھے کی طرف چلانا چاہتا تھا۔ ہم دونوں کا نقطہ اتصال کوئی نہ تھا شاید ہم دونوں ایک دوسرے سے ہمدردی چاہتے تھے۔ لیکن اس روز کے بعد ہماری گفتگو ہمیشہ شارٹ سرکٹ ہو جاتی۔ اب ہم میں ہمدردی تو کیا ایک دوسرے سے نگاہیں چار کر کے خدا حافظ کہنے کی ہمت بھی باقی نہ رہی تھی۔

کنول کی باتوں سے قطع نظر اپنی بے چینی اور لایعنی جستجو کے علاوہ ایک اور وجہ بھی تھی جس نے مجھے عابدہ سے رابطہ قائم کرنے پر مجبور کیا۔ مرد کے جنسی سیلز کے اندر جو تنوع موجود ہے اس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کم کھجل ہوتا ہے۔ اس کے صنفی تخم کے اندر X اور Y کا جو تضاد موجود ہے۔ اس کی وجہ سے جنس کے معاملے میں وہ عورت کی طرح یک طرفہ ورشنت نہیں رہ سکتا۔ اس کے جنسی سیل سے چونکہ لڑکے اور لڑکی کا متفرق تعین ہوتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے جنسی فعل میں بھی کبھی یک رخا نہیں بن سکتا۔ ہمیشہ دو شاخے کی طرح کٹ جاتا ہے۔

جنس کے راستے پر عورت کبھی خوار نہیں ہوتی۔ وہ ہمیشہ محبت حاصل کرنے کے لیے آتی ہے اور بچہ حاصل کر کے واپس چلی جاتی ہے۔ مرد اپنے آپ سے آزاد ہونے کے لیے عورت سے ہمکنار ہوتا ہے اور ہمیشہ کے لیے دو حصوں میں بٹ جاتا ہے X یا Y بیٹا یا بیٹی ذات یا خدا فنا یا بقا اپنی بقا کی کوشش میں کئی بار وہ اپنی فنا سے بغلگیر ہو جاتا ہے۔ اسی جنسی جرثومہ کے تنوع کے باعث کبھی کبھی لا تعلق حالت میں بھی وہ تعلق پیدا کرنے پر مجبور ہوتا ہے کیونکہ اس کے صنفی تخم کے اندر مرد اور عورت دونوں موجود ہوتے ہیں۔ اسی لیے کبھی تو وہ جغرافیائی قرب کے باعث عورت سے رابطہ قائم کیے بغیر رہ نہیں سکتا کبھی وہ موسموں کی رومانیت کا شکار ہو جاتا ہے۔ کبھی وافر وقت کا بہتر مصرف نہ پا کر کسی نہ کسی کے

قدموں میں جا گرتا ہے کبھی اس کے جرثومہ کا مرد اسے عورت کی طرف کھینچتا ہے کبھی اسی جرثومہ کا مرد اسے عورت کی طرف کھینچتا ہے کبھی اسی جرثومہ کی عورت اپنی ہم جنس کی تلاش میں نکلتی ہے۔ کیونکہ اس کے صنفی تخم کے اندر سائیکی کے دو مختلف روپ رہتے ہیں۔

مرد کا روپ عورت کا روپ یہی تنوع ہمیشہ کی جستجو کا باعث بنتا ہے

اسی جستجو نے مجھے عابدہ پر شبخون مارنے کے لیے اکسایا۔

پہلے عابدہ کچھ اور تھی اس واقعے کے بعد اس نے مونگ پھلیاں کھانی چھوڑ دیں اور اٹک اٹک کر باتیں کرنے لگی۔ شاید وہ اس نے رابطے کو گناہ سمجھتی تھی۔ لیکن ہم کرگس جاتی کے لوگوں پر مردہ تعلقات احساس جرم پیدا نہیں کر سکتے۔ عابدہ جو شکتی روپ تھی۔ اس کے مدپ سے مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ جسم روح کو دغا دینے کے لیے کئی بھیس بدلتا ہے۔ وقتی طور پر کبھی کبھی جسم کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن روح کو ہمیشہ کے لیے جل دینا ممکن نہیں۔ روح کو محبت صرف اس وقت ہوتی ہے جب دو انسانوں کی سائیکی ایک دوسرے کی تلاش میں نکلتی ہے۔ ایسی صورت میں نہ وصل میں بوریت ہوتی ہے نہ ہجر میں اشتیاق بڑھتا ہے۔ سائیکی کی محبت بھوک کی جنسی کشش کی جبلت سے مشابہ نہیں ہوتی کہ سیر ہونے پر مونگ پھلی کے چھلکوں کی طرح محبوب بھی بیکار ہو جائے۔ وہ تو بھاری گھمبیر بادلوں کو اڑانے والی ہوا ہوتی ہے۔ جو جسم کا بوجھ ساری عمر اٹھائے لیے پھرتی ہے۔ جسم اور بادل کثیف ہوتے ہیں۔ محبت اور ہوا نظر نہیں آتیں۔ لیکن ان کا لطیف بہاؤ سمت بدلتا اور رفتار مقرر کرتا ہے۔ ہر قسم کی شدت تندی طاقت کو ان میں جنم دیتا ہے۔

محبت اور ہوا غضبناک ہو کر چاہے کیسی بھی تندی کیوں نہ اختیار کر لیں۔ لیکن جسم اور بادل کی طرح کثیف نہیں ہو سکتے۔

عابدہ اور میں ایک دوسرے کی طرف اس لیے بڑھے تھے کہ شاید ہم دونوں اپنی

فنا سے ڈرتے تھے۔ میں کسی میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔ عابدہ بچے کے بغیر اپنا سسد منقطع ہوتے دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں خوفزدہ تھے۔ اپنی اپنی فنا سے

لیکن جسم میں پناہ ڈھونڈنے والے اکثر اوقات تلاش کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ کبھی فیصلہ نہیں کر پاتے کہ وہ موت سے محبت کرتے ہیں کہ زندگی سے

اسی لیے ہم دونوں وہ حاتے دروازے کی مانند رہے۔ کنڈی لگی رہی تو ایک ورنہ دونوں پٹ علیحدہ علیحدہ رہے۔ آندھیوں میں بج اٹھنے والے دیواروں سے چپٹے ہوئے۔

اب عابدہ نانے ڈال کر اوپر آنے لگی۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوتی تو اس کے پورنما شی چہرے پر آنکھوں کی کھڑکیاں بند ہوتیں۔ ہونٹ لپ سٹک کے باوجود پرانے پردوں کی طرح بے رنگ نظر آتے وہ کبھی سلاخوں والی کھڑکی کے سامنے میری طرف پیٹھ کر کے کھڑی ہو جاتی۔ کبھی دیوار کے ساتھ بایاں کندھا لگا کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کی کوشش کرتی۔

بچپن سے جو میخیں اس کے کلچر، مذہب، ماحولیات نے اس کے ذہن میں ٹھونکی تھیں۔ بالآخر اس کے ذہن کے تختے کا حصہ ہو چکی تھیں۔ اگر ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہوتی تو اور بات تھی۔ لیکن ہم دونوں تو اپنی اپنی تلاش کے باعث ہمسفر ہوئے تھے۔ اس لیے اب فقط احساس گناہ اور خود شکستگی باقی تھی۔

میں بھی عجیب قسم کے بوجھ تلے دبنے لگا تھا۔

لیکن خدا جانے وہ کیا کائناتی عمل ہے جو کبھی کبھی بڑے بڑے بوجھ بہت چھوٹے سے لیور سے اٹھ لیتا ہے۔ جیسے بھاری تھری ٹن ٹرک چھوٹے سے جیک پر اٹھ جاتا ہے اور پنکچر پہیہ بدلنے کی آسانی مہیا آتی ہے۔ جب کبھی Ancient mariner

کی نظم پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑی کوفت ہوئی کہ احساس گناہ تلے دبے ہوئے بحری قزاق کو اس وقت تو رہائی نہ ہوئی جب اس نے موت اور زندگی جیسے مافوق الفطرت کردار دیکھے' لیکن چھوٹے چھوٹے دریائی سانپ دیکھ کر وہ ان ہی طاقتوں کے سامنے سرنگوں ہو گیا۔

شاید زندگی کے تمام اہم واقعات قد میں ہمیشہ چھوٹے ہوتے ہیں ماں کا مرنا سیمی کی موت' چندراگاؤں کا چھوٹنا یہ بڑے سانحے تھے۔ جیسے شہر بمباری کے بعد تباہ ہوتے ہیں۔ لیکن جنگ دیدہ شہر بڑی شان کے ساتھ سرعت سے جلد ہی تعمیر ہو جاتے ہیں برٹیکس' ڈلی' لاہور' ہیروشیما بڑی جلدی مرمت ہو جاتا ہے لیکن چھوٹے واقعات گھن کی طرح ہوتے ہیں۔ وہ اندر ہی اندر قد آور درختوں کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ لہلہاتے کھیتوں میں کلر کی طرح بڑھتے ہیں۔ جو شہر دریاؤں کے پاس آباد ہوں اور دریا ہولے ہولے کروٹیں لیتے رہیں۔ ایسے شہر ہولے ہولے ہی برباد ہو جاتے ہیں اور پھر کبھی آباد نہیں ہوتے ان کے اردگرد دبے آب و گیاہ ریت پھیل جاتی ہے۔

ماں کا مرنا بڑا واقعہ تھا لیکن اس کے اردگرد پھیلے ہوئے چھوٹے واقعات بڑے اہم تھے۔

ماں کا مرنا ایسے زلزلے سے مشابہ تھا جس کے ساتھ اونچی عمارتیں دھڑام کر پھٹ جاتی ہیں۔ سڑکوں میں چھتنارے درخت دھنس جاتے ہیں۔ لاوا شوربے کی طرح لاوارث پھرتا ہے لیکن زلزلہ لمحوں کی بات ہوتی ہے ماں کا مرنا ایسے ہی تھا۔ ہزاروں واٹ کی بجلی گری اور بھسم کر گئی لیکن ماں کے مرنے سے کچھ سال ادھر کے کئی چھوٹے چھوٹے واقعات اس کے مرنے کے ساتھ ہی اہم ہو گئے۔ جیسے ٹائیفائیڈ مرض کے بعد برسوں سر پر بال نہ اگیں۔ بغیر تلے کی جوتی میں چلنے کی وجہ سے کنکر اور ببولوں کے کانٹے پیروں میں چبھ جائیں اور کئی شامیں کئی

راتیں اپنے جسم کو سوئی سے بیدنے لگیں۔

میرے باپ کا گھرانہ بڑا شان والا تھا۔ چند راتیں ہماری حویلی سارے علاقے میں مشہور تھی۔ نک طوطے ابا کا سارا خاندان فیوڈل تھا۔ اسی لیے ماں کا میکہ گمنام رہا۔ ہم ماں کے کسی رشتہ دار کو نہ جانتے تھے۔ وہ حویلی میں اپنی کلب کی اور خاندان کے نذرانوں کی رعیت سے بڑی چودھرائن تھی۔

لیکن جب ماں بیمار پڑی اور گھر سے بھیڑ کم ہونے لگی تو مجھے پتہ چلا کہ وہ قصور جا کر اپنے میکہ گھر میں مرنا چاہتی تھی۔ باپ کو ماں کی اس آرزو پر منطقی طور پر کوئی اعتراض نہیں تھا' لیکن ساری بات غیرت کی تھی۔ ہمارے گھر کی کوئی بھی بڑی سیانی اپنے میکہ گھر میں فوت نہیں ہوئی تھی

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب ماں کو عصر کے وقت ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ وہ آنگن کے بڑے پیپل تلے نواڑی پلنگ کو گھسیٹتی رہتی، جدھر جدھر سورج چلتا ادھر ہی کو اس کا پلنگ کھسکتا جاتا، حتی کہ سورج غروب کے وقت اس کی چارپائی عین ان سیڑھیوں سے جا لگتی جو حویلی کی دوسری منزل کو جاتی تھیں۔

سردیوں سے ہوتا ہوتا بخار گرمیوں میں بھی رہنے لگا۔ اب ماں چھاؤں کی تلاش میں چارپائی کھسکانے لگی۔ جس وقت سورج پھیکا پڑ کے اندھا ہو جاتا، وہ پیپل کے تنے تلے عین گھڑونجیوں کے پاس چارپائی کھسکا کر پڑی رہتی۔ اب بھی آنگن میں شام کے وقت میلہ سا لگا رہتا تھا، ماں کی طبیعت کا پوچھنے دو آتیں تو چار اٹھ کر چلی جاتیں، لیکن اب ماں کی کھنک دار آواز نہ آتی "قیومی مختار ... بیٹا سردئی پی لو ... پھر مغرب کا وقت ہو جائے گا۔ میری نماز کھنچ جائے گی کا کا۔"

اب کوئی نہ کوئی ہمیں سردئی کے گلاس پکڑا دیتا، پھر خالی گلاس گھڑونچی پر پڑے رہتے، رین بسیرے والی چڑیاں گھمبیرے درخت میں اس قدر شور مچاتیں کہ جی ڈرنے لگتا لیکن ماں آنکھیں موندے چپ چپ پڑی رہتی۔ اب اسے نماز کے قضا

ہونے کا بھی کوئی فکر نہ تھا۔

چڑیوں کا جیسے نا ایک چھوٹا سا واقعہ بن گیا تھا۔ ان کی تصویر کے اوپر مغرب کی اذان سوپر امپوز ہو جاتی۔ گرمیوں میں دن کا یہ پہلا ٹھنڈا پہر ہوتا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں میرا جی چاہتا کہ دوپہر چڑھی رہے دوپہر کے وقت میں یہ ڈر نہیں ہوتا تھا، کہ ماں کہیں جا سکتی ہے لیکن مغرب کے وقت پتہ نہیں کیوں کئی قسم کے خوف مجھے گھیر لیتے، مجھے لگتا کہ شاید اسے جھٹپٹے میں ماں چھپ چھپا کر غائب نہ ہو جائے۔

ماں کے مرنے سے کچھ دن پہلے ایک اور بڑا معمولی واقعہ پیش آیا۔

اس روز ماں کو اس کی سہیلی اصغری اور میراثن برکتے نے غسل کرا کے پھیکے سبز رنگ کا سوٹ پہنایا تھا۔ دسمبر کی دھوپ ابھی آنگن میں تھی، وہ دونوں ماں کو سہارا دے کر باہر لا رہی تھیں اور میں اوپر جانے والی سیڑھیوں پر گنا گود میں لے بیٹھا تھا۔ چپتے چپتے میں ماں کی آنکھیں تھیں۔ اس کے ہونٹ یوں جڑے تھے جیسے درد کو باہر نکل کر واویلا مچانے سے روک رہے ہوں۔

اس سے پہلے ماں کے کانوں میں کئی بالیاں تھیں لیکن آج اس کے تمام کان خالی تھے۔ یہ میرے لیے ایک اور چھوٹا سا واقعہ تھا۔ میں بغیر بالیوں والی ماں کا عادی نہیں تھا۔ دسمبر کی دھوپ میں پلنگ پر بیٹھی میری ماں کا رنگ سوجی کی مانند پھیکا نظر آ رہا تھا۔ بھر کے زین اصغری نے ماں کی چٹیا کھینچ کر بنائی، اس کے بال اتنی سختی سے مٹھی میں لیے کہ ماں کی بادامی آنکھیں چینی نظر آنے لگیں۔ کچھ دیر تک وہ دونوں مٹھی چاپی کرتی رہیں اور جب عصر کی اذان ہو گئی تو ماں کی ملتانی کھیس اوڑھا کر چلی گئیں۔

اس وقت میں ڈرتے ڈرتے ماں کے پاس گیا۔ چڑیوں کے آنے سے پہلے مجھے چڑیوں کے جیسے نے سے خوف آتا تھا۔

”تیری بالیاں کہاں ہیں ماں؟“

ماں نے بڑی مشکل سے پلکیں اٹھائیں دونوں آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی

تھیں۔

"کون ہے؟"

"میں ہوں قیوم ...... قیومی۔"

ماں نے آنکھیں بند کر لیں اور آنسو اس کے کانوں کی طرف بہنے لگے۔

"پتہ نہیں تو کب جوان ہوگا کتنی دیر لگا دی تو نے جوان ہونے میں۔"

"ہم دونوں جوان ہیں دیکھ تو سہی" میں نے گاؤں میں سن رکھا تھا کہ ماؤں کو بیٹوں کی شادی کا بہت شوق ہوتا ہے۔

"تو ہماری شادی کرنا چاہتی ہے تو کر دے۔"

وہ مسکرا دی۔

ایک اور چھوٹا سا واقعہ۔

اس روز کی مسکراہٹ کے بعد پھر میں نے ماں کو مسکراتے نہیں دیکھا۔

"کتنے ہی سال سسرال میں رہو۔ کتنے ہی بچے جنو کیسے کیسے کاج سنوارو، کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ سسرال میں تو شوہر بھی اپنا نہیں ہوتا۔ دوسروں کا گلہ کیسا؟ چونکہ اس وقت میں صرف ساتویں میں پڑھتا تھا اور پوری طرح شادی کے قابل نہیں ہوا تھا، اس لیے میں رونے لگا۔ میں ماں کی باتیں نہیں سمجھ رہا تھا۔ صرف ماں کی آواز میں اس کے دکھ تلے ماں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"جب تو جوان ہو جائے گا تو اپنے مامے کے پاس جانا منظور الٰہی قصوری۔ کے پاس۔

پہلی بار میں نے اپنے ماموں کا نام سنا۔

"تو مختار بھائی کو بھیج دے قصور وہ تو بی اے میں پڑھتے ہیں جوت ہیں، ماں جوت ہے لیکن وہ اپنی دادی کی گود میں پلا ہے۔ جہاں کہیں دادی کا پیر ہے وہاں مختار نہیں جا سکتا۔"

تو مجھے ماے منظور کا پتہ بتادے میں چلا جاؤں گا۔ کل سویرے ہی۔"

"ڈریوں کے اڈے سے بلھے شاہ کے مزار کا پوچھ لینا۔ باہر والی گول سڑک پر بلھے شاہ کے مزار کے سامنے بازار کو ایک راستہ جاتا ہے بازار کی طرف مت مڑ جانا۔ بس گول سڑک پر رہنا۔ ایک بڑا سا احاطہ نظر آئے گا۔ بڑے پھاٹک سے کوئی سو گز کے فاصلے پر۔ یہ احاطہ میرے بھائی کا ہے۔ جس روز میں گھر سے نکلی تھی اس روز اس پھاٹک پر مراثی سہرے لگا کر گئے تھے۔ میری بھابی کے لڑکا ہوا تھا، اس روز پتہ نہیں اب تو وہ جوان ہو گیا ہو گا۔

"تو کیوں نکلی تھی ماں دیہات میں ہم بڑے لوگ نکل جانے کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔"

بڑے قحط کا سال تھا۔ بارش کا قطرہ نہ برسا تھا اور بھادوں کا مہینہ تھا چ لگا تھا، درختوں پر مٹی جمی تھی۔ سڑکیں راکھ جیسی ہو گئی تھیں۔ میں چوبارے میں رہتی تھی، بھابی کے ساتھ اور سارا دن بلھے شاہ کے مزار کی طرف منہ کر کے اس کے بچوں کو کھلایا کرتی تھی تین بچے تھے میری بھابی کے سب کو میں نے گودی کھلایا تھا۔

ماے منظور کو بلا دوں ماں۔"

"ناں ناں اس کا نام بھی مت لینا حویلی میں۔ تیرا باپ ناراض ہو جائے گا۔"

اس سے پہلے کبھی ماں کے منہ سے میں نے ماے منظور الٰہی کا نام بھی نہ سنا تھا۔

"اس روز سارے قصور پر مٹی کا بادل چڑھا تھا۔ قوال بلھے شاہ کے مزار پر چوکی بھر رہے تھے۔ میں تیسری منزل پر کھڑی کبوتروں کو باجرہ ڈال رہی تھی، پتہ نہیں قوالوں کی آواز میں کچھ تھا کہ آسمان چڑھی ہوئی مٹی میں کوٹھے سے اتری۔ بڑے پھاٹک سے نکلی اور مزار پر چلی گئی۔"

میں چپ چاپ ماں کے پاس کھیس کے اندر گھس کر لیٹ گیا۔ ماں کے جسم سے نم نما سینک نکل رہا تھا۔

تو ہوں سے آگے چھوٹے برآمدے میں ستون کے ساتھ سر لگائے تیرا باپ بیٹھا تھا تیرا باپ بڑے سال کہتا رہا کہ اس روز بلھے شاہ کے مزار پر اس کی دو دعائیں ایک ساتھ پوری ہوئیں۔"

"کون سی دو دعائیں؟"

"اس روز میں مزار سے گھر واپس نہیں گئی میری کون سی ماں تھی گھر پر جس سے میں اجازت لینے جاتی جب ہم چندرا میں داخل ہوئے تو بڑی تکویں بارش ہو رہی تھی۔ تیرے ابے نے تب مجھے بتایا کہ وہ بلھے شاہ کے مزار پر بارش کے لیے دعا کرنے گیا تھا۔"

تو اپنے گھر واپس کیوں نہیں گئی ماں بول بتا۔"

میں نے دونوں ہاتھوں میں ماں کا چہرہ لے کر پوچھا۔

دیکھ کسی سے یہ بات کرنا نہیں اچھا تیرا ابا ناراض ہو جائے گا وہاں میرا اپنا کوئی نہیں تھا ناں نہ ماں نہ باپ پر یہاں اتنے سال سسرال رہنے کے بعد پتہ چلا وہاں منظور الٰہی تو تھا ناں۔

اس کے بعد میں نے ماں کو بہت بلانا چاہا، لیکن وہ میری طرف پیٹھ کر کے ہولے ہولے روتی رہی۔ ماں کے مرنے سے بھی زیادہ اس چھوٹی سی شام نے مجھے اپنے اندر گھول لیا تھا، ماں کے مرنے کے بعد جب بھی میں لیٹتا مجھے یوں لگتا جیسے اب بھی وہ میری طرف پیٹھ کیے آہستہ آہستہ سسکیاں بھر رہی ہے۔

جس روز ماں کا چالیسواں تھا، اس سے ایک رات پہلے میں نے چندرا کو چپکے سے خدا حافظ کہا، آسمان پر دور دور تک مٹی چڑھی تھی، ایک بھی ستارہ نظر نہ آتا تھا اور بڑا کی گرمی تھی۔

جس وقت میں قصور کی گول سڑک پر پہنچا تو اس روز بھی بلھے شاہ کے مزار پر قوال چوکی بھر رہے تھے آڑھتی منظور الٰہی کا گھر تلاش کرنے میں مجھے ذرا بھی تکلیف

نہ ہوئی حاطے میں داخل ہوا تو ماں کی شکل کا ایک بوڑھا اندر سے وضو کا پانی کہنیوں سے پونچھتا ہوا باہر نکلا۔ اس نے لمحہ بھر کو مجھے دیکھا۔ ٹھٹھکا اور میرے گلے لگ گیا۔

"کیا حال ہے رابعہ کا؟"

"ماں تو مر گئی۔"

ماے نے میری طرف دیکھا پھر آسمان کی جانب نگاہ دوڑائی اس وقت چڑھتی آندھی میں کبوتر چکر لگا رہے تھے۔ ماں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"کب؟"

بلھے شاہ کے مزار پر قوالوں نے پورے زور سے سر لگائے۔" رہا میرے اوگن چت نہ دھریں۔

پتہ نہیں وہ ماے منظور الٰہی کے وضو کا چھینٹا تھا کہ اس کے اچٹے ہوئے آنسو تھے کہ بارش کا پہلا قطرہ میرے ماتھے پر ٹھنڈی برف کی کنی گری۔ میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔

اس روز پھر بارش شہر کو غرق کرنے کی سوچ میں تھی۔

ماے منظور الٰہی کی ملاقات کتنا چھوٹا سا واقعہ تھا لیکن اس نے مجھے پاؤں میں زنجیریں پہنا دیں اور بی اے کرنے کے بعد تک میں چندر انہ جا سکا۔

عابدہ بہت دنوں کے بعد میرے کمرے میں نظر آئی۔

مجھے کاسنی رنگ کے ہر شیڈ سے نفرت ہے اور وہ سر سے پاؤں تک بیگنی' کاسنی 'کلیجی مائل لگ رہی تھی۔ شاید وہ دیر سے یہاں بیٹھی تھی کیونکہ چارپائی کے نیچے مونگ پھلیوں کے چھلکوں کا ڈھیر تھا۔ میں نے سلاخوں والی کھڑکی میں کھڑے ہو کر تھوک سڑک پر پھینکی۔

”قیوم! بری عادت ہے ہروقت تھوکنے کی۔“

میں چپ رہا۔

”میری ممی تھیں ایک ان کو طہارت کی بری عادت تھی۔ پوری پوری باٹی پانی سے کرتی تھیں۔“

ہاں ہوتے ہیں ایسے لوگ بھی۔“

”آج بہت دنوں کے بعد عابدہ نے اپنے شوہر کے متعلق باتیں شروع کر دیں۔“

”خدا کی قسم قیوم جیسی خدمت میں نے وحید کی کری ہے نا ں ویسی کوئی ماں جنی نہیں کر سکتی   لیکن اس کو پرواہ ہی نہیں کہ میری گود خالی ہے۔ کہتا ہے بچہ خواہ مخواہ دردسر ہوتا ہے   کیوں بچہ کوئی دردسر ہوتا ہے؟“

میں   صرف اس کی زکامی آواز سن رہا تھا۔ متن پر میرے کان نہیں تھے۔

”ذرا بچے کی بات زور دے کر کہہ دوں تو فٹ رونے لگے گا کہے گا تمہیں کیا کوئی جنے یا مرے تمہیں تو بچہ چاہیے بچہ۔“

میں نے سگریٹ کا کش لگایا اور کہا   ”ہاں یہ تو وہ ٹھیک کہتا ہے   تمہیں صرف بچہ چاہیے اس دنیا میں۔“

”کیا ٹھیک کہتا ہے قیومی؟۔“

”یہی کہ اگر تمہارا اس سے کوئی رشتہ ہوتا تو تم اس کی تکلیف محسوس کرتیں۔“

پلاسٹک کی انگوٹھیوں والا ہاتھ گھما کر وہ بولی   ”میں اس کی بیوی ہوں نکاحی ہوں اس سے   اس سے بڑا رشتہ کیا ہوتا ہے۔“

یہی کہ اگر تمہارا اس سے کوئی رشتہ ہوتا تو تم اس کی تکلیف محسوس کرتیں۔“

”بیوی اور پی اے سے کسی کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ کوئی اچھا پی اے ہوتا ہے کوئی نالائق   کسی کو شارٹ ہینڈ آتی ہے کسی کو سپیڈ زیادہ ہوتی ہے کوئی چھٹی چھی

ڈرافٹ کرتا ہے کوئی ن وقس لینے میں تیز ہوتا ہے۔ ہر آفیسر پی اے کے ساتھ بندھا ہوتا ہے ہر شوہران کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہوتا۔ بی بی عابدہ ایک اچھی بیوی ثابت ہوتی ہے دوسری بری۔ اچھی بیوی کھانا پکاتی ہے برتن مانجھتی ہے وقت پڑنے پر پاؤں دباتی ہے۔ چپ رہتی ہے لیکن اسکے ساتھ بھی اس بیوی سے زیادہ ناطہ نہیں ہوتا جو گھر کے خرچے سے زیور بناتی ہے فلمیں دیکھتی ہے سسرال والوں سے لڑتی ہے۔ نوکر ملازم خدمت گار کے ساتھ تعلق پیدا ہو سکتا ہے لیکن پی اے کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں ہوتا بیوی بھی اسی ضمن میں آتی ہے۔

یہ یہ یہ تم کیا بک رہے ہو آج دنیا میں ہر رشتہ سگا بھی ہو سکتا ہے اور سوتیلا بھی سگی ماں سوتیلی ماں سگا بھائی سوتیلا بھائی لیکن بیوی ہمیشہ سگی ہوتی ہے کبھی تم نے سنا یہ میری چوتھی سوتیلی بیوی ہے۔

میں نے محض اس کو چڑانے کے لیے کہا سگا سوتیلا ہمیشہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں کھرے اور کھوٹے کی پہچان کرانی ہو جہاں رشتہ ہی موجود نہ ہو وہاں سگا سوتیلا کیا معنی؟۔

وہ اپنی پٹڑی پر بولتی چلی گئی اولاد ایک سگی دوسری سوتیلی چاچے تائے کچھ سگے کچھ سوتیلے بیوی پہلی سگی دوسری سگی تیسری چوتھی سب سگی بیویاں۔

میں آج کچھ ضرورت سے زیادہ برہم تھا۔ میں اس سے جھگڑنا چاہتا تھا۔ آج مجھے وہ شکتی سروپ نہیں لگ رہی تھی۔ میں اس کے وجود میں اتر کر تنو اکے سہارے خدا تک پہنچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس راستے نے بھی مجھے تسکین دینے کے بجائے الٹا الجھا دیا تھا۔ میں اسے اذیت دے کر دکھ پہنچا کر حلال کر کے سکون سے سگریٹ پینا چاہتا تھا۔

جان من عابدہ بیگم بیوی نقطہ Catalyst ہوتی ہے۔ سارے اصلی نقلی رشتے بناتی ہے پہلی بیوی کی اولاد ہو تو سب سگے بیٹے بیٹیاں دوسری کے تمام سوتیلے نہ

پہلی کے ساتھ کوئی رشتہ نہ دوسری کے ساتھ۔

وہ رضائی کھینچے جا رہی تھی اور اب میں اکڑوں تکیے پر بیٹھا تھا۔

ہے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے قیوم تم ایسی باتیں سوچتے ہو جو مذہب اور شریعت نے حرام کر رکھی ہیں بچی۔

مثلاً۔

رشتہ داری، اللہ رسول کے احکامات ہیں ان کے متعلق بیوی بچوں کے حق بندھے ہیں مذہب میں جو یہ سارے جھوٹے ہوتے تو شریعت ان کی پابندی کراتی تم کرتیجے بھائی بھابھی سے ملا کرو۔ بچے ہیں ماشاءاللہ ان سے کھیل کرو۔ ان پر بھی پیار نہیں آتا؟''

نہیں۔''

''توبہ ایسے کوئی کہتا ہے کہیں بھابھی صولت کے سامنے نہ بکواس کر دینا''۔

''وہ جانتی ہے۔''

ساری بات یہ ہے کہ اس بدبخت یسی نے تمہارے دماغ میں فتور بھر دیا ہے۔ عشق کا بخار چڑھا ہے تمہیں مجھے جو کہیں مل جائے تو الو کی پٹھی کو سیدھا کر دوں۔ خود تو مر گئی اس بچارے کو ویسے ہی پاگل کر گئی اللہ کی شان۔

''کسی نے میری ریڑھ کی ہڈی پر برف مل دی۔

''خبردار پھر کبھی یسی کو کچھ نہ کہنا۔''

''کہوں گی کہوں گی اس نے تمہیں پاگل کر رکھا ہے ہائے کبھی مسدس تو س کے رڑکے یوگا کرتے پھرتے تھے؟ وہ بھی تنزالیو گا نجس ناپاک خیالات اسی نے بسائے تمہارے دل میں اپنے گناہ پر نقاب ڈالنے کو تم کسی دماغی امراض کے ڈاکٹر سے ملو قیومی سچ خدا کی قسم! اور تو یہ کیا کروا اپنے گناہوں پر۔''

"پھر اس کا نام نہ لینا عابدہ۔" میں نے اس کے کندھے پکڑ کر کہا۔

"وہ جو سارا دن تم وحید کی دھجیاں اڑاتے پھرتے ہو وہ ٹھیک ہے۔ آخر میرا مجازی خدا ہے وہ۔"

"ہو گا لیکن میرا مجازی خدا نہیں ہے۔"

ہم دونوں کچھ دیر خاموش رہے اس نے اپنے کندھے میری گرفت سے چھڑانے کی ہلکی سی کوشش کی۔ لیکن میں نے اسے چھوڑا نہیں۔

بڑی دیر بعد میں نے کہا "سچ بولنے کی کوشش کرنی چاہیے لیکن۔"

اس نے مجھے بات مکمل کرنے نہ دی اور بولی "سچ بولنا کوئی کمال نہیں ہے سچ سننا بڑا کمال ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"سچ بولنے کی قوت ہمیشہ سچ سننے والوں سے ملتی ہے۔ تم سچ بول تو دیتے ہو لیکن سچ سن نہیں سکتے۔ یہ تمہاری کمزوری ہے سیدھی۔"

"تمہیں غلط اندازہ ہوا ہے۔ مجھ میں سچ سننے کی اہلیت ہے۔"

"ہے؟" سرمہ لگی آنکھیں مٹکا کر اس نے پوچھا۔

"ہے۔"

"میری کے خلاف بھی؟" اس نے شرارت سے پوچھا۔

"ہاں اس کے خلاف بھی۔"

"کل بولو گے میرے ساتھ۔ سچ سننے کے بعد۔"

"ضرور"

"اچھا۔ اب سنو تم درمیانے قد کے دبلے پتلے مردنما لڑکے ہو۔ تمہاری مونچھیں تمہارے چہرے پر نہیں سجتیں۔ تمہارے بالوں سے خشکی جھڑتی رہتی ہے جو تمہاری کوٹ کے کالروں پر بری لگتی ہے۔ تمہارے بڑھے ہوئے ناخن گندے ہوتے

ہیں۔تمہارا مزاج ایسا ہے جیسے راکھ جلتے کوئلے پر چڑھی ہو اوپر سے بجھے ہوئے اندر سے جلا دینے والے ہر وقت کتابیں پڑھ پڑھ کر تم نیم پاگل فلسفی ہو گئے ہو۔“

میں نے جلدی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ میری سخت گرفت کے نیچے کسمسائی۔

”پتہ نہیں کیوں میں نے تمہارے پاس آجاتی ہوں قیوم مجھے پتہ بھی ہے کہ یہ جائز نہیں حرام ہے پتہ نہیں مجھے بچے کی تلاش لاتی ہے کہ اپنی تنہائی پتہ نہیں میں تمہیں چپ کرانے آتی ہوں کہ اپنے آپ کو؟“

یکدم اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اپنے ہونٹ اس کی گال پر رکھ دیے۔

”ناں قیوم! یہ گناہ ہے میں نے توبہ کر لی ہے۔“

”کس بات کی۔“

”بس کسی بات کی ایسے بچے کا بھی کیا فائدہ۔“

وہ چپ چاپ بستر سے اٹھ گئی۔چھناکے سے مونگ پھلیوں کا لفافہ فرش پر گر گیا۔

اب عابدہ نے کوٹھے پر آنا بالکل چھوڑ دیا۔میری نوکری نئی تھی۔اس لیے میں نے پوری توجہ سے ریڈیو سٹیشن پر وقت گزارنا شروع کر دیا۔

صبح شیو کرتا تو بار بار بالوں میں برش پھیرتا۔پتہ نہیں کیوں عابدہ نے میرا جو سچا سراپا بیان کیا تھا۔اس سے مجھے شرم آنے لگی تھی ہمدردی اب کم ہو گئی تھی۔میں بھی ماضی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بہت سی کتابیں خرید لیا تھا ”اپنے آپ کو بدل ڈالو۔“

"تم اور تمہارا مستقبل" "بدلنے کے بائیس گر" اس نوعیت کی ان گنت امریکی کتابیں ریڈیو سے واپسی پر اب میرے ساتھ ہوتیں۔ میں یوگا سے کھل کر کچھ دنوں ٹی ایم کے چکر میں پڑا رہا۔ Relax کرنے کا یہ ڈھنگ کچھ دنوں مجھ پر سوار رہا۔ پھر میں نے یہ راستہ بھی چھوڑ دیا۔ لمبے سانس، تپسیا، منتر، زن بدھ ازم سب بیکار باتیں تھیں میں اپنی انا کی پوست میں سمٹا ہوا تھا، مجھے ہر جگہ اپنے آپ ہی سے لڑنا تھا۔ عابدہ سے میرا کوئی ناطہ نہیں تھا۔ لیکن اس نے مجھے پنی محبت کی ہڈی پر سیدھا کیا ہوا تھا۔ میں اس کی محبت میں مبتلا نہیں تھا۔ لیکن اس کی رفاقت سے اس قدر رل گیا تھا کہ اگر وہ چار دن اوپر نہ آتی تو از سر نو مجھے چاند میں بونے کھیلتے نظر آتے اور آنگن میں دن چھپنے پر سیمی بیٹھی نظر آتی۔

اس روز میں نے پہلا دیہاتی پروگرام پروڈیوس کیا تھا۔ مجھے ہلکی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ نئے کام کی نئے ماحول اور نئے تعلقات کی خوشی مجھ پر خوشی ایسے ہی چڑھی ہوئی تھی۔ جیسے آلو بخارے پر ہلکی سی دھند نما سوم چڑھی ہوتی ہے۔ بھائی مختار کا موٹر سائیکل میں نے آنگن میں رکھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ عابدہ کو دیہاتی پروگرام کے متعلق سب کچھ بتاؤں جو کچھ وہ سمجھ سکے وہ بھی اور جو کچھ وہ سمجھ نہ سکے وہ بھی۔

آنگن میں بو بھی صولت، عابدہ اور ایک اجنبی بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ اجنبی کے چہرے پر تکبر، سر پر ہلکا سا گنج اور جوتے کی پالش میں مڈل کلاس زندگی کا عکس تھا۔ پتہ نہیں یہ اجنبی مجھے کیوں برا لگا۔ مجھے بھابھی نے آواز دی لیکن میں ہمیشہ کی طرح ان سنی کر کے اوپر آ گیا۔

میرے کمرے میں چائے کا تھرمس اور مونگ پھلیوں کا لفافہ پڑا تھا۔ میں کرسی پر بیٹھ کر عابدہ کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن گھنٹہ بھر بعد میں نے اپنے لیے چائے بنائی اور پھر اسے ٹھنڈی ہونے کے لیے چھوڑ دیا۔ نئے پرانے زخم آہستہ آہستہ کھل رہے تھے، کئی سوال؟ جو کچھ دن سے مجھے ستاتے نہ تھے آج دوبارہ پوری آب و تاب سے

ابھر آئے تھے، بڑی دیر تک میں باہر کوٹھے پر ٹہلتا رہا۔ یکدم مجھے اپنی گدی سے کئی سمتوں میں آوازیں آنے لگی تھیں۔ میں نے کئی بار پلٹ کر دیکھا، جیسے میرے سر کے ساتھ کوئی اور سر جوڑے ٹہل رہا تھا۔ پھر کمرے کا روشندان آنکھ کی پتلی کی طرح کھلنے اور بند ہونے لگا — آسمان کی کمر میں چاند کا خنجر بندھا تھا۔ مجھے یوں لگا۔ جیسے ابھی ایک نادیدہ ہاتھ کمر بند سے یہ خنجر کھول کر میرے سینے میں پیوست کر دے گا۔ میرے معدے میں یکدم بہت سا تیزاب جمع ہو گیا۔

یہ سب کچھ کیا ہے؟

انسانی رشتے؟ — نفرتیں محبتیں؟

یہ سب کچھ کیا ہے...

زندگی کا سفر؟

ہمیں کیا چاہیے؟ — یک دوسرے سے؟ — اپنے آپ سے؟

عمر کا فریب، عقل کا فریب، محبت کا فریب — معاشرہ اور فرد — فرد اور قانون — قانون اور قانونِ فطرت — ان سب کی حدیں کون سی ہیں؟

ایک آدمی کیا صرف جسمانی طور پر کسی اور کو ہلاک کر سکتا ہے کہ ہلاک کرنے کے لیے جسم کی قید نہیں .....؟

سوال بڑے بھنور میں چھوٹے تلاطم بن کر گھوم رہے تھے۔ کئی حقیقتیں، کئی عزائم کئی جھوٹ کئی سوچیں آپس میں مشین کی سلائی جیسی جڑتی جا رہی تھیں۔ مجھے اب سیمی کی تلاش نہیں تھی، اس کا مرنا ہوتے ہوتے حقیقت بن چکا تھا۔ لیکن اس کی موت نے ان گنت جاگتے سوالوں کو جنم دے دیا۔ جس طرح مشین کے پرزے کھلے ہو کر آوازیں دیتے ہیں اور ان میں پہلے سی تیزی نہیں رہتی، ان سوالوں نے بے نام جستجو بے معنی تلاش نے مجھے کھوکھلا کر دیا تھا۔ میں اب زندگی کے پیٹرن پر چلتا ہوا اندر سے آوازیں دینے لگا تھا۔ عابدہ ہوتی تو یہ آوازیں مدھم ہو جاتیں۔

لیکن کبھی مکمل طور پر ختم نہ ہوتیں۔ ان ہی نے مجھ پر عجیب قسم کی وارفتگی اور دیوانہ پن طاری کر دیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا کہ میرا وہ نام نہیں ہے جس سے لوگ مجھے پکارتے ہیں۔ اصلی نام یاد کرنے کی کوشش کرتا تو وہ یاد نہ آتا۔ کبھی مجھے لگتا کہ میں جن لوگوں سے ملتا ہوں ان کو میں نے کبھی پہلے بھی دیکھا ہے میں ان کی پرانی ملاقاتوں کو ذہن میں ابھارنے کی سعی کرتا تو بیکار نکلتی۔ کچھ چہرے کالج کے دوست، پروفیسر بھائی مختار رصولت بھابھی ان کے بچے مجھے بالکل اجنبی لگتے۔ مجھے اپنے آپ سے پوچھنا پڑتا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ اور میری طرف پرامید مشتاق نظروں سے کیوں دیکھتے ہیں؟ جب تک عابدہ میرے پاس رہتی تھی ان بے سمت سوچوں سے چھٹکارا ملا رہتا۔ اس کے جاتے ہی ہر طرف سے ریل گاڑیاں چلنا شروع ہو جاتیں اور مجھے لگتا کہ ابھی وہ میری ذہن میں پہنچ کر آپس میں ٹکرائیں گی۔ بڑا دھماکا ہوگا اور میری کھوپڑی پاش پاش ہو جائے گی۔ ان ہی سوچوں نے مجھے اپنی نوکری میں دلچسپی لینے پر مجبور کر دیا تھا۔

چاند کا خنجر غروب ہو گیا۔ اب کوٹھے پر سڑک کے کھمبے کی پھیکی روشنی تھی۔ عابدہ کے آنے سے بہت پہلے اس کے سلیپروں کی آواز آئی۔ میرے دل کو ہلکی سی ڈھارس ہوئی۔

"یہاں کیا کر رہے ہو اکیلے؟"

میں چپ رہا۔

"اندر تمہارے لیے چائے رکھ گئی تھی۔"

"شکریہ پڑی ہوئی ہے سات گھنٹے سے۔"

"کیسے بول رہے ہو؟"

"جیسے بولا کرتے ہیں۔"

"بڑا دکھ طریقہ ہے تمہارا مہمانوں کے ساتھ نہ بیٹھنے کو کھانہ آنے کی وجہ

دریافت کی۔"

"بیٹھ جاؤ اندر جا کر۔"

"تم کیلی ...؟"

"عورتیں اکیلی بیٹھی اچھی لگتی ہیں۔کوئی انہیں ستاتا نہیں۔"

"پوچھو گے نہیں کہ میں کیوں آئی ہوں۔"

میں نے سگریٹ سلگایا اور شہ نشین پر بیٹھ کر بولا "ضرور کوئی معقول وجہ ہو گی کیونکہ تم ہمیشہ میرے پاس معقول وجہ سے آئی ہو۔"

"بڑے کمینے ہو وحید کی طرح۔"

"ہم مردوں کی ایک ہی ذات ہوتی ہے اللہ کے فضل سے۔"

"اندر آؤ ایک بات کرنی ہے تم سے۔"

کچھ دیر میں کیلا بیٹھا رہا۔نافرمانی پر طبیعت مائل تھی۔لیکن زیادہ دیر رہ نہ سکی۔بالآخر میں اٹھ کر اندر چلا گیا۔عابدہ آج سفید کپڑوں میں بڑی ستھری اور ماڈرن لگ رہی تھی۔پلاسٹک کے تمام زیور غائب تھے۔لپ سٹک کا نشان تک نہ تھا۔دھیمے بالوں کی چھوٹی پاؤڈر لگی گردن سے لپٹ کر کندھے سے سینے پر لٹک رہی تھی۔

"یہ تمہاری کیا عادت ہے موٹر سائیکل نیچے دھرا اور بغیر سلام دعا اوپر دھڑن جگرا ہے یہ بھی صولت کا میں تو ایک دن میں نکال دوں گھر سے یہ گھر ہے کوئی ہوٹل تو نہیں ناں۔"

"بھائی مختار میری طبیعت کو سمجھتے ہیں۔"

"تم وحید کو تو مل لیتے اچھی بے نیازی ہے تمہاری۔"

جیسے کسی نے گرم پانی میں مجھے غوطہ دیا۔اندر باہر تمام زخم کھل گئے۔

"میرا تو خیال تھا کہ سو برس کتے کی دم سیدھی کرو نہیں ہوتی۔پر اس کو تو جلدی ہو

ش آ گئی۔"

اس کے چہرے پر ہنسی تھی خوشی کا گلال بکھرا تھا۔

"ایسی معافیاں مانگی ہیں بھابھی صولت سے۔ کیا ہاتھ جوڑ جوڑ کر وعدے کیے ہیں۔ اپنے علاج کا بھی وعدہ کر لیا ہے۔"

میرا دل یکبارگی کانپنے لگا اس کی ہنسی میں فتح تھی مسرت تھی۔

"مسنون عابدہ تمہارا خیال ہے وہ بدل چکا ہے۔ اب وہ تمہیں بہتر طور پر رکھے گا جانِ من کوئی شخص کسی کی خاطر نہیں بدلتا نہیں بدل سکتا ایک بار تم چچا وطنی پہنچ گئیں تو پھر وہی بک بک جھک جھک ہو گئی۔"

وہ کچھ دیر چپ چاپ مونگ پھلیاں چھیلتی رہی۔

"اب میں ہمیشہ تو یہاں نہیں رہ سکتی ناں بھابھی صولت کے پاس بیچاری بہت عزت کرتی ہیں۔ لیکن کوئی کسی کو کب تک رکھ سکتا ہے اب عزت سے لے جائے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

"تم تو کہتی تھیں کہ اگر ایک لاکھ روپیہ بھی کوئی دے تو میں کبھی وحید کے ساتھ نہ جاؤں۔"

ٹھٹک کر وہ بولی "یہ میں نے کب کہا تھا۔ میں تو بس اس کی شکایتیں کرتی تھی۔"

"ان ہی شکایتوں پر بھروسہ کر کے میں نے کہیں اندر ہی اندر تم پر اعتماد کر لیا۔ تم تم میری شکتی ہو عابدہ تمہارے بغیر میں "

یکدم میں چپ ہو گیا اس بے سود تلاش سے فائدہ۔

"محال ہے میں تو ہر وقت وحید کو ہی یاد کرتی رہی ہوں قیومی جیسے تم کسی کو یاد میں کھوئے رہتے ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ کسی تمہاری بیوی نہیں تھی اس لیے تم صرف اس کی اچھی باتیں یاد کرتے تھے۔ میں وحید کی بیوی ہوں اس لیے اسے یاد

کرنے کا میرا طریقہ مختلف تھا۔ یا تو ہم دونوں ہی کرتے تھے ناں؟“

اس کے نزدیک ساری بات کل اتنی تھی۔ اتنی مختصر سادہ اور سچی۔

اس وقت مجھے پتہ چلا کہ یہ سیاہ گوش جسے مردار سمجھ کر میں کئی مہینوں سے اس کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ اور اسے مردہ سمجھ کر اس سے اپنی زندگی کا پروٹوپلازم بنانے کی کوشش میں مصروف تھا۔ یہ سیاہ گوش مرا ہوا نہیں تھا۔ صرف پھوئے کی طرح مردے پن کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ مجھے جھپٹتے دیکھ کر اس نے جھرجھری لی اور زنت جنگل کو روانہ ہو گیا۔

”اچھا تو قیومی اب میں چلوں اللہ تمہاری مدد کرے۔ خدا قسم مجھے کبھی کبھی تو تم پر واقعی ترس آ جاتا تھا۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اس کے اٹھنے کے انداز میں قطعیت تھی۔

”تم اس حیوان کے ساتھ نہیں رہ سکتیں ...وہ تمہیں نہیں سمجھتا اس کا علاج نہیں ہو سکے گا عابدہ۔“

”یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا۔“

واقعی یہ میں کیسے کہہ سکتا تھا کہ وحید اسے نہیں سمجھتا اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔

”عابدہ میں ان گنت سوالوں میں گھرا رہتا ہوں اتنے سارے سوال کہ میرا اپنا وجود ان میں کھو گیا ہے تم جب تک ہوتی ہو مجھے یقین رہتا ہے کہ میں ہوں ورنہ ...... ورنہ“

”تمہارا صرف اتنا قصور ہے قیومی کہ تم رشتہ داروں میں نہیں رچے پودے کو جڑ چاہیے کھڑا رہنے کو“

”صرف تم میری جڑ بن سکتی ہو صرف تم“

”مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ تم پاگل ہو دراصل اس کالج کی کم بخت نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے تمہارے دماغ کو گرمی ہو گئی ہے کسی دماغی امراض کے

ڈاکٹر سے ہو تو ہی خدا کے لیے۔"

"تم اگر یہاں رہو گی تو میں ٹھیک ہو جاؤں گا رشتہ داروں سے ملنے لگوں گا اگر تم ایسے نہ رہنا چاہو گی تو میں تم سے نکاح کر لوں گا۔"

"ہے ناامت ماری گئی تمہاری میں کیوں نکاح پر نکاح کروں گی؟ اس نے ابرو اٹھا کر پوچھا۔

پتہ نہیں کیوں میری آنکھیں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اس لیے نہیں کہ مجھے عابدہ سے محبت تھی۔ میں اس سے بچھڑنا نہ چاہتا تھا بلکہ صرف اتنی بات تھی۔ وہ میری زندگی کے منتی پیٹرن میں ایک مثبت سمبل تھی یقینی چیز تھی باقی سب کچھ غیر یقینی۔

"نیچے چل کر وحید سے نہیں ملو گے؟"

میں نے منہ پرے کر لیا میں کسی گنجے کو متھا ٹیکنے نہیں جا سکتا اس وقت۔"

"لیکن آخر ہوا کیا ہے میں اس کی بیوی ہوں اب وہ لینے آیا ہے تو کیا میں اس کے ساتھ بھی نہ جاؤں خیر سے۔"

"ضرور جاؤ" میں اونچے درخت کی آخری شاخ پر بوڑھے گدھ کی طرح چپ چاپ ہو بیٹھا۔

"عجیب پٹھا دماغ ہے تمہارا کسی ڈاکٹر سے مشورہ کرو جلدی سے جلدی۔"

"اور تمہارا دل بھی عجیب ہے اتنا کچھ تمہارے جسم کے ساتھ ہوا۔ اس پر رتی اثر نہیں ہوا؟"

"واقعات پر اپنا بس تھوڑی چلتا ہے گناہ تو آدمی سے ہوتے رہتے ہیں۔ بندہ بشر جو ہوا۔ توبہ کرے بس آیندہ کے لیے اللہ معاف کرنے والا ہے۔

"بس ساری اتنی سی بات ہے؟"

وہ کھسانی ہو کر بولی "اچھا نیچے چل کر وحید سے ملو۔"

"جانے دو عابدہ تم سب ایک سی ہو۔"

آج وہ اندر باہر بہت خوش تھی اسے اس بات پر بھی غصہ نہ آیا۔

"کیسی ہیں ہم سب؟"

"جیسی بھی ہو ایک سی ہو۔"

میں نے چادر چہرے پر کھینچ لی۔ میرا خیال تھا وہ چادر اتارے گی غصہ جھڑے گی ہمیشہ کی طرح بڑا بنائے گی منائے گی لیکن وہ کچھ دیر کھڑی رہی۔ پھر توبہ استغفار پڑھنے کی آواز آئی۔ بعد ازاں کمرہ اس قدر چپ ہو گیا کہ چادر کے اندر مجھے خوف آنے لگا۔

کچھ دیر بعد جب مجھے یقین ہو گیا کہ کرگسوں کو منانے کوئی نہیں آئے گا تو میں نے چادر سے باہر سر نکالا۔ چائے کا سامان ٹرے میں دھرا تھا۔ دونوں پیالیوں میں ٹھنڈی چائے پر کریم کی جھلی چڑھی ہوئی تھی۔ پاکستانی مونگ پھلیوں کے چھلکوں کا چھوٹا سا ڈھیر تھا اور ان کے قریب عابدہ کے سفید سلیپر پڑے تھے ربڑ کے سفید قینچی سلیپر۔

میں نے اٹھ کر ان سلیپروں کو غور سے دیکھا پرنام کیا اور پھر پلنگ کی چادر سے صاف کر کے الماری کی اوپر والی شلف میں رکھ دیا۔ اس کے پاس ہی میری ماں کی چھوٹی سی تصویر فریم میں جڑی ہوئی پڑی تھی۔ شاید اسی جذبے کے ساتھ راجہ بھرت نے بن باسی مہاراجہ رام چندر کی کھڑاویں راج سنگھاسن پر رکھی ہوں گی عابدہ کے چلے جانے کے بعد بہت عرصہ میرے دل پر اس کا راج رہا۔

دوسری صبح جب میں نیچے گیا اور میں نے مختار بھائی سے موٹر سائیکل مانگی تو مجھے پتہ چلا کہ عابدہ اپنے وحید کے ساتھ چپچو وطنی جا چکی ہے۔

اس کے بعد میرے معدے میں پھر جلن رہنے لگی اور میں Anxiety کا شکار ہو گیا۔ دراصل گیس جلن اور تبخیر کا میرے اندرونی اعضا سے اس قدر گہرا تعلق نہ تھا۔

جس قدر میری ذہنی شکستگی اور گومگوں کا عالم جسمانی ریخت کا باعث بنتا مجھے شہر میں کئی ڈاکٹر بدلنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ وہ مجھے Antiacid دوائیاں دیتے۔ دودھ پینے کی ہدایت کرتے۔ مرچ مسالے والی چیزوں سے پرہیز کرنے کو کہتے اور اصرار کرتے کہ میں اپنا آپ ڈھیلا چھوڑ کر فکروں سے آزاد ہو جاؤں۔ تمام ڈاکٹروں کے نسخے تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ وہی رہتے تھے۔ ڈاکٹروں سے اکتا جاتا تو حکیموں کی بیٹھکوں پر جانے لگتا۔ تبخیر معدہ جلن اور سوزش کے لیے وہ مجھے پلاسٹک کی ڈبیوں میں معجونیں اور جوارش دیتے۔ عرق کی بوتلیں میرے سرہانے دھری رہتیں۔ حتیٰ کہ ان میں ہلکا ہلکا کاغذی سفوف سا تیرنے لگتا۔ ڈاکٹروں حکیموں کے علاوہ ہومیو پیتھک اور بایو کیمک دوائیوں کا بھی کمرے میں انبار لگ گیا جس وقت عابدہ گھر کو آناً فاناً چھوڑ کر گئی اور میرا منہ کڑوے لعاب سے بھرا رہنے لگا۔ میں نے کئی در کھٹکھٹائے۔

صحت کی تلاش میں ایک روز میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر فیضی کے پاس چلا گیا جس سے میری پرانی جان پہچان تھی۔

آئیے آئیے انہوں نے دروازہ کھول کر کہا۔

"آئیے اسرار کا کیا حال ہے؟"

"آپ باقاعدگی سے کالی فاس تھرٹی کھاتے رہتے تو افاقہ ہو جاتا۔"

"کھا تا رہا ہوں جی۔"

بیٹے ہومیو پیتھک میں بس یہی خرابی ہے یہ تو مائی سین سے بھی زیادہ باقاعدگی سے کھانا پڑتی ہے۔""

ڈاکٹر نے اپنی کاپی نکالی اس میں وہ صفحات نکالے جن میں میرے سسٹم لکھے ہوئے تھے۔

نیند کا کیا حال ہے"

”بہت خراب۔ آہستہ آہستہ میں نے بے دھیانی سے جواب دیا۔

”جمائیاں۔“

”آنے لگیں تو بہت آتی ہیں۔“

”خواب؟“

”پریشان۔“ میں نے جواب دیا۔

”آنکھ پھڑکتی ہے اور کئی کئی گھنٹے پھڑکتی رہتی ہے؟“ اس نے پوچھا

”جی ...... درست ہے۔“

”کونسی آنکھ؟“ سوال ہوا۔

”ہاتھیں؟۔“

کھجلی؟۔“

”ہاں ہا ...... سا ئیں“

”اندر کی طرف کہ باہر کی طرف۔“

”اندر ...... کی جانب“

وہ آہستہ آہستہ تمام سمٹم نوٹ کرتا رہا اور پھر اٹھ کر دوائیوں کی الماری کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس وقت کوثر کلینک میں داخل ہوئی۔

وہ بیاہی ہوئی بیگموں کی طرح باقاعدہ موٹی ان کلچرڈ اور باتونی ہو چکی تھی۔ ہم دونوں ڈاکٹر کو بھول بھال کر بڑی دیر تک سوشیالوجی ڈیپارٹمنٹ اور ہم جماعتوں کی باتیں کرتے رہے۔ ہر بار میں اس سے سیمی کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن پتہ نہیں کیوں زبان اس لفظ سے گریز کر رہی تھی۔ سیمی کا ذکر کرنے کی آرزو نے مجھے پروفیسر سہیل کی باتیں کرنے پر مجبور کر دیا۔

”ہائے پتہ ہے قیوم مجھے پروفیسر سہیل نے بڑا disappoint کیا۔ وہ میرے ہر بنڈ کے ساتھ یونیورسٹی میں ہیں ناں آج کل۔ یاد ہے ناں ہم سب ان کو کتنا

idolize کیا کرتے ہیں۔"

"میں تو اب بھی انہیں پوجتا ہوں۔"

"چھوڑو۔۔۔ بڑے تکلیف دہ آدمی ہیں۔ اتنی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ اور اتنا چھوٹا Behave کرتے ہیں۔"

"واقعی؟۔۔۔ میں نے مجروح ہو کر کہا

"میرے ہزبنڈ کہتے ہیں ذرا نولج نہیں ہے سارا ہوتا ہے۔ ذرا حافظہ اچھا ہے کتابیں جلدی رٹ جاتی ہیں۔ ان کے اقتباس استعمال کرتے رہتے ہیں۔"

میرے سامنے پروفیسر سہیل آ کھڑا ہوا۔ مجھے پروفیسر کا بڑا اچھا تجربہ تھا لیکن ہر آدمی غالباً کانوں کا کچا ہوتا ہے کوثر کی بات نے میرے اعتبار میں چھید کر دیئے میرا فزکس پر مضمون لکھنے والا بھی ہی نکلا۔

"اب بھی younger generation اس کے چنگل میں پھنس جاتی ہے لیکن فائدہ؟"

"جو آدمی کے ٹو جتنی اونچی باتیں کرے اور اپنے انیسویں گریڈ کے لیے مرتا کھپتا رہے Strikes کروائے کلاسوں سے واک آؤٹ کرے۔۔۔ وہ بالکل عظیم نہیں ہو سکتا

کیوں؟۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ میں ابھی تک پروفیسر سہیل کی شخصیت سے متاثر تھا۔ میں نے کوثر سے یہ بات چھپائی کہ میں وقتاً فوقتاً ان سے ملنے یونیورسٹی جاتا رہتا ہوں۔

"تمہیں ایک secret بتاؤں۔۔۔ کوثر میری کرسی پر جھک گئی۔

"ہاں بتاؤ۔"

"ہماری کلاس کی تھی ناں۔"

میرا جی لمحے بھر کے لیے بجلی کے کھمبے کی طرح کھڑا ہو گا۔

"ہاں تھی۔"

"پتہ ہے یہ پروفیسر سہیل اس کے عشق میں مبتلا تھا۔ بڑا jealous تھا وہ آفتاب سے۔"

"تو ______ !"

"میں ______ !"

"تو مائی فٹ۔"

"تم میرے پاس آنا نیو کیمپس میں ______ میں سارا قصہ سناؤں گی تمہیں۔"

اس کے بعد کوثر ہومیو پیتھک ڈاکٹر کے ساتھ مشغول ہو گئی۔ اس کے بیٹے کے دانت نکل رہے تھے اور وہ اس تکلیف دہ مرحلے کے لیے دوا لینے آئی تھی میں نے دو گولیاں ڈاکٹر صاحب کے سامنے کھائیں باقی پڑیاں رومال میں باندھ کر جیب میں رکھیں اور کوثر سے پھر ملنے کا وعدہ کر کے باہر چلا گیا۔

اس وقت میرا کوئی ارادہ نہ تھا کہ میں کوثر سے ملوں گا۔ لیکن کہانی کا یک نیا کونہ یوں باہر نکل آیا جیسے دریا کا پانی اتر جائے اور غرقاب جہاز کا مستول نظر آنے لگے۔

اس تجسس نے ایک شام مجھے پھر نیو کیمپس جانے پر مجبور کر دیا۔

نہر کے کنارے کنارے پوپلر کے درخت ہوا میں مسلسل ہل رہے تھے۔ سڑکیں خاموش تھیں۔ صرف ہوسٹل کے لڑکے لڑکیاں پٹڑیوں پر نظر آ رہے تھے۔ میں لڑکوں کے ہوسٹل کی جانب مڑ گیا۔ کوثر اور اس کا میاں گھر پر موجود نہ تھے۔ ان کا سات ماہ کا بچہ ایک اناڑی ملازم کی گود میں رو رہا تھا۔ جس وقت میں واپسی پر نہر کنارے پہنچا تو اچانک مجھے ڈاکٹر سہیل نظر آ گئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح ملین ڈالر مسکراہٹ کے ساتھ دونوں ہاتھ ہلاتے آئے اور میرے موٹر سائیکل کی دونوں ہتھیاں پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔

"کہاں بھئی کہاں؟ ______ بڑے دنوں کے بعد نظر آئے نوکری مل گئی؟"

''مل گئی سر کبھی کی۔''

''کسی لڑکی وڑکی کا چکر ہے یہاں۔''

''نہیں جی۔''

پتہ نہیں کیوں میں اسے کوثر کے متعلق بتانا نہیں چاہتا تھا۔

پھر؟ یہ ہوسٹل سائیڈ سے کیوں آرہے ہو۔''

''آپ کو تلاش کر رہا تھا۔''

''تو آؤ چلو کیفے ٹیریا میں چلتے ہیں، میں بھی کئی دن سے تمہیں ملنا چاہتا تھا۔

''نہیں سر یہیں ٹھیک ہے نہر کنارے۔'' میں نے اپنا موٹر سائیکل فٹ پاتھ کے پاس کھڑا کر دیا۔

سہیل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم دونوں نہر کنارے آہستہ آہستہ چلنے لگے۔

''آج میرے دل پر بہت بوجھ تھا میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا مل جائے جس کے ساتھ میں اپنی تھیوری share کر سکوں you know تم آپ طالب علم بہت مکینکل ہو گئے وہ متجسس نہیں رہے۔ وہ علم دوست نہیں رہے وہ اچھا ہوا مجھے تم مل گئے میرے دل پر بہت بوجھ تھا آج۔''

میرا دل دھک دھک کرنے لگا خیال تھا کہ وہ سیمی کے متعلق کچھ بتائے گا۔''

تم کو یاد ہے کہ ایک بار میں نے تمہیں ایک assignment لکھنے کو دی تھی دیوانگی کی وجہ اور میں نے بار بار کہا تھا کہ یہ وجہ چاہے کتنی ہی far fetched کیوں نہ ہوں۔ لیکن نظریہ تمہارا اپنا ہونا چاہیے۔

''جی مجھے یاد ہے۔''

''میں کئی سال لڑکوں کو یہی Assignment دیتا رہا ہوں لیکن آج تک کسی سٹوڈنٹ نے کوئی نئی بات نہیں کی اب میں نے یہ سوال پوچھنا چھوڑ دیا وہ سب کتابوں سے چرا کر لکھ لاتے ہیں۔

مجھے ابھی تک یاد تھا کہ جس روز ہم دیوانگی کی آخری شکل خودکشی کی باتیں کر رہے تھے میں نے سفید کرتا اور نیلی جینز پہن رکھی تھی۔

''ابھی ابھی کچھ دن پہلے ساری بات شیشہ ہو گی قیوم میں سمجھ گیا ہوں دیوانگی کی اصلی وجہ کیا ہے ہر وقت میں سوچتا رہتا ہوں کہ وہ ذہنی پراگندگی جس کی وجہ سے کوئی شخص خودکشی پر آمادہ ہوتا۔ یہ وجہ بھی اس فعل کی طرح مکمل طور پر مبہوت کرنے والی ہونی چاہیے۔ دراصل دیوانگی ایک خارجی علامت ہے لیکن اس کی وجہ خارجی نہیں اس کی اصلی وجہ میں بتاؤں قیوم ۔ بتادوں بولو رز افشاں کردوں دیوانگی کا۔''

کھلی آنکھوں والا وہ پروفیسر اس لحظہ مجھے خود دیوانہ سا نظر آیا کیا اس کی دیوانگی کی وجہ بھی یہی تھی۔

''بتایئے سر ضرور''

''میں بات کو سادہ کہہ دوں گا اور زیادہ تفصیلات میں نہیں پڑوں گا تم نے کبھی بائیولوجی پڑھی ہے۔''

''میٹرک میں پڑھی تھی سر۔''

''پڑھا کرو بائیولوجی کوئی آدمی بوٹنی بائیولوجی اور فزکس کے بغیر اپنے خدا تک نہیں پہنچ سکتا اس کی قدرت کو نہیں سمجھ سکتا۔ اسے سمجھ نہیں آسکتی کہ کیسے اس کی تقدیر اس کی حیاتیاتی وراثت ہے۔ تمہاری آنکھوں کا رنگ۔ قد کی لمبائی رنگت ہی gcues کے تابع نہیں تمہارا گوشت ہڈی اور اعصاب پر ہی Genes حاوی نہیں بلکہ ہر خلیے کے نیوکلیس میں کروموسومز کے رزن میں انسان کی تقدیر چھپی ہوتی ہے۔''

اس نے اپنے لب میرے کان کے ساتھ لگا دیے۔

''اور بیٹا جی مغرب کے لوگ مانیں نہ مانیں لیکن ان ہی جینز کے اندر ہماری

دیوانگی کا راز پنہاں ہے۔"

"کیسے سر! کیا آپ ماحول پر qcneties کو ترجیح دے رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بات واضح ہے کہ دونوں چیزیں بالواسطہ یا بلاواسطہ ایک دوسرے کے بغیر چل نہیں سکتیں۔

ہمیں نے دیوانگی کا راز پالیا ہے قوم اور وہ ہے تغیر نوع یا mutotion سو وہ طور پر سمجھ لو کہ جب بھی evolution ہوتی ہے کوئی specie بدلتی ہے اس کی وجہ سے mutation geve ہوتی ہے ارتقاء انسانی کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے میں تبدیلی ہو۔ ہر نئی پود پچھلی سے مختلف ہو یہ تبدیلیاں ابھی مکمل طور پر دریافت نہیں ہوسکیں۔ لیکن یہ بات طے ہے کہ ساری تبدیلی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

qeues پوری طرح تغیر پذیر ہوں تو ارتقا ہوتا ہے ٹوٹ پھوٹ جائے تو دیوانہ پن پیدا ہوتا ہے۔"

"سر آپ کا سارا علم مغرب سے مستعار لیا ہوا ہے۔ غالباً اسی لیے اس میں نیا پن نہیں ہے۔" میں کوثر کی باتوں میں ڈوبا ہوا تھا۔

سہیل نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولا Bastard کہتے تم سچ ہو لیکن جب میری ساری بات سنو گے تو شاید اپنی رائے بدل لو گے جیسے میں اپنے متعلق اپنی رائے بدل چکا ہوں radiation, tranqulizers اور ایسی ہی کئی زہریلی دوائیوں سے quess میں خطرناک mutation ہو جاتی ہے آج کا مغربی سائنس دان اس حقیقت سے بہت خوفزدہ ہے وہ جانتا ہے کہ ان باتوں سے تغیر تو ہوتا ہے لیکن مکمل نہیں ہوتا۔ تغیر پذیر gene لولا لنگڑا ہو جاتا ہے اور آنے والی نسلوں پر بڑے خطرناک نتائج مرتب ہوتے ہیں۔

مثلاً دو سروں والا بچہ چھ انگلیوں والی اولاد ماتھے کے درمیان تیسری آنکھ والی مخلوق ایسے qene کے نتائج کچھ بھی ہوسکتے ہیں۔ بازو نہ ہوں سر سے

ہے لیکن میں نے ایک اور وجہ بھی دریافت کی ہے ایک نئی اور انوکھی وجہ جس سے تغیر پذیر ہوتے ہیں اور دیوانگی ہوتی ہے غور سے سنو میں اپنی تھیوری patent کروانے والا ہوں غور سے سنو یہ مغرب والے جب یہی نتیجہ اخذ کریں گے تو تم جیسے چرکٹے اسے فوراً اپنا لیں گے۔ لیکن اپنے آدمی کا اعتبار نہیں کریں گے۔ یہی سیاہ آدمی کی پس ماندگی کی وجہ ہے۔"

"آپ تھیوری تو بتائیں سر۔"

"مغرب کے پاس حرام حلال کا تصور نہیں ہے اور میری تھیوری ہے کہ جس وقت حرام رزق جسم میں داخل ہوتا ہے وہ انسانی qenes کو متاثر کرتا ہے رزق حرام سے ایک خاص قسم کی mentation ہوتی جو خطرناک ادویات شراب اور radiation سے بھی زیادہ مہلک ہے رزق حرام سے جو qenes تغیر پذیر ہوتے ہیں۔ وہ لولے لنگڑے اور اندھے ہی نہیں ہوتے بلکہ ناامید بھی ہوتے ہیں نسل انسانی سے۔ یہ جب نسل در نسل ہم میں سفر کرتے ہیں تو ان qenes کے اندر ایسی ذہنی پراگندگی پیدا ہوتی ہے جس کو ہم پاگل پن کہتے ہیں۔ یقین کرو رزق حرام سے ہی ہماری آنے والی نسلوں کو پاگل پن وراثت میں ملتا ہے۔ اور جن قوموں میں من حیث القوم رزق حرام کھانے کا لپکا پڑ جاتا ہے۔ وہ من حیث القوم دیوانی ہونے لگتی ہیں کیوں اب بتاؤ یہ بات مغرب کے علم سے مستعار لی ہے کہ مشرق سے؟

میں حیران پریشان ان کا منہ تکنے لگا۔

یاد رکھو ابھی مغرب والے یہاں تک نہیں پہنچے جب ہم سور کا گوشت نہیں کھاتے تو وہ حیران ہوتے ہیں۔ جب ہم بکرے پر تکبیریں پڑھ کر اسے حلال کرتے ہیں تو وہ تعجب سے دیکھتے ہیں۔ جب ہم عورت سے زنا نہیں کرتے۔ نکاح پڑھ کر اسے اپنے لیے حلال بناتے ہیں تو وہ سمجھ نہیں سکتے بھائی میرے کیسے سمجھیں حرام حلال کا تصور انسانی نہیں ہے اس لیے اس میں بھید ہے گہرا بھید

حرام حلال کی حد سب سے پہلے بہشت میں لگائی تھی gene mutation کا
اللہ نے۔

''آپ کی بات انوکھی تو ضرور ہے پروفیسر صاحب۔لیکن مجھے کچھ ان سائنٹفک
لگتی ہے۔

لگے گی۔ لگے گی لگتی رہے گی۔کیونکہ بات کرن والا ایک معمولی مشرقی آدمی ہے۔
تمہارے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر سنو کیمپس پر چلنے والا کہیں جو یہ نظریہ مغربی فلاسفر
کے منہ سے سن پاتے تو فوراً قائل ہو جاتے مائی ڈیئر سٹوڈنٹ حرام کیا ہے؟
وہ جس سے منع کیا گیا اچھے اور برے کا سوال نہیں ہے،صرف جو چیز منع فرمائی
ہے اللہ نے وہ حرام ہے اسی لیے حرام وحلال کا جھگڑا سب سے پہلے جنت میں پیدا
ہوا۔جب حضرت آدم نے شجر ممنوعہ سے توڑ کر کھایا۔اچھے برے کا سوال نہیں
تھا بس وہ جو منع تھا اسے حلال کیا اس گندم کے دانے کا رزق حرام جس
وقت ان کے جسم میں داخل ہوا ایک خطرناک تغیر آیا ان کے جسم میں ان کے
genens میں اس تغیر سے اللہ نے انہیں ڈرایا تھا۔اس وقت تک حضرت آدم
اور اماں حوا کے تمام خلیے صالح تھے۔ان کا نیوکلس محفوظ طریقے سے ٹوٹتا ہے لیکن اب
اس نیوکلس میں چھپے ہوئے genes میں تبدیلی آئی mutat genens ہوئے
ٹوٹے لنگڑے اندھے اور ناامید اور آنے والی نسلوں میں منتقل ہو گئے اسی لیے
دیوانہ پن کے پہلے آثار ہابیل اور قابیل کے جھگڑے میں واضح ہوئے۔پہلا قتل ہوا
حضرت ! دیوانگی خودکشی کی مشکل میں منتج ہوئی کہ قتل کی شکل میں اس سے کون انکار کر
سکتا ہے کہ دیوانگی کی شدید شکل انسان کش ہے جھگڑا ہابیل قابیل میں نہ ہوا
تھا یہ ان کی وجہ تھی جو حضرت آدم کے وجود میں شجر ممنوعہ کے کھانے کی وجہ سے
ٹوٹے پھوٹے تھے پھر چل سو چل ہوا ایک سے دوسری پود تک ہم یہی ورثہ
دیتے آئے ہیں۔خود رزق حرام کھاتے ہیں اور آنے والی نسلوں کو پاگل پن کی

وراثت genes میں پیک کر کے عطا کرتے ہیں۔ بیٹا نہ سہی پوتا سہی، پوتا نہ سہی چند نسلوں آگے کوئی شریف النفس بچی سہی اس تقدیر سے کوئی بچ نہیں سکتا جو genes میں لکھی جاتی ہے۔

"غالباً آپ بابا آدم کی مذہبی کہانی کو نئے طور پر interpret کر رہے ہیں"۔

"مائی فٹ ڈاکٹر سہیل چلایا مذہبی کہانی کی نئی توجیہہ ایک معمولی کام ہے میں ایک بہت بڑا انکشاف کر رہا ہوں سیدھی سی بات ہے بھائی میاں جو کچھ ہم کھاتے پیتے ہیں اندر جا کر ہمارے لہو کی ساخت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ہوتا ہے کہ نہیں اندر بلڈ کیمسٹری چلتی ہے کہ نہیں؟"

"جی چلتی ہے۔"

"تو سمجھو بخوبی طور پر کہ جو رزق حلال ہم اندر ڈالتے ہیں۔ اس کا بلڈ کیمسٹری پر مثبت اثر ہوتا ہے اور جو رزق حرام اندر داخل ہوتا ہے اس کا منفی اثر ہوتا ہے ہمارے لہو پر۔"

یعنی ایک بوری آٹا جو حرام کی کمائی سے آیا اور ایک بوری آٹا جو حلال کی کمائی سے آیا ان کی بلڈ کیمسٹری مختلف ہوگی؟ جانے دیجیے سر۔

"ضرور یقیناً انشاء اللہ جو شخص حرام کی بوری سے کھائے گا۔ اس کے لہو کی کیمیائی حالت مختلف ہوگی اور اس لہو میں genes کی توڑ پھوڑ منفی ہوگی۔"

"جائیں سر ..... جانے دیں۔"

"مان جائیں بابا جی مان جائیں مغربی تعلیم کے پرستارو جی مان جائیں۔ اگر کبھی مغرب کے پاس حرام حلال کی تصور ہوتا تو وہ کبھی کے پاگل پن کی اصلی وجہ دریافت کر لیتے۔"

"جناب پروفیسر بقراط صاحب آٹا ایک مادی چیز ہے اس کا جو کچھ بھی کیمیکل اثر ہوگا۔ دونوں حالتوں میں ایک سا ہوگا کیونکہ ان دونوں میں ایک خاص

مقدار تک کاربوہائیڈریٹ اور پروٹینز وغیرہ ہوں گے۔

پانی مادہ ہے ہے کہ نہیں؟ لیکن دم کیے ہوئے پانی کی تاثیر بدل جاتی ہے جس پانی میں سے بجلی گزرتی ہے۔ اس کے ایٹم پھٹ جاتے ہیں کہ نہیں گدھے آدمی جس وقت آٹا رزق حرام سے خریدا جاتا ہے اس میں ایک منفی چارج جمع ہو جاتا ہے۔"

"چھوڑیئے سر بات آپ folvore کی کر رہے ہیں اور بنانا اسے سائنٹفک چاہتے ہیں"۔

"اچھا یہ بتاؤ دادا کا گناہ پوتے تک کیسے پہنچتا ہے مفلس کیسے سفر کرتی ہے انسانوں میں۔

"بیماریاں ملے ہے کہ کچھ موروثی ہوتی ہیں۔

"اور دیوانہ پن۔؟"

"دیوانہ پن موروثی ہو سکتا ہے اور ماحولیاتی بھی لیکن موروثی کی وہ وجہ نہیں ہے جو آپ بیان کر رہے ہیں۔

۔تو گے۔تو گے بچو! ابھی نہیں جس وقت کوئی سفید صاحب تمہارے گلے میں انگوٹھا دے گا تب! تب آپ کا باپ بھی مانے گا کہ رزق حرام ہی پاگل پن کی اکلوتی وجہ ہے۔

"میرا باپ بیوروکریٹ نہیں ہے سر شاید وہ آپ کی بات مان جائے"۔

سہیل نے میرے کندھے پر زور ڈال کر پوچھا کہاں ہے تمہارا باپ وہ میری بات ضرور سمجھے گا وہ جانتا ہوگا کہ اللہ علیم ہے اگر اس نے گوشت پر تکبیر پڑھنے کا حکم دیا ہے تو وجہ ہوگی ضرور کوئی۔ میں اسے بتاؤں گا کہ کیا منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اگر تکبیر نہ پڑھی جائے تو ظالم سوچ تو سہی کہ تکبیر پڑھنے سے مرغی کا گوشت بدل جاتا ہے؟ نہیں۔ ہرگز نہیں صرف حرام گوشت سے

genes پر منفی اثر پڑتا ہے۔ یہ ساری حکمت تھی اور تم جیسے کو دن کو میں سمجھ رہا ہوں اور تم سمجھتے نہیں۔

اس نے حیران ہو کر مجھے دیکھا اور بولا / مذہبی اعتقادات ہیں ہی سائنس بنانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سور کا گوشت حرام ہے۔ اس پر سو تکبیریں پڑھ دو، یہ حرام ہی رہے گا، جو کھائے گا وہ اپنی genen mutation کا خود ذمہ دار ہوگا۔

"کیا اسی لیے عورت کو بھی حلال کر کے استعمال کرنے کا حکم ہے" میں نے طنز سے سوال کیا؟

"زنا سے پیدا ہونے والے بچے کو تو gene mutation کا سو فی صد خطرہ ہوتا ہے زنا سے منع کیوں کیا اسی لیے ورنہ جسمانی تعلق کوئی بدل تھوڑی جاتا ہے شادی کرانے سے یا نہ کرانے سے جسمانی تعلق دونوں صورتوں میں وہی رہتا ہے۔

"پلیز آپ عورت کو بکرے کے گوشت سے نہ ملائیں، آج کل ویمن لبریشن چل رہی ہے کسی عورت نے سن لیا تو وہ آپ کو حلال کر دے گی بلکہ حرام کر دے گی۔"

وہ نہر کنارے خودرو گھاس پر بیٹھ گیا اور چپ ہو گیا، پھر اس نے ایک پتھر اٹھا کر بہتے پانی میں پھینکا، تھوڑے سے چھینٹے اڑے اور پانی روانی پر قائم ہو گیا اس وقت میرے جی میں آئی کہ میں اس سے سیمی کے متعلق پوچھوں۔ وہ کس حد تک سیمی میں گوندھا گیا تھا؟

"یار سوچو تو بکرے کا گوشت مادی رزق کی شکل ہے عورت کا گوشت کو بھی کبھی روحانی شکل اختیار کر لیتا ہے لیکن ہے وہ بھی رزق ہی کی شکل میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رزق چاہے مادی ہو یا روحانی genes کو متاثر ضرور کرتا ہے تم مانو نہ مانو یہ حرام و حلال کا بڑا ظالم چکر ہے کبھی کبھی رزق حرام سے فرد اقرد اپاگل پن پیدا نہیں ہوتا بلکہ قوم کی قوم دیوانی ہو جاتی ہے سو ڈاما اور گوموراکی طرح مائی

ذہین عورت کے معاملے میں تو بہت احتیاط برتنی چاہیے، اس کے پاس تو مشین موجود ہے ایسی بچہ جنم دیتی ہے ثقافت زنا کے بعد اور آنے والی نسلوں میں بیج چھوڑ دیتی ہے دیوانگی کے۔

''اچھا سر میں پھر کسی وقت حاضر ہوں گا''

بھاگو بھاگو تم صاحبزادے کبھی حاضر نہیں ہو گے۔ ہم جیسے پروفیسروں کے پاس کبھی کوئی حاضر نہیں ہوتا تم لوگ ایسی لڑکیوں کے پاس وقت گزرنا چاہو گے جو تمہیں اچھا چھوڑو this is your age

''آپ بھی مجھ سے کچھ زیادہ بڑے نہیں ہیں سر اور پھر جب بھی میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں آپ حوصلہ شکنی کر دیتے ہیں ڈ۔

اس نے اپنی کھوپڑی پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہا یہاں بہت بڑھا ہو گیا ہوں قیوم دعا کر میری تھیوری کامیاب ہو جائے۔

''ہو گی جی انشاء اللہ ضرور ہو گی''

''اس نے لمبی سانس بھر کر کہا میں بڑا ہی چھوٹا آدمی ہوں مجھے پاکستان سے ایسی تعصب انگیز محبت ہے کہ میں کوئی بڑا کام کر نہیں سکتا، میں جب بھی سوچتا ہوں پاکستان کی terms میں سوچتا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ یہ پدا سا ملک جغرافیے کے نقشوں میں کسی طرح بڑا ہو جائے۔ جب بھی ہماری ہاکی ٹیم یا کرکٹ ٹیم کوئی میچ جیت جاتی ہے تو ایک foolish لڑکی کی طرح میرا تالیاں بجانے کو جی چاہتا ہے یہ میرا جی چاہتا ہے کہ میری تھیوری کامیاب ہو۔ مغرب کے لوگ قائل ہوں کہ ایک پاکستانی مسلمان نے اتنا بڑا کام کیا۔

''انشاء اللہ سہیل صاحب ایسے ہی ہو گا۔''

Its very sily of me لیکن میں نے پاکستان سے زیادہ کبھی کسی لڑکی سے محبت نہیں کی کسی شاہد سے بھی نہیں

میرا آرزو کا بوم رنگ کیسی آسانی سے ننانوے پر ہو کر میری طرف لوٹ آیا

''آپ کو کیسی شدہ ہے؟ کمال ہے سر جی۔''

''لیکن یہ محبت اچھا میں پھر کبھی explain کروں گا۔ ابھی مجھے اور بہت کچھ سوچنا ہے۔ وہ بالکل چپ ہو گیا۔

آدھے گھنٹے بعد جب میں اٹھنے لگا تو سہیل بولا یاد رکھو ایک اور قسم کا بھی رزق ہوتا ہے حرام و حلال سے پرے ایک بار اللہ میاں نے اپنی چہیتی قوم بنی اسرائیل کو بھی وہ رزق دیا تھا۔ یہ رزق نہ حرام ہوتا نہ حلال اور اس سے یک آگاہی پیدا ہوتی ہے عرفان جنم لیتا ہے جو عام آدمی کے لیے دیوانے پن ہی کی ایک شکل ہے لیکن اس دیوانے پن کو سمجھنے کی ضرورت نہیں نہ ہی اس کی سمجھ آسکتی۔ کیونکہ یہ صرف اسی رزق سے پیدا ہوتا ہے جو اوپر سے اترتا ہے۔ جس سے genes بھر میں صدیوں کا رتقاش کر جاتے ہیں۔ ان میں ایسا تغیر آتا ہے جو قرنوں کی صالح mutation سے پیدا ہو سکتا ہے تم دیکھتے نہیں اسرائیلیوں میں کتنے سوپر ذہن لوگ پیدا ہوتے ہیں۔ یہ اسی من و سلویٰ کا اثر ہے اب تک اب تو آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔

گدھے آدمی اگر انسان پالتو مرغیوں کو ایک خاص قسم کی فیڈ دے کر انڈے دینے والی مرغیاں بنا سکتا ہے اگر شہد کی مکھی اپنے بچوں کو کھلا کر رانی مکھی بنا سکتی ہے تو اللہ میاں اتنے پر بھی قادر نہیں کہ خاص رزق دے کہ عام انسانوں میں سے پیغمبر بنا سکے ولی ڈھال سکے، عرفان عنایت کر سکے۔ چل اٹھ جا اب اور اپنے اسر کے بے کچھ کر تو اسی قابل ہے کہ تجھے ہر وقت anxity ہے اور تو گیس کا شکار ہو۔''

میں چپ چاپ اٹھ گیا ڈاکٹر سہیل اس وقت ایک اور شخص تھا میری اس سہیل سے کبھی ملاقات نہ ہوئی تھی۔ اس اجنبی کو نہر میں پتھر پھینکتے ہوئے چھوڑ کر میں گھر

آ گیا۔ میں نے اپنی الماری کھولی اوپر والی شیلف میں جوں کے توں عابدہ کے سفید سلیپر پڑے تھے۔ ان سلیپروں کو دیکھ کر پتہ نہیں کیوں مجھے ریڈیو سٹیشن کی ایک آرٹسٹ یاد آ گئی جس کے پاؤں بہت گورے تھے اور جو ہمیشہ ربڑ کے سفید سلیپر استعمال کرتی تھی

دن چڑھے

رزق حرام

سندھ میں اس جگہ جہاں اب رانی کوٹ کا بے آباد قلعہ ہے۔ یہاں خشک تال تھے جن کے اردگرد چھدری ڈاڑھی کی طرح درختوں کا سلسلہ تھا جن میں جب سمندری ہوائیں چلتیں تو قدم آدم گھاس اور ان درختوں میں چھپے ہوئے پوکھروں کی خودرویدگی آہستہ آہستہ ہلنے لگتی ہے اور خوشبودار ہو جاتی ہواؤں میں نمی اور تالابوں کے ٹھہرے ہوئے پانیوں میں گنے کا باسی رس کی خوشبو دار تھی سارے۔ میں نیند تعویذ دفن تھا موروثی کی بھول بھلیاں تھیں۔ ایل ایس ڈی کے خواب تھے۔

اس بار چیل جاتی نے کانفرنس سے بہت پہلے جنگل کے تمام پرندوں کو اپنا ہم زبان بنا لیا۔ وہ بھاری اکثریت سے جیت جانے کی امید لے کر آئے تھے۔ کالی کلچی مہرلاٹ قازموے، جنگلی تیتر سب چیلوں کی ٹکڑیوں میں گھسے بیٹھے تھے اور جانتے تھے کہ اس بار راجہ گدھ اور اس کے ہم مشربوں کو ضرور جنگل بدر کا حکم مل جائے گا۔

راجہ گدھ کو اپنی وکالت کے لیے وکیل ڈھونڈنے میں بڑی مشقت کرنا پڑی تھی۔ ریڑھ والے جانور اس باتوں کو دیوانہ پن سمجھے۔ رینگنے والوں کے پاس پہنچا تو وہ اس کی بات نہ سمجھ سکے۔ تھک ہار کر اس نے گیدڑ کو اپنی پیروی پر رضامند کیا تھا۔ لیکن اتنے انتظار کے باوجود ابھی تک گیدڑ چوپال میں نہیں پہنچا تھا۔ اب تو راجہ

گدھ کے کڑھ میں بھی چہ میگوئیاں ہو نیل گئیں تھیں۔

جس وقت سیمرغ کی سواری آئی۔ سارے میں آندھی چلی لال آندھی جس میں چھوٹے چھوٹے کنکر سرخ مٹی اور سوکھے پتے تھے۔ پھر بڑ کے جٹادھاری درخت پر جیسے بجلی گری۔ تمام جنگل سفید ہو گیا اور پرندوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس کے بعد سارے میں امن اور شانتی پھیل گئی۔

سیمرغ نے تین بار اپنے تن کی فاسفورس جیسی بتی بجھائی اور سوال کیا کیا ملزم حاضر ہے؟"

"حاضر ہیں۔ آقا اور حکم کے منتظر ہیں۔" راجہ گدھ نے کہا۔

"تجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہو تو کہہ؟"

راجہ گدھ نے لجاجت سے نظریں جھکا کر کہا گیدڑ میرا وکیل ہے آقا وہی کچھ میری ترجمانی کر سکتا ہے۔"

سارے جنگل میں خاموشی چھا گئی۔ اور جنگل پار سے سانپوں کے پھنکارنے کی آواز سنائی دینے لگی۔

"پھر نکال اپنے وکیل کو کہاں ہے وہ؟ چیلوں کی ملکہ بولی۔

راجہ گدھ نے دور تک نظر دوڑائی اور لجاجت سے بولا آقا ہمیں کچھ مہلت دے تاکہ ہمارا وکیل پہنچ جائے اور ہماری بے بسی پر روشنی ڈال سکے۔ اگر قصور ہمارا نکلا تو یقین رکھ ہمیں جرم کی ضرورت نہ ہو گی۔ ہم خود جنگل چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اللہ کی مخلوق کے لیے یہ کرہ ارض تنگ نہیں ہے۔ ہمیں کہیں نہ کہیں جگہ مل جائے گی۔"

چیلوں کو معلوم تھا کہ وہ عوام کو رام کر چکے ہیں اور گدھوں کی پشت پناہی کے لیے کوئی بھی تیار نہیں۔ حتیٰ کہ مینا بھی اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ ایک چیل نے تنک کر کہا "اے راجہ گدھ ہم اس وقت تک تیرا انتظار نہیں کر سکتے۔ جب تک

دوسری بار نئی نوع انسان تہذیب یافتہ ہو کر دوبارہ ایسے بم بنائے جو ایک ہی سانس میں میلوں تک بستیاں کھا جائیں نکالنا ہے تو اب حاضر کر اپنے وکیل کو۔"

اس وقت حبشہ کے دیس کی ایک بوڑھی گدھ بولی "سیمرغ! ہمرے وکیل پر جانوروں کا بہت دباؤ ہے جانور اس معاملے سے الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔ ان کو خوف ہے کہ اگر جنگل بدری کی رسم پرندوں میں رواج پا گئی تو رفتہ رفتہ جانور بھی کوئی نہ کوئی الزام لگا کر جلاوطن کا طریقہ رائج کر دیں۔ وہ گیدڑ کو روک رہے ہیں پرندوں نے معاملے میں دلچسپی نہ لے لیکن ہمارا وکیل ارادے کا پکا ہے آتا ہی ہوگا۔"

اس وقت سرخاب نے پر جھاڑے تو توقیر سے بولا عالی جناب کچھ پرندوں کا خیال ہے کہ جنگل بدری کی سزا مناسب نہیں جو جنگل کے بیج پیدا ہوئے ہیں انہیں یہیں رہنا چاہیے جو پانی کے باسی ہیں ان کے لیے پانی افضل مقام ہے۔ گر ہم اللہ کے بنائے ہوئے قانون میں دست درازی کریں گے تو وہ کسی نہ کسی عذاب کی شکل میں ہمیں سزا ضرور دے گا اور ہماری کئی ذاتیں ایسے معدوم ہو جائیں گی جیسے پرانے زمانے کے پہاڑ پیکر جانور"

چیلوں کی ملکہ طمطراق سے سارے میں گھومی اور چلا کر کہنے لگے ان پرندوں کی نشاندہی کی جائے جو اس طرح سوچتے ہیں۔ ہم ان سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

سرکاری وکیل نے جز بز ہو کر کہا افسوس ان کمزور پرندوں کا نام نہیں لیا جا سکتا۔ رازداری میں بتائی گئی بات کو افشا کرنا میرا منصب نہیں۔"

اس بات پر چیلوں کی ٹکڑی میں پر پھڑ کانے کی صدائیں بلند ہوئیں اور بھانت بھانت کی چہکار سے خشک تال گونج اٹھا تھوڑی دیر بعد سرخاب نے مجمع کو کنٹرول کر کے کہا "اور کچھ پرندوں کا یہ بھی خیال ہے کہ جونہی گدھ جنگل سے باہر نکلے یہ

شہروں میں رہیں گے پھر انسان کو بھی ویسے ہی استعمال کرے گا جیسے صدیوں سے وہ گدھے گھوڑے بیل اور دودھ دینے والے جانوروں کو زیر استعمال لاتا رہا ہے آہستہ آہستہ انسان تک ہمارے وہ تمام راز پہنچ جائیں گے جو آج تک محفوظ ہیں وہ ضرور پرندوں کی بولی سیکھ لے گا۔"

تیتر نیا کا کسیر میکا واٹی اور مودب لہجے میں بولا "جنگل والے خوانخواہ انسان سے خائف ہیں ہم الہوسی انسانوں میں رہتے ہیں وہ بڑی شرافت سے ہمارے ساتھ گزر بسر کرتے ہیں آقا کرگس جاتی اگر شہروں کو جاتی ہے تو جانے دے ہمیں فکر نہیں کرنا چاہیے کیونکہ اول و آخر انسان ہی اللہ کا خلیفہ ہے اور ہم سے زیادہ جانتا ہے۔"

سیمرغ نے تین بار فاسفورس کی بتی بند کی اور گویا ہوا "تو ٹھیک کہتا ہے میں جانتا ہوں صرف انسان ساکن ہے کائنات کی باقی تمام اشیاء متحرک ہیں کیونکہ انسان مطلوب ہے اور باقی ہر شے طالب افسوس انسان نے اپنے آپ کو مطلوب کی جگہ سے ہٹا کر طالب بنا لیا ہے اسی لیے گردش میں ہے ورنہ وہ اس قدر دیوانے پن کا شکار نہ ہوتا اور اب تک اللہ کی رضا کو پالیتا۔"

اس وقت چیل جاتی کے ایک حواری سارس نے کہا "آقا انسان طالب ہو یا مطلوب متحرک ہو کہ ساکن فرزانہ ہو کہ دیوانہ نجات کو پہنچنے والا ہو کہ تباہی سے ہمکنار ہونے والا ہم کو انسان سے غرض! انسان کے گرد گھوم کر ہمیں کچھ حاصل نہ ہوگا۔"

سیمرغ نے قہقہہ لگایا ناریل کے درخت اس قہقہے سے لرزنے لگے۔

"سنو اس احمق کی بات سنو بیوقوف اس کائنات کے جو بھی فیصلے ہوتے ہیں وہ جو بھی فیصلے ہوں گے کسی نہ کسی طرح آخر میں انسان ان سے متاثر ہوتا ہے یا انہیں متاثر کرتا ہے۔"

اس وقت گیدڑ تال میں ایسے اترا جیسے شیر سرکس کے پنجرے میں حاضر ہوتا ہے۔

سارے میں سناٹا چھا گیا گیدڑ نے اپنی گچھے دار دم کے ساتھ تین بار کورنش ادا کی اور پھر بڑے کے درخت کی طرف چہرہ کر کے گویا ہوا "اے پرندوں کے بادشاہ! میں صورت حال سے اچھی طرح واقف نہیں کہ کچھ مجھ تک پہنچی وہ ملزم کی زبانی تھا اس تک طرفہ بیان پر اکتفا نہیں کر سکتا اگر واضح اور مختصر الفاظ میں مجھ تک راجہ گدھ اور ان کی برادری کا قصور بیان کر دیا جائے تو میں دفع الزام کی کوشش کروں۔"

چیل ملکہ نے جلال میں آ کر کچھ کہنے کو زبان کھولی لیکن سرخاب نے اسے روکا اور بیان کیا۔

"سن گیدڑ اس روئے زمین پر چرند پرند حیوان انسان سب خیر و برکت سے رہتے تھے۔ صرف انسان فتنے سے خالی نہیں اس نے اپنی عقل سے اپنے آپ کو متمدن کیا اور پھر اسی عقل کا سہارا لے کر ایسے ہتھیار ایجاد کیے جس سے بستیاں اجڑ، مرگذار تباہ اور اللہ کی زمین پر فساد پھیلا چیلوں کا خیال ہے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ انسان دیوانہ ہے اور اس کی دیوانگی کا یہ اقتضا ہے کہ وہ اپنی ہی نسل کو نیست و نابود کرے ...."

"سانپ کی طرح کہ خود ہی کھا جائے" چیل ملکہ بولی۔

"چیلوں کو ڈر ہے کہ گدھ پر بھی دیوانگی کے دورے پڑنے لگے ہیں وہ نہ ہو کہ یہ بھی جنگل کے باسیوں کو ختم کرنے کی کوشش کرے اسی لیے چیل ملکہ دعوی دار ہے کہ راجہ گدھ اور اس کی برادری کو جنگل بدر کا حکم سنایا جائے۔"

گیدڑ نے پنجے سے اپنی ناک کھجلائی اور تحمل سے بولا "کیا تو وضاحت کر سکتا ہے کہ دیوانگی کیا چیز ہے؟؟"

سرخاب نے مدد طلب نظروں سے ملکہ چیل کی طرف دیکھا

ملکہ چیل بولی "ہاں دیوانگی کی کچھ علامتیں ہیں جو ذی روح اپنے آپ کو یہ

اپنے ہم جنسوں کو خود ختم کرنے کی کوشش کرے وہ دیوانہ ہوتا ہے۔“

گیدڑ نے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر کہا ”تو کیا گدھ خودکشی کا یا پھر قتل کا مرتکب ہوا؟“

جیل جاتی میں تھوڑا سا خوف پھیل گیا۔

”ابھی نہیں ابھی آغاز ہے ابھی گدھ دیوانگی کے انجام کو نہیں پہنچا بھی چاند راتوں میں پچھلے پہر یہ ٹالوں میں آوارہ پھرتا ہے ایسی آوازیں حلق سے نکالتا ہے جیسے تپتے ہوئے لوہے پر پانی کے چھینٹے یہ دیوانگی کا آغاز ہے فضل جج دیکھے گا کہ بہت جلد راجہ گدھ اس انتہا کو پہنچنے والا ہے یہاں پہنچ کر آج کے انسان نے اپنے ہم جنسوں کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے پھر کوئی طاقت اسے جنگل کے جانوروں کو ختم کرنے سے نہیں روک سکے گی۔“

”کیا یہ گدھ ہمیشہ سے دیوانہ تھا؟“

”نہیں پہلے یہ ایسے نہیں رہتا تھا جیسے اب رہتا ہے اس کی اڑانیں بھی تھکا دینے والی تھیں اور یہ بھی رزق حلال کھاتا تھا لیکن اس نے کہیں چوری چوری رزق حرام کا تصور انسان سے سیکھا انسان حیلہ جوئی اور مکر سے کماتا ہے بھائی کا حق غصب کرتا ہے اپنوں کی دشمنی میں غیروں سے مل کر کماتا ہے صلہ رحمی کا کیال نہیں کرتا ہر آنے والے مال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا بانٹ کر نہیں کھاتا بلکہ چھین کر کھاتا ہے جو کھا نہیں سکتا اسے کتے کی طرح چھپا کر رکھ چھوڑتا ہے حرام روزی کے انسان کو اتنے گر آتے ہیں جتنے گھونسلے بنانے کے طریقے ہمیں یاد ہیں انسان پہلے رزق حرام سے واقف نہ تھا نہ ہی راجہ گدھ کو اس کا علم تھا۔“

بھوری لم ڈوری جو طبعاً خبطی تھی چلائی ”بتا بتا کیسے کیسے واقف ہوا۔“

سرخاب اٹھا اور خطیب کی طرح گویا ہوا ”صاحبو! رزق حلال کا مسئلہ اول جنت میں طے ہو چکا ہے پہلے بابا آدم اور اس کی حوا حفظ و اماں سے جنت میں رہتے

تھے اور بموجب حکم الٰہی بہشتی لباس پہنتے تھے اس وقت ان پر بہشت کا ہر میوہ جنت کا ہر پرندہ ہر جانور حلال تھا لیکن وہ حرام کھانے کے مرتکب ہوئے حرام کیا ہے؟ وہ جس سے منع کر دیا جائے حضرت آدم نے وہ گندم کا دانہ کھایا جس کی ممانعت کی گئی تھی پہلی بار ان کے جسم میں منفی لہریں داخل ہوئیں اب تک ان کی سرشت صرف نیکی کی طرف راغب تھی اب اس میں تضاد شامل ہوا۔"

"اس بات سے تیرا کیا مطلب ہے سرخاب وضاحت کر" چنڈول بولے۔

"بات صرف تی ہے کہ جو کوئی رزق حرام کھاتا ہے وہ یا تو خود دیوانہ ہو جاتا ہے یا اس کی آنے والی نسلیں بعد کو دیوانی ہو کر رہتی ہیں۔ اب جنگل جاتی بہت خوش ہوئی اور چودنی جنگل بدر جنگل بدر جس طرح حضرت آدم جنگل بدر ہوئے۔ ویسے ہی وہی سزا جنگل بدر جنگل بدر۔"

"مبول کیا تو دیوانہ ہے؟" راجہ گدھ سے سیمرغ نے سوال کیا۔

"ہاں آقا کبھی کبھی چاندراتوں میں جب میں اونچے چھتنارے درختوں پر بیٹھا ہوتا ہوں۔ خود بخود میرا جسم گر پڑتا ہے اور میری حالت طرح اپنے بس میں نہیں ہوتی میں ایسی راہوں میں ج نکلتا ہوں۔ جن کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔"

"کیا رزق حرام کھانے کا مرتکب ہوا" سیمرغ نے سوال کیا۔

"ہاں آقا! میں حرام رزق کھانے کا مرتکب ہوا میں اپنا شکار خود نہیں کرتا لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھ میں دیوانگی اس رزق حرام کھانے کی وجہ سے پیدا ہوئی کہ دیوانگی نے مجھے رزق حرام کھانے پر مجبور کیا۔"

گیدڑ نے اپنی دم کو پٹک کر کہا "آقا یہ بات خلاف قانون ہے میں یہاں گدھ کی وکالت کو موجود ہوں جب تک مجھ سے طے نہ کی جائے۔ راجہ گدھ سے بازپرس نہیں ہو سکتی۔"

سرخاب نے حالت کو ہاتھ میں لے کر کہا "کیا کوئی وضاحت کرنا چاہے گا

کہ راجہ گدھ نے انسان سے رزق حرام کھانا کیونکر سیکھا؟"

مینا نے اٹھ کر بات شروع کی "جب حضرت آدم نے توبہ کی اور ان کے رب نے توبہ قبول کی تو پھر دنیا میں حضرت آدم کے لیے تمام پاک اور طیب چیزوں کو مہیا کیا گیا۔ لیکن وہ رزق حرام جو وہ بہشت میں کھا چکے تھے۔ اس کے اثرات ان کی نسلوں میں آگے کی طرف بڑھنے لگے۔ یہی رزق حرام کھانے کی سزا مقرر ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا۔ تو حضرت آدم کے لہو میں چھپی ہوئی دیوانگی باہر نکلی یہ ضروری ہے آقا رزق حرام کا اثر پشت ہا پشت جاتا ہے۔ جس وقت کوے نے قابیل کو لاش ٹھکانے لگانے کے گر سمجھائے۔ تو انسان نے اپنی فہم و فراست سے جانا کہ پرندے بیوقوف ہیں اور راز اگلنے میں تامل نہیں رکھتے۔ اس وقت انسان نے طے کیا کہ وہ نباتات، جمادات، چرند پرند حیوانات سب کو اپنے تابع کر کے رہے گا۔ آقا گدھ نے انسان سے رزق حرام کھانے کا سبق سیکھا یہ بھی داستان ہے آقا بہت لمبی لیکن اتنی بات طے ہے کہ جو کچھ بھی دیوانگی اس وقت گدھ میں مقسوم ہے۔ یہ سبق اس نے صرف انسان سے سیکھا ہے۔"

گیدڑ نے سرے پنڈال میں تین چکر لگائے اور پھر سر جھکا کر بولا اتنی بات طے ہے آقا کہ گدھ نے دیوانگی کا الزام قبول کر لیا ہے؟ کیا میں ٹھیک سمجھا ہوں۔"

"ٹھیک ٹھیک ٹھیک "چاروں طرف سے آوازیں آئیں۔

"اس دیوانگی کی وجہ رزق حرام ہے جو گدھ کھاتا ہے وہ عرصے سے مردار پر پل رہا ہے اور اپنا شکار خود نہیں کرتا اسی رزق حرام نے اس کے لہو میں فساد کی وہ شکل پیدا کر دی ہے جسے پاگل پن کہتے ہیں کیا میں ٹھیک سمجھا ہوں۔"

"ٹھیک ٹھیک ٹھیک۔ بلند درختوں سے آواز آئی۔

"اور چیل جاتی کا خیال ہے وہ جو کوئی بھی حرام رزق کھاتا ہے اگر خود دیوانہ نہیں

ہوتا تو اس کی آنے والی نسلیں اس سے ضرور متاثر ہوتی ہیں۔ اس کے لہو میں ساخت کچھ اس طور پر بدلتی ہے کہ بالآخر دیوانہ پن اسی رزق حرام کی وجہ سے اس کی پشتوں میں ظاہر ہونے لگتا ہے کیا میں ٹھیک سمجھا؟"

"سوچ لو دلو! ۔۔۔ قلو! الزام درست ہے لیکن بات قابل غور ہے کیا یہ مسئلہ سرشت کا نہیں؟ کیا کوئی پرندہ کیا کوئی جانور اپنی مرضی سے رزق حرام کھا سکتا ہے؟ غور طلب بات صرف اتنی ہے کہ کیا گدھ جاتی کی سرشت میں حرام کھانے کی ترغیب پہلے سے موجود تھی کہ اب پیدا ہوئی عقل کے استعمال سے اس نے حرام کھایا؟

سوچ لو صحبو! سرشت کی مطابقت گناہ نہیں آپ سب کو سوچنا پڑے گا کہ کیا گدھ جاتی اپنی مرضی سے رزق حرام پر راغب ہوئی کہ کہ یہ اس کی سرشت کا مسئلہ تھا کہیں ہم اس کے رب اور اس کے درمیان دخل در معقولات کرنے والوں میں سے نہ ٹھہریں سرشت کا معاملہ بیڈھب ہے۔"

تمام پرندے اللہ کی دی ہوئی سرشت کے سہارے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اپنی جبلت سے پرے ان کی زندگی اندھیر تھی وہ ہولے ہولے ٹکڑیوں میں اڑنے لگے سارے میں یہ بات پھیل گئی کہ پرندے اپنی عقل سے اللہ کی دی ہوئی سرشت سے بغاوت کر رہے ہیں! سانپ دیر تک جنگل میں رینگ رینگ کر یہ خبر سب کو سناتے رہے۔

عابدہ کے چلے جانے کے بعد میرے پاس اپنی نوکری کے علاوہ اور کوئی ایسا سہارا نہ تھا جسے میں لاٹھی بنا سکتا کھوکھلی روح اور خالی جسم سے ناطہ بنانے میں میرا سارا وجود غار کی طرح ہو گا بھابھی صولن ان کے دونوں بیٹے اور بھائی مختار مجھ سے اتنے دور رہتے۔ جیسے سکرین پر چلنے والی فلم اپنے تماشائیوں سے دور ہوتی ہے۔ یہ

وہ وقت تھا جب میں تمام تر قوت کے ساتھ اپنے آپ کو کسی ایک خاص مشن کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔

میرے السر کی تکلیف پہلے سے بہت بڑھ گئی تھی۔ رات کے پچھلے پہر معدے میں جلن ہونے لگتی تو میں اٹھ کر شیشن پر چلا جاتا اور ٹہلنے لگتا۔ لیکن اب میں ڈاکٹر فیضی کے مشورے کے مطابق اپنی زندگی کو مثبت طریق سے گزارنے کا آرزو مند تھا ۔ دو دھڑی سے پر اور جذباتی شعلہ سامانی سے تہی زندگی۔

یہ بھی پروفیسر کہیل کا مشورہ تھا۔

اچانک ایک دن پھر وہ مجھے ریڈیو سٹیشن پر مل گیا۔ ایسے ہی ایک دن مجھے سیمی بھی اس کے ساتھ ملی تھی ۔ وہ سٹوڈیو میں سے کسی پروگرام میں شرکت کے بعد باہر نکل رہا تھا۔ ہم دونوں چپ چاپ ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ اس نے مجھ سے کسی قسم کے سوال جواب کیے بغیر اپنی چمک دار مسکراہٹ پیش کر دی اور میں اسے اپنے دفتر میں لے گیا۔

"یہاں کیا کرتے ہو؟ ۔ مائی ڈیر سٹوڈنٹ۔"

"ملازم ہوں سر۔"

میں نے چائے کے لیے چپراسی سے کہا اور وہ میرے سامنے بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔

"السر کا کیا حال ہے ۔ ٹھیک ہو گیا ہے ابھی تک anxiety کے شکار ہو؟"

ویسا ہی ہے۔"

تھوڑی دیر تک وہ چپ رہا۔

"میرا خیال ہے تم نے ٹھیک طور پہ یوگا کیا نہیں ورنہ افاقہ ہوتا۔"

"میں ۔ کوئی سمت نہیں مقرر کر سکا ابھی۔"

" میں آج کل ٹی ایم کرتا ہوں۔ اس سے بہت آرام ملتا ہے

meditation سے سکون ملتا ہے۔"

"میں اندر سے اس قدر پراگندہ ہوں کہ concentrate نہیں کر سکتا سر۔ دراصل مجھکو معلوم نہیں کہ مجھے کیا چاہیے۔ میں کس لیے پریشان ہوں میں ہر وقت سوچتا رہتا ہوں کہ کسی وقت غبار اترے تو میں اصلی پریشانی کو برہنہ دیکھوں۔"

وہ مسکراتا رہا پھر بڑی دیر بعد بولا "دیکھو اگر کوئی آدمی زیادہ دیر بے سمت ہو کر پریشان رہے تو وہ دائمی پریشان ہو جاتا ہے۔ اگر غم دکھ اور ہیجان کی ایک نقلی سی وجہ بھی ہو۔ تو وہ اس پر قابو پالیتا ہے۔ تم کو پتہ ہونا چاہیے کہ آخر اس پراگندگی اس anxiety اس تذبذب کی اصلی بنیادی وجہ کیا ہے؟ اگر معلوم نہیں تو ایجاد کر لو آرام میں رہو گے۔"

"سوچتا ہوں سوچتا رہتا ہوں بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ لیکن ایک اکیلی وجہ نہیں ہو سکتی سر"

"میں تمہیں ایک مشورہ دینا چاہتا ہوں فری بغیر چارج کیے" سہیل نے مسکرا کر کہا۔

ضرور دیں سر سو مشورے دیں"

تم کو اپنے آپ کو کوئی سمت دینی ہو گی کوئی مشن اپنانا پڑے گا۔ کوئی goal کوئی منزل ورنہ تم خالی بجرے کی طرح سمندری لہروں میں بھٹکو گے کبھی بحر قلزم میں کبھی بحیرہ عرب میں۔"

"میں اس قابل نہیں ہوں۔ میں کوئی مشن اپنا نہیں سکتا تو تھینک یو۔"

وہ بڑی دیر تک میرا چہرہ دیکھتا رہا۔

"بچے ارد گرد دیکھو جو لوگ زندگی میں کوئی مشن بنا لیتے ہیں۔ چاہے چھوٹے سے چھوٹا کیوں نہ ہو۔ وہ السر کا شکار نہیں ہوتے پیغمبروں کی زندگی غور سے دیکھو۔ وہ بڑی سے بڑی ذاتی قربانی دے کر بھی السر کا شکار نہیں ہوتے

کوئی ٹریجڈی انہیں ہلا نہیں سکتی   بے نام جستجو   بے مصرف تلاش

زندگی میں ایک مشن ہو   چاہے بالکل چھوٹا مثلاً بہتر کینو کا باغ لگانا   پاکستان کے بے نئی قسم کی گندم بونا   پلاسٹک کی ڈوری سے قالین بننا   کسی بچے کو سی ایس پی کرنا۔''

''ہاں ہے''

کیا..... ہے سر؟''

''میں اب انیسویں گریڈ کے لیے کوشش کر رہا ہوں   پھر میں پروفیسر ہونے کی کوشش کروں گا   میں پاکستانی طلبا کو تعلیم دینے کا مشن لے کر تمہارے کالج میں آیا تھا   لیکن رفتہ رفتہ مجھے پتہ چلا کہ وہ مشن میرے بس کا نہیں۔ اسی بے میں نے اپنی تبدیلی نیو کیمپس میں کرالی۔   تعلیم جب سے عام ہوئی ہے لوگ تعلیم کی تلاش میں نہیں رہے اس لیے میں نے اپنا مشن بدل لیا ہے   میں اب فقط بچی زندگی بنانا چاہتا ہوں۔''

میری نظر میں کوڑا اکھٹی ہوئی جس نے مجھے اس کے متعلق پہلے یہ خبر دی تھی

''کیا تمہیں غریبوں سے ہمدردی ہے کبھی تم کسی بوڑھے چھابڑی والے کو دیکھ کر اداس ہوئے ہو   پرانے چیتھڑے جمع کرتی عورت کو دیکھ کر تمہارا دل پگھلا ہے ہے؟ سہیل نے سوال کیا۔

میں نے غریبی کے متعلق کبھی سنجیدگی سے سوچا نہیں۔   حالانکہ میں خود قلندر کی زندگی بسر کرتا ہوں۔'' میں نے لجاجت سے جواب دیا۔

''پھر تو مشکل ہے میں تمہیں کیموزم پر کچھ کتابیں دینے والا تھا۔ لیکن وہ بھی ویگا کی طرح تمہارے کام نہ آسکیں گی۔''

''پھر؟''۔

تمہیں فنونِ لطیفہ سے دل چسپی ہے؟ مصوری، شاعری، ناول نگاری وغیرہ اگر تم چاہو تو تمہارا aggresuion تمہاری anxiety کسی cration میں ڈھل سکتی ہے۔"

"میں شاید پیدائشی آرٹسٹ نہیں ہوں سر۔"

"جبلی طور پر آرٹسٹ ہونا ضروری نہیں آرٹ کو مشن کے طور پر روی کی نوکری کے طور پر استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔"

"شاید میں اس کا اہل نہ ہو سکوں۔" میں نے معذوری ظاہر کی۔

"میرا خیال تھا کہ تم تم کو غریبی کی طرف توجہ دینی چاہیے اس کا reapek بہت بڑا ہے ساری تھرڈ ورلڈ اس سے متاثر ہے۔ پڑھنے کے لیے ہمدردی کرنے کے لیے اپنے آپ کو جذب رکھنے کے لیے اس سے بڑا اور کوئی مشن نہیں ہو سکتا۔ کمبوڈیا سے چلتے آؤ پاکستان تلے ادھر پورا افریقہ پڑا ہے۔ روڈیشیا گھانا نائیجیریا چاہو تو ساؤتھ امریکہ کے مسائل میں بھی وقت گزار سکتے ہو۔"

"اس کا فائدہ؟۔"

بھائی میرے بیمار ذہن کے مالک کسی کے فائدے کے بے مشن نہیں ہوتا؟ اس کا فائدہ ہمیشہ مشن والے کو ہوتا ہے بڑے سے بڑا مشن ہو کائناتی قسم کا تو آدمی اللہ کا پیارا بن جاتا ہے۔ گھٹیا کوالٹی کا آدم ساز ہو تو اپنے آپ کو آرام و سکون حاصل ہو جاتا ہے۔"

میں بڑی دیر چپ رہا۔

"اچھا یہ دروازہ مقفل لگا اب یہ بتاؤ عشق کر سکتے ہو راہ مول ا حاصل قسم کا بغیر حصول کی آرزو کے وہ تمہارا سارا وجود، سارا تخیل ساری انا کو جذب کر لے گا۔"

"مجھ میں عشق کی اب تاب نہیں ہے شاید بھی کے بعد "

"مذہب سے کوئی دلچسپی ہو؟ مذہبی لگن سے بھی اس دنیا میں نام پیدا کیا جا سکتا ہے۔"

"میری تربیت گاؤں کی ہے۔ دیہات میں مذہب بڑا سادہ ہوتا ہے۔ باقی زندگی کی طرح اس لیے میری معلومات کم ہیں۔"

"ہاں میں دیکھ چکا ہوں۔ اگر تم میں وہ جوہر ہوتا تو یوگا کرنے سے ضرور چمکتا بچوں سے دلچسپی ہے؟ چھوٹے بچوں کو دیکھ ان کی جوتیاں سیدھی کرنے کو دل چاہتا ہے؟"

"بھائی کے دو جڑواں بچے ہیں۔ کبھی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"پھر تو مشکل ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ شادی کروا کے تم اپنی زندگی کے منہ زور گھوڑے پر کاٹھی ڈال سکتے ہو۔"

"میں نے کبھی سوچا نہیں سنجیدگی کے ساتھ شادی کے متعلق مگر میرا کیس بالکل بگڑا ہوا ہے۔"

اس نے پیار سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "قیوم! میں نے کئی سال تمہاری طرح گزارے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ E.S.P پر کتابیں پڑھنے سے telepathy wypuosis اور dairvonce کے متعلق پڑھتے رہنے سے مجھے اتھ ہو گا میں astral travel کے پیچھے لگا رہا۔ دھرم ایمان نروان کے دروازے کھٹکھٹائے لیکن اب میری سمجھ میں ایک بات آ گئی ہے۔"

"کیا بات؟"

"پانچ کینڈل پاور کا بلب لاکھ امپیئر بڑھا دو ہمیشہ پانچ کینڈل پاور کی روشنی دیتا ہے۔ ہم لوگ چھوٹے چمچ میں دیگ بھر پانی ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چمچ میں صرف چمچ بھر پانی آ سکتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا مشن بدل لیا ہے۔ میں اب صرف اپنی job کی مشکلات کے متعلق سوچتا ہوں۔ کون کون سی

سفارش چلے گی۔ کس کس level پر کیا کیا کوشش کرنی پڑے گی۔ "میں کسی ideal کے بے معاشرے سے اپنے آپ سے لوگوں سے نہیں لڑتا۔"

"آپ جھوٹ بولتے ہیں سر۔ آپ تو اتنی بڑی بڑی تھیوریاں بناتے ہیں بہت سوچتے ہیں۔"

"خدا قسم یہ سچ ہے۔ میں نے وہ سب سوچیں نکال دی ہیں سر سے۔ اب میں دلجمعی سے پرسوں امریکہ جاؤں گا۔"

"امریکہ۔"

"وہاں چھ مہینے لیکچر دوں گا۔ امریکہ روحانی طور پر اس وقت بنجر ہے۔ پانی چاہتا ہے میں اپنی ہاٹی لے جاؤں گا۔ ایسے چھینٹے اڑاؤں گا کہ بارش کا گمان ہوگا حرام وحلال کی تھیوری بیان کروں گا سب سے میرے بیٹے یہ بہت ہے۔"

"کیا کرنے جا رہے ہیں۔ امریکہ۔؟"

"سٹڈی ٹور کروں گا تفریح کے اوقات میں وہاں کے لوگوں کو یہ یقین دلاؤں گا کہ مشرق کے پاس روحانیت کے خزانے ہیں۔ ہم لوگ رتی بھر مادہ پرست نہیں ہمیں اشیاء کی محبت نہیں۔ ہم ایک اور سمت کے لوگ ہیں۔ ان کے اندر احساس خلا اور احساس کمتری پیدا کرنے کی کوشش کروں گا۔ واپسی پر گریڈ کا کوئی پرابلم نہیں ہوگا نو پرابلم "

میں نے سر جھکا لیا۔

"دیکھو مجھے چھ مہینے لگیں یا دو سال تم اس دوران صرف اپنی نوکری پر دھیان رکھنے کی کوشش کرنا میری واپسی کا انتظار کرنا اور اس دوران ادھر ادھر مت جھانکنا۔ ہر بات کو اپنی job کے ساتھ link کرنا اگر کسی طرح یہ مشن فیل ہو جائے تو پھر شادی کر لینا آرام سے زیادہ سوچے سمجھے بغیر لیکن شادی آخری solution ہے۔ کوشش یہ رکھنا کہ نوکری واحد خدا ہو تمہاری زندگی کا مرکز کبھی

کبھی اس مشن کی لت پڑ جائے تو آدمی دور نکل جاتا ہے اور بڑا بندھا رہتا ہے مرکز سے باہر نہیں نہیں نکل جاتا۔ میں نے سر اٹھا کر سہیل کی طرف دیکھا۔ پہلی بار اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اور چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی۔ مسیحا تھری پیس سوٹ پہنے ہاتھ میں سگار لیے اپنے علاج کی بے بسی کے سامنے خود کھڑا رو رہا تھا۔

سہیل کے امریکہ چلے جانے کے بعد کافی حد تک اپنی نوکری کے بارے میں اور بھی سنجیدہ ہو گیا۔ پہلے میرا معمول تھا کہ اگر مجھے بھائی مختار کی موٹر سائیکل ادھار نہ ملتی تو میں سامدہ کلاں سے چل کر کرشن نگر کے اختتامی شاپ تک پیدل آتا۔ راستے میں ہرے بھرے کھیت تعفن بھرے پانیوں میں لہلہا رہے ہوتے۔ کرشن نگر کے شاپ سے میں بس میں سوار ہوتا اور پلازہ کے چوک پر بس سے اتر جاتا۔ یہاں سے مجھے پھر پیدل ریڈیو سٹیشن پہنچنا ہوتا اس لیے سفر اور پڑاؤ کے چوک پر بس سے تر جاتا۔ یہاں سے مجھے پیدل ریڈیو سٹیشن پہنچنا ہوتا۔ اس لیے سفر اور پڑاؤ کے یے مجھے کافی وقت اور سوچیں درکار ہوتی تھیں۔ بچپن جوانی اور لڑکپن کے چھوٹے چھوٹے واقعات ذہن پر ابھرتے رہتے۔ میری ہمیشہ آرزو ہوتی کہ کہیں کوئی واقف کار نہ مل جائے۔ جس کے ساتھ کی وجہ سے خیالات کا تانتا ٹوٹ جائے۔ ان ہی سفروں کے دوران میں چند راہ میں گزارے ہوئے دن' ماں کی موت' ابا کی گمشدگی' سیمی اور عابدہ کی جدائی کا تجزیہ کرتا۔ ان کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کا پرتا لگاتا لیکن اس سارے تجزیے اور پوسٹ مارٹم سے نہ میں کبھی کسی اہم نتیجے پر پہنچ سکا اور نہ ہی کوئی فیصلہ کن سبق سیکھنے کی نوبت آئی۔ جس طرح خلائی ہوا باز ایک خاص لباس میں ہی سفر کر سکتا ہے۔ میں بھی شادوں کی ایک خاص رضائی اوڑھ کر یہ سفر کرنے کا عادی تھا۔ اس لیے سہیل کے مشورے کے بعد جو پہلا مثبت کام میں نے کیا۔ وہ موٹر سائیکل کی خرید تھی۔

نئی موٹر سائیکل میں نے بھائی مختار سے پیسے ادھار لے کر خریدی تھی اور انہوں نے مجھ میں دنیا داری کے آثار سر نکالتے دیکھے تو بخوشی ادھار دے دیا۔ موٹر سائیکل کی سواری میں یہ خوبی ہے کہ یہ برق رفتار گھوڑے کی طرح بڑی انا بخشتی ہے۔ اس قدر خطرے کے باوجود آدمی اپنے آپ کو کافی پائیدار سمجھنے لگتا ہے۔

ڈاکٹر کپل کے مشورے کے بعد نئی سائیکل' ریڈیو کی تازہ نوکری اور ریڈیو پر آنے جانے والی رنگ برنگ لڑکیوں کے باعث ایک بار پھر میں اپنے آپ کو کافی حد تک نارمل سمجھنے لگا۔ اب کنٹین سے چائے منگوا کر سکرپٹوں کو ہاتھ میں لے کر لڑکیوں سے باتیں کرتا۔ تو میرا رویہ برادرانہ کھردرا نہ اور لاتعلق نہ ہوتا۔ بلکہ اس میں انا کی خوشبو سی ہوتی۔

گو میں اس جنس سے چونکیل جانور کی طرح خبردار ہو گیا تھا۔ کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر بتاتی رہتی تھی کہ یہ وہ لڑکیاں ہیں جن کے ہاتھوں میں کسی دوسرے سٹیشن کا ٹکٹ ہے' یہ میرے پلیٹ فارم پر رکیں گی۔ کوکا کولا انہیں کی اپنی پسند کا میگزین خریدیں گی اور پھر ہاتھ ہلاتی کسی اور شہر کے لیے کسی اور ٹرین میں سوار ہو جائیں گی۔ اس بے ریڈیو سٹیشن پر جہاں آنسو گیس زیادہ پھیلی ہوتی ہے۔ میری آنکھیں بہت خشک تھیں اور میں بہت محتاط بھی رہتا تھا اور ملا جلا بھی

ریڈیو سٹیشن کا محکمہ عام محکموں سے قدرے مختلف ہے۔ سرکاری دفتروں میں مرد عورتیں اس طرح مل کر کام نہیں کرتے۔ اور اگر کرتے بھی ہیں تو عام دفتر کی طرح بیرونی طور پر ان میں بڑا رکھ رکھاؤ اور خشک دفتری پن موجود ہوتا ہے۔ ٹیلی ویژن کے کام کی نوعیت ریڈیو سے ملتی جلتی ہے لیکن یہاں بھی بورژوا اور انگریزی خواں طبقے کی حکمرانی کے باعث ماحول میں ایک خاص قسم کا تصنع اور خشکی ہوتی ہے۔ فلمی دنیا میں بھی عورت اور مرد بہت قریب رہتے ہیں۔ لیکن وہاں بھی وہ فضا نہیں ملتی جو ریڈیو سٹیشنوں پر ہوتی ہے۔ کیونکہ فلمی کارکنوں میں وہ ہلکا سا حجاب' شعریت

فصلوں کی کسک نہیں ہوتی جو آرٹ سے وابستگی کے باعث دونوں جنسوں میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

ریڈیو سٹیشن پر اگر عملدولی طور پر ادب پرست' موسیقی نواز' ورداوہ۔ ڈرامہ نہ بھی ہو۔ تو ریڈیو کی روایات ہی ایسی ہیں کہ اچھے شعروں پر سر دھننا' مناسب لے پر داد دینا' مکالمے کی چست ادائیگی پر قربان ہونا سب کا شیوہ ہے۔ یہاں پہنچ کر طوائف آرٹسٹ بن جاتی ہے۔ مراثی ضلع جگت کا بادشاہ نظر آتا ہے۔ یہاں فلمی دنیا والے ٹھٹھوں اور پھکڑ بازی نہیں ہوتی۔ ایک ہلکا سا غلاف تعریف و تحسین کا' ایک سطحی سی اخلاقی پابندی ایک غیر محسوس آرٹ نوازی سب پر چھائی رہتی ہے' کاتب سے لے کر انجینئر تک چپراسی سے لے کر آر ڈی صاحب تک طبلہ نواز سے لیکر ساؤنڈ ریکارڈسٹ تک چھوٹی اناؤنسر سے لیکر تجربہ کار نیوز براڈ کاسٹر تک سب اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ ادب نواز موسیقی پرست اور ڈرامہ شناس ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے ریڈیو سٹیشن کی فضا ہمیشہ ملن رت سے مشابہہ رہتی ہے۔ یہاں بھی ضرور تیں چلتی ہیں۔ جھگڑے ہوتے ہیں explanstions طلب کی جاتی ہے۔ ادھار مانگے جاتے ہیں۔

ڈیکلیں خراب ہوتی ہیں۔ چغلی میٹنگ جاری رہتی ہے۔ وہ سب کچھ چلتا ہے۔ جو دفتروں میں چائے کے ساتھ ساتھ چلا کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ریڈیو سٹیشن پر ایک موسم ہوتا ہے جو ملن رت سے مشابہہ ہے۔ ادب نوازی' موسیقی اور ڈرامے کی ہلکی پھوار جنس مخالف سے مسلسل ملاقات کی رت۔

میں ریڈیو سٹیشن پر ایسے ہی موسم میں افضل کو ملا۔

افضل شکلاً و عقلاً ریڈیو سٹیشن کے لیے کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ موسیقی کے پروگراموں سے گو میرا کوئی واسطہ نہیں تھا۔ لیکن اس شکل جیسے اور ہیئت کی عورتیں یہاں وہاں

ملتی رہتی تھیں۔ لیکن اس کی ذات کا مجھ پر مثبت یا منفی کبھی کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ مختلف پروڈیوسروں کے کمرے میں بیٹھی پائی جاتی۔ رسمی باتوں کے علاوہ اس سے بات کرنے کی کوئی نوبت کبھی نہ آئی۔ ریڈیو پر بظاہر وہ بڑی مقبول تھی۔ ہر ایک ٹھٹھہ مذاق کرنا‘ خوش دلی سے دوسروں کے مذاق سہنا‘ وقت بے وقت سازندوں کی مالی مدد کرنا‘ باوردی چپڑاسیوں کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان کے گھر والوں کی خیریت پوچھنا۔ امیر آرٹسٹوں سے بلا تکلف لفٹ مانگ لینا‘ نوجوان لڑکیوں سے سکرپٹ مانگ کر پڑھنا اور چھچھے جملوں پر داد دینا‘ موسیقی کے پروڈیوسروں کی بظاہر بے عزتی کرتے ہوئے در پردہ ان کی خوشامد کرنا اور باوجودیکہ اسے اب پروگرام ملنے بند ہو گئے تھے۔ باقاعدگی سے ہفتے میں دو بار ریڈیو سٹیشن آنا اس کا نام نیبل تھا۔

اصل کی آواز ریگستانی عورتوں کی طرح کھلکھی تھی۔ جوانی میں اس کی آواز میں شاید وہ جادو ہو گا جسے بیڈروم سیکسی کہتے ہیں۔ لیکن اب تو کبھی کبھی جب وہ جوش میں ہوتی تو اس کے جھجے کے جملے غائب ہو جاتے اور آواز نہ نکلتی۔ کئی سالوں سے وہ چھوٹے شہروں میں لگنے والے تھیٹروں میں گا رہی تھی۔ ان میلوں میں کئی بار مائیکروفون کے بغیر بھی آواز لگانا پڑتی تھی۔ اس لیے اس کی آواز سے نزاکت‘ شستہ پن اور ملائمت غائب ہو چکی تھی۔

سب سے پہلی بار میں نے اسے دیکھا تو وہ قاضی کے کمرے میں بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس نے فل میک اپ کر رکھا تھا۔ برقعے کا نچلا سیاہ کوٹ جسم پر تھا اور نقاب کرسی پر لٹک رہا تھا۔ اس نے کوئی تازہ لطیفہ سنایا تھا۔ جس کی وجہ سے کمرے میں بیٹھے ہوئے قاضی کے تین حواری ہنس رہے تھے۔

میں نے قاضی سے ایک مقبول ریکارڈ کی ڈسک مانگی تو اصل بولی ”بتایئے سر جی یہ آپ کے قاضی صاحب مجھے کوئی پروگرام کیوں نہیں دیتے۔“

”بی بی میں کلاسیکی موسیقی کا انچارج ہوں۔“ قاضی بولا۔

”تو پھر میں کوئی فوک سنگر ہوں۔ میں نے بھی آخر استاد جے خاں سے تعلیم حاصل کی ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بی بی لیکن تمہاری آواز میں خراشیں پڑ گئی ہیں۔لوگ ایسی آواز کو پسند نہیں کرتے اب۔“

”میرا کیا قصور ہے سر جی آپ بتائیں۔ یہ پچھلے ریڈیو سٹیشن کی بات ہے۔ میں گانے کے لیے آئی تھی۔ پورے دس بجے رات کو مجھے مالکونس کا پروگرام کرنا تھا۔ میں بیٹھی تھی آر ڈی صاحب کے دفتر میں تب نگینہ آئی نگینہ کو آپ جانتے ہیں سر جی؟“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”میری مقبولیت سے بیر تھا اسے آتے ہی چمٹ گئی مجھ سے باجی باجی کہتے منہ سوکھتا تھا اس کا مجھے پان دیا۔

”یہ بات اب پرانی ہو چکی ہے اصل بہتر ہے کہ اب اسے نہ سنایا کرو سب جانتے ہیں۔“ قاضی نے چڑ کر کہا۔

”سب جانتے ہوں گے لیکن یہ تو نئے ہیں ریڈیو پر کیوں جی نئے ہیں ناں ... آپ سر جی۔“

”ہاں۔“

”تو جی مجھے دیا ہے پان نگینہ نے کشتی کا پان میں نے کیا کھایا۔ آواز بیٹھ گئی۔ وہ تو اللہ سائیں نے مجھے عقل دی پان تھوک دیا میں نے کہیں جو سارا کھا جاتی تو گونگی ہو جاتی پوری۔“

”دیکھو تم کہیں آیا گیری کر لو اب تمہارے یہی دن ہیں“ قاضی نے ہنس کر کہا۔

”کر تو سوں سر جی پر آج کل کے خانساموں کا بھی taste اچھا ہو گیا وہ اب

بیگموں پر نظر رکھتے ہیں۔ آپ کی طرح۔ مجھے نکلوادیں گے کھڑے کھڑے
سب قہقہہ مار کر ہنس دیے۔

"کتنی عمر ہے تمہاری احتل؟ قاضی نے سوال کیا۔

"اگلے سال بیالیس کی ہو جاؤں گی انشا اللہ۔"

"کے سالوں سے بیالیس کی ہو رہی ہے" قاضی نے گستاخانہ پوچھا"

"میں لیپ ایئر میں پیدا ہوئی تھی جی کیا کروں چار سال بعد بڑتھ ڈے آتا ہے میر۔" بوڑھی اور نئی کونپل جیسی نئی تھی۔ عمر اس کے جسم سے جھڑتی رہتی اور اس کے ہونوں پر چڑھتی چلی جاتی۔ کبھی وہ پانچ سال کے بچے کی طرح معصوم ہوتی۔ کبھی بوڑھی نائیکہ کی رطح تجربے کار ٹرانٹ بے حس بن جاتی۔ وہ ذہنی جسمانی روحانی کئی قسم کے مرضوں میں مبتلا تھی اور کئی قسم کی بیماریوں سے شفایاب ہو چیک تھی۔ زندگی میں اسے ان گنت ٹیکے لگ چکے تھے اور کئی بیماریوں سے شفایاب ہو چکی تھی۔ زندگی میں اسے ان گنت ٹیکے لگ چکے تھے۔ اور کئی بیماریون سے وہ اپنے تجربے کی بنا پر اب تندرست ہو چکی تھی۔ اس کا جسم سٹیٹھک فائر کی طرح بے جان تھا اور اس کے سانس سے بی کمپلکس، انٹی بائیوٹک کوڈ لور آئل اور ملٹی وٹامنز کی خوشبو آتی تھی۔ بیماریوں کی شفایابی کے باعث ہی لگتا تھا کہ وہ بیالیس سے کئی گناہ زیدہ سال اس کرہ ارض پر بسر کر چکی ہے۔ دراصل احتل صرف زندہ تھی۔ وہ زندگی پر کسی قسم کی تنقید نہیں تھی اسی سے مل کر مجھے پتہ چلا کہ اچھا یا برا کچھ نہیں ہوتا۔ بس واقعات ایک دوسرے کے نقش قدم پر ابھرتے رہتے ہیں۔ جو اپنی ذات کو تکلیف دیں۔ وہ برے لگتے ہیں۔ حالانکہ کبھی کبھی وہ برے نہیں ہوتے اور کچھ واقعات راحت پہنچاتے ہیں۔ اس سے اچھے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ بھی قابل تعریف نہیں ہوتے۔ اچھے یا برے کی کائناتی حیثیت کچھ نہیں۔ ہر انسان اپنی ذات کو مرکز مان کر اچھے اور برے کا گراف بناتا ہے۔ اسی لیے تمام واقعات بالآخر کائناتی صفر میں داخل ہو جاتے

ہیں۔ ورسی لیے ان سے باقی لوگ زیادہ دیر تک متاثر نہیں رہ سکتے۔

اس روز مجھے ڈرامہ جھنبھورر یکارڈ کرنا تھا۔ میں نے کاسٹ کو دس بجے کا ٹائم دیا تھا۔ جب میں ریڈیو سٹیشن پہنچا پورے گیارہ بجے تھے اور اصل barrier کے اس طرف کھڑی دربان سے فصیح زبان میں جھگڑ رہی تھی۔ چہرے کا سیاہ نقاب الٹا ہوا تھا۔ ہاتھ میں موچس اور سگریٹ کی ڈبیا تھی۔ چہرے پر فل میک اپ اور منہ میں پان موجود تھا۔

"اوے ککھ نہ رہے تیرا تو اس وقت پیدا نہیں ہوا تھا۔ جب سے میں ریڈیو سٹیشن پر چی آ رہی ہوں شمشاد بیگم کا نام سنا ہے امراضیا بیگم کا نام جانتا ہے تو بہ ہاہو ان کے بعد کس کا نام چڑھا تھا۔ اصل العزیز کا نہیں جانتا مجھے اب بھی۔"

دربان بڑے مزے سے ٹین کی کرسی پر بیٹھا تھا اور شانتی سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا "ہو گا جی آپ کا بڑا نام لیکن آر ڈی صاحب کا حکم ہے آپ اجازت نامہ دکھائیں سیکورٹی معاملہ ہے کوئی ہماشما اندر نہیں جا سکتا۔"

"او میں پرانے ریڈیو سٹیشن سے یہاں آتی ہوں۔ آر ڈی بدلتے رہتے ہیں حکومتیں آتی جاتی ہیں آرٹسٹ وہی رہتے ہیں ریڈیو کے حرام خور اصل وہی رہتی ہے۔"

"ہاں جی رہتی ہو گی لیکن آپ اندر نہیں جا سکتیں۔"

اپنے آپ کو مجبور پا کر اصل نے دو تین بھاری جان دار گالیاں دیں اس وقت میں جلدی سے موٹر سائیکل پر گزر جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے مجھے پکڑ لیا۔

"اے قیوم صاحب زکنا ذرا جی اس سور کے تخم سے کہہ دیں میری ریکارڈنگ ہے اب گیارہ بجے رہے ہیں۔ ابھی ریہرسل بھی کرنی ہے۔"

میں نے دربان سے سفارش کرنے کے لیے کہا یار دلایت علی پرانے

آرٹسٹوں کا خیال رکھا کرو۔"

"اب یہ کیا پتہ چلتا ہے سر جی کون نیا ہے اور کون پرانا؟ کچھ شکل پرانی ہوتی ہے لیکن وہ آرٹسٹ نئے ہوتے ہیں۔ کچھ کی شکل نئی لگتی ہے پر جی وہ آرٹسٹ پرانے ہوتے ہیں۔"

"اچھا اب تو ان کو جانے دے ناں۔"

"جائیں جائیں سر جی پر بات تمیز سے کیا کریں۔"

"بکی نہ جا اپ شرمندہ ہو کر خصم نوں کھا نا حرامی۔"

ان کا خیال رکھا کرو یہ آرٹسٹ لوگ جلالی طبیعت کے ہوتے ہیں۔"

"ہاں جی ان کی طبیعت کی وجہ سے یہ جہنم میں جائیں گے انشاء اللہ"

ولایت علی نے جل کر کہا۔

"لے کچھ کھا پیا کر جان کو لگے "اب برقعے کی جیب سے پانچ روپے نکال کر احتل نے دربان کو دے دیے۔ دونوں ہنسنے لگے اور احتل آگے چلی گئی۔

یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ احتل کو آئندہ کی کوئی فکر نہ تھی اس کے پاس وہ آخری پانچ روپے تھے جو اس نے دربان کو بلا وجہ دے دیے۔ دراصل وہ ہر کام کرنے کے بعد ہر حادثہ سہہ گزرنے کے بعد ہر قسم کے پچھتاوے سے آزاد تھی اس کی زندگی لمحہ تک چلتی تھی اسی بے ماہ و سال مل کر اس کا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکے۔ وہ وقت کے بھاری ہتھوڑے سے ہر لحظہ بے پرواتھی۔

بھنبھور ڈرامہ ریکارڈ نہ ہو سکا۔ عین ریہرسل کے دوران ہیروئن کو کاسٹ میں سے کسی نے کوئی چبھتی بات کہہ دی۔ ناہید بڑی نازک مزاج تھی فوراً اٹھی آر ڈی صاحب سے رپورٹ کی اور گھر چلی گئی۔ براڈ کاسٹ میں ابھی چھ دن باقی تھے لیکن بڑے دنوں کے بعد میرے السر میں درد شروع ہو گیا۔ ساؤنڈ لفلٹ کی ڈسک اور سکرپٹوں کی کاپیاں لے کر اپنے دفتر میں لوٹا چار بجے ہوئے تھے۔ احتل میرے

دفتر میں بیٹھی سگریٹ پی رہی تھی۔ اس کے برقعے کا اوپر والا حصہ کرسی کی پشت پر لٹک رہا تھا اور پلاسٹک کے بٹنوں والے کوٹ نما برقعے میں وہ پھنسی ہوئی تھی۔

" جی فرمایئے " میں نے سرد مہری سے پوچھا۔

" اب دیکھیے یہ وقت ہو گیا ہے مجھ کے پیاسے اب ریکارڈنگ ختم ہوئی ہے "۔

میں چپ رہا۔

" ان میوزک والوں کی عقل دیکھیں میں کورس والیوں کے ساتھ گا رہی تھی اور حمیدہ گا رہی تھی لیڈ پر آپ خود انصاف کریں اس کی اتنی آواز ہے کہ لیڈ گا سکے؟"

میں نے سگریٹ دراز میں رکھے اور چڑ کر کہا اچھا گاتی ہے حمیدہ اور پھر ہر آرٹسٹ کا ایک ٹائم ہوتا ہے اس کے بعد لوگ اسے قبول نہیں کرتے۔"

اصل ناک سکوڑ کر بولی اچھا جی یہ تو ہم لوگ جانتے ہیں کہ وہ کیسا گاتی ہے بے کم سری ایسی کم سری پنچم پر جا کر تو اس کا گلا پھٹ جاتا ہے بھس ہو جاتی ہے آواز۔"

"پبلک کو پسند ہے یہ بھس۔"

" سارا قصور ان ریڈیو والوں کا ہے جس کو پروگرام ملیں۔ وہ آپی مقبول ہو گا ساری بات تو موقعہ ملنے کی ہے۔"

" آخر اس میں کیا خوبی ہے کہ اس کو پروگرام ملتے ہیں؟ کبھی سوچا آپ نے۔ میں نے سوال کیا۔

ہاں یک خوبی ہے اس میں۔"

" کیا " میں اکتاہٹ کے آخری سرے پر تھا۔

"جوان ہے نخرے آتے ہیں ادائیں دکھاتی ہے پروڈیوسروں کو لو بناتی ہے۔"

"پہلی اور آخری یہی عورت کی خوبی ہے۔"

یکدم اصل ڈھیلی پڑ گئی۔

"سر جی آپ آر ڈی صاحب سے میری سفارش کر دیں ناں میرے گھٹنوں میں درد رہنے لگا ہے اب تھیٹروں میں کام نہیں کر سکتی' خدا قسم کئی کئی گھنٹے کھڑے رہنا پڑتا ہے۔"

مجھے اس پر ہلکا سا ترس آ گیا۔

"کیا سفارش کروں؟"

"کم از کم چار بکنگ تو دے دیا کریں مہینے میں دیکھیں ناں نازیہ تو چھ چھ بار بک کر لیتے ہیں وہ۔ مجھ سے کون سے بہتر گاتی ہے۔"

"یہ بھی تمہارا خیال ہے اس کا وقت بھی منتیں کرتے نکلتا ہے۔"

"ہماری عمر ہی ترلے منتوں کی ہے سر جی پر یہ ریڈیو والے معاف کرنا بہت چندرے ہیں۔ عمر بڑی عورت کو ڈرا گھاس نہیں ڈالتے سارے پروگرام لڑکیوں کو دیتے ہیں بوڑھی عورتوں کے رول بھی لڑکیوں سے کراتے ہیں۔"

"وقت وقت کی بات ہے اصل تم کو بھی گھاس ڈالا ہو گا جوانی میں ریڈیو والوں نے۔"

وہ چپ ہو گئی۔

ریڈیو سٹیشن پر تین قسم کی خواتین آرٹسٹوں سے ملاقات رہتی تھی ایک وہ گلوکار اور ڈرامہ والی عورتیں اور لڑکیاں تھیں۔ جن پر رائے عامہ سے مقبولیت کی مہر لگ چکی تھی۔ جو اے کلاس میں شمار ہوتی تھیں۔ ان کے پیچھے پیچھے بھاگنا' چاپلوسی کرنا' پان سگریٹ آفر کرنا' اپنے کمرے میں بلا کر ریڈیو کے باقی عملے پر تبصرہ کرنا' کچھ دوسرے آرٹسٹوں کی چغلی سے دل بہلانا۔ ہمارا شیوہ تھا۔ دوسری ان آرٹسٹ لڑکیوں کی تھی جو گانے یا ڈرامے کے پروگراموں کے لیے بسنت کے دن نیلا

آسمان بن کر آیا کرتی تھیں۔ ہر پروڈیوسر جانتا تھا' کہ ان لڑکیوں میں talent کی واضح کمی ہے اور یہ شاید کبھی بھی اچھی پرفورمنس نہ دے سکیں۔ لیکن ان سے چھیڑ چھی جانی چاہیے۔ یہ لڑکیاں گانے کا پروگرام ڈرامے کا پارٹ یا casual اناؤنسمنٹ کے پیے آتی تھیں۔ ایسی لڑکیوں کے ساتھ کنٹریکٹ پر سائن کرواتے وقت' برآمدوں میں' سٹوڈیو کے اندر' لفٹ کا انتظام کرواتے وقت کاروں کے دروزوں تک پہنچاتے ہوئے خوش دلی سے باتیں ہوتی تھیں اور ہم لوگ ہلکا پھلکا محسوس کرتے تھے۔

تیسری قسم سب سے قابل ترس تھی۔

افضل نے لمبی سانس لی اور دکھ سے بولی " یہ آپ کا قاضی بہت بے حیا آدمی ہے۔ دیکھا نہیں آپ نے کتنی لڑکیاں گھسی رہتی ہیں اس کے کمرے میں۔"

" قاضی اچھا آدمی ہے۔ ہنس مکھ اور ملنسار۔"

" سو واری عشق کرے ان چھپکلیوں سے لیکن پروگرام تو ہمیں دے نا آرٹسٹوں کو۔

" اگر وہ لڑکیوں کو پروگرام نہ دے تو کبھی وہ آ کر بیٹھیں اس کے پاس۔ پھر وہ عشق کس سے کرے۔"

" آپ بھی ایسے ہی ہیں ہرجی؟"

" ہاں کچھ کچھ"

ہم دونوں ہنس دیے۔

ریڈیو سٹیشن پر بھائی چارے' بے تکلفی اور عجیب قسم کے بیچ کی فضا رہتی ہے۔ بوڑھے آرٹسٹوں کو کوئی آپ کہہ کر نہیں بلاتا۔ بڑی عمر کی عورتوں کے ساتھ اپنے سے چھوٹوں کی طرح بولنا' ہنسی مذاق' جگت شیام گھات سب چلتا ہے۔ اسی لیے اس فضا میں کئی بار سالوں کا سفر لمحوں میں کٹ جاتا ہے۔ افضل اور میں بھی اس ملاقات

میں بڑے قریب آگئے۔

''کیا عمر ہے تیری احسل؟ میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے پوچھا۔

''بتیس سال سر جی''

''یہ کم بخت سارے لوگ مجھے ابھی سے باجی کہنے لگے ہیں۔کم بختوں کو شرم نہیں آتی بھی میں سب کے سامنے بچوں کے پروگرام میں ترانے گایا کرتی تھی۔کل کی بات ہے۔''

'' لیکن پچھلے ریڈیو سٹیشن کی باتیں تو تمہیں خوب یاد ہیں'

''لیں بچے کو سب کچھ یاد ہوتا ہے۔''

''لیکن قاضی کے کمرے میں تو تم کہہ رہی تھیں کہ تمہاری عمر پچیس برس ہے۔''

'' کیا کریں قاضی صاحب اسی بات سے خوش ہوتے ہیں سر جی۔ خدا قسم ہماری پروفیشن میں جسم ویسے ہی ڈھل جاتے ہیں۔ میری ماں پچاس کی ہے لیکن ستر کی لگتی ہے۔''

میں نے اسے زیادہ زچ کرنا مناسب نہ سمجھا۔

'' ایک بات بتاؤں آپ کو؟''

'' بتاؤ''

'' آج میری کوئی ریکارڈنگ نہیں تھی ہمیں تو کوئی کورس میں بھی چانس نہیں دیتا جی۔''

جھوٹ بول کر اس پر قائم رہنا احسل کے بس کی بات نہیں تھی۔

مجھے احسل پر یکدم بڑا ترس آیا کوئی کوئی عورت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔ وہ چاہے ستر برس کی کیوں نہ ہو جائے اسکے اندر کچھ ایسا دوشیزہ پن موجود رہتا ہے کہ مرد کا دل اسے دیکھ کر موم ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا احسل ہمیشہ تو ایسی نظر نہیں آتی تھی۔لیکن کبھی کبھی اچانک وہ بڑی معصوم بڑی کنواری اور کھوئی ہوئی نظر آنے لگتی۔

ایسے لمحوں میں اسے دنیا سے بچانے کو جی چاہنے لگتا۔

جھنجھوڑ ڈرامے کی ریکارڈنگ کے لیے دوسرا دن ڈیڈ لائن تھی۔

میں چاہتا تو ناہید کی جگہ کسی اور لڑکی سے کام نکال سکتا تھا۔ لیکن مجھے نازک مزاجوں سے بڑا عشق ہے۔ ریڈیو سٹیشن کی نوکری بھی مجھے اسی لیے پسند آ گئی۔ کیونکہ یہاں بھی چپے۔ ٹوٹے بنگلے' ازب' ملائم سب نازک مزاج تھے۔ خاص کر وہ آرٹسٹ جن کی ضرورت پروڈیوسروں کو کم تھی اور جن کی نازک مزاجی اس ضرورت کو کمتر کر دیتی تھی۔

ناہید سے معافی مانگ کر اس کی انا کو بحال کرنے کے لیے میں ہیرا منڈی گیا۔ میں اپنی نئی موٹر سائیکل پر سوار تھا۔ اس کی نمبر پلیٹ ہینڈل سیٹ سب چمک رہے تھے۔ موٹر سائیکل نیو ہو ور پنا ہو تو یوں لگتا ہے جیسے عربی گھوڑا رانوں تلے آ گیا ہے اور آدمی زمین کے بجائے بادلوں میں اڑ رہا ہے داتا دربار سے آگے دو رویہ سڑک پر رش نسبتاً کم محسوس ہوتا ہے۔ سڑک کی دوسری جانب نالے سے ادھر دل پیچی ڈوروں کے تانے پر کچھ مزدور صورت مانجھا پھیر رہے تھے۔ ہیرا منڈی کو دراصل دو راستے جاتے ہیں ایک لیڈی ولنگڈن کے پہلو سے ہو کر بادشاہی مسجد کے عقب تک پہنچتا ہے۔ دوسرا اور اپیلے گھاٹی نما سڑک سے گزر کر ہیرا منڈی پہنچتا ہے۔ میں بادشاہی مسجد والے راستے پر بڑے خطرناک طریقے سے موٹر سائیکل چلاتا بازار میں داخل ہوا۔ اس سے پہلے نہ کبھی میں ناہید کے گھر گیا تھا نہ ہی ان گلیوں سے واقف تھا۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد میں ناہید کی گلی میں جا نکلا۔ ناہید کے گھر کے بالکل سامنے رنگی بینڈ والوں کا چوبارہ تھا۔ اور اس وقت وہ پگڑیاں سروں پر لپیٹے کلارنٹ' بھونپو' باجے' تاشے اور ڈھول اٹھائے تنگ سیڑھی سے اتر رہے تھے۔ گلی صاف

ستھری و سنسان تھی۔ بینڈ والوں کے کوٹھے پر ان کا بورڈ نصب تھا جس کے نیچے رقم تھا کہ باوردی آنے کے ریٹ مختلف ہیں۔

جس وقت اکا دکا سر بجاتے راتی بینڈ والے نکڑ پر غائب ہو گئے۔ میں نے چوتھی مرتبہ ہارن بجایا۔ لیکن ناہید کے سہ منزل مکان سے کوئی برآمد نہ ہوا۔ اس سے پہلے گھنٹی بجانے پر بھی کوئی باہر نہ نکلا تھا۔ اس کے بعد میں نے دروازے کا کنڈا تختے سے بجانا شروع کر دیا۔ جس وقت ایک سات آٹھ سالہ لڑکی باہر نکلی۔ میرا ارادہ ناہید کو کاسٹ کرنے سے بالکل اکتا چکا تھا۔

بڑے محرابی پھاٹک کے پیٹ میں بنے ہوئے طاقچہ نما دروازے سے وہ باہر نکلی اندر ایک بھینس بیٹھی جگالی کرنے میں مشغول تھیں اور مشین چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

"ناہید بی بی ہیں؟"

لڑکی نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آرام سے کھڑی املی کھاتی رہی۔

کیا ناہید بی بی کا یہی گھر ہے؟"

وہ آرام سے کاغذ چاٹنے میں مشغول تھی۔

" منی میں ریڈیو سٹیشن سے آیا ہوں کیا یہ ناہید کا گھر ہے؟ ریڈیو آرٹسٹ ناہید کا۔"

اب منی کی زبان فر فر چلنے لگی۔

"اچھا جی آپ ریڈیو سٹیشن سے آئے ہیں۔ باجی تو صبح کی ریڈیو سٹیشن گئی ہوئی ہے ناشتہ بھی نہیں کیا اس نے بابا علیا آج صبح ٹکسالی سے نہاری لایا تھا۔ باجی نے وہ بھی نہیں کھائی خدا کی قسم صبح بی بی نے اتنے جھڑکے دیے باجی کو تین بار میک اپ کرنا پڑا باجی کو۔"

تین بار کیوں؟"

وہ میری کم عقلی پر ہنس دی باجی رو رہی تھی صاحب جی۔ پوڈر تھوڑی ٹھہرتا

تھا اس کے منہ پر۔"

"جھڑ کے کیوں دیے بی بی نے۔"

"ریڈیو سٹیشن نہیں جاتی تھی باجی بی بی کا غصہ ہی برا ہے پرسوں باجی گلزار کے منہ پر کھینچ کے چپیڑ ماردی تھی۔ باجی گلزار گری منجے پر پاوا لگا گال پر دو ٹانکے لگے۔ پھر سارا دن بی بی بیٹھی روتی رہی۔ اپنے منہ پر چپیڑیں مارے اور روئے ہائے ہائے اپنا مال آپی داغلی کرلیا میں نے صاحب جی ریڈیو سٹیشن کیا ہے؟" چھوٹی سی لڑکی بڑی پکی باتیں کررہی تھی۔

"کبھی اپنی باجی کے ساتھ آ کر دیکھ لینا۔

"باجی کہیں نہیں لے جاتی جی۔ کہتی ہے میری پوزیشن خراب ہوتی ہے۔"

میں اس شہزادے سے پتہ نہیں کب تک باتیں کرتا رہتا لیکن اسی وقت کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "کیوں سر جی اس وقت کہاں چوری چوری؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا افضل کھڑی تھی سرخ ہونٹوں تلے اس کے نسواری دانت بھی مسکرارہے تھے۔

"آئیں ناں غریب خانے پر"

"آج نہیں افضل آج مجھے ڈرامہ جھنجھور ریکارڈ کرنا ہے۔"

"ناں ناں لارا چھوڑیں ہمارا رواج نہیں کہ ایک بار پھنسے شکار کو چھوڑ دیں ..... چلیں آپ۔"

"یہ باجی سے ملنے آئے ہیں ریڈیو سٹیشن سے لڑکی نے قہر بھری نظروں سے افضل کو دیکھ کر کہا۔"

"کیوں ایک تیری باجی کے ملنے والے ہیں ریڈیو سٹیشن پر اور کسی کا کوئی ملنے والا نہیں وہاں چل تر و۔"

یکدم لڑکی نے مرا بازو تھام لیا

"بی بی مجھے مارے گی صاحب جی۔"

"اوئے ہوئے وڈی بھلی چل جا کر بتا اندر اپنی کتی بی بی کو اصل لے گئی ہے ریڈیو والے صاحب کو جا کھڑی کیوں ہے؟ ان کے گھرانے نے تو دہلیز میں تعویذ دبا رکھا ہے جو کوئی اندر داخل ہو گیا باہر جو گا رہتا ہی نہیں چلیں سر جی فوراً یہاں سے۔"

ب ایک بازو میرا شہرزار کے ہاتھوں میں تھا اور دوسرا اصل تھامے ہوئے تھی

"مجھے ریڈیو سٹیشن پہنچنا ہے منی میری ریکارڈنگ ہے۔"

باجی کے ساتھ؟

"ہاں باجی کے ساتھ۔" منی نے بازو چھوڑ دیا۔

"خدا کے لیے سر جی ایک بار میرے گھر چلے چلیں میری عزت بن جائے گی "؟

اصل گڑگڑائی

میں شہزادے نظریں ٹرا کر اصل کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

ہم تھوڑی دور گئے تھے کہ منی بھاگی ہوئی ہمارے پاس آئی اور گھبرا کر بولی "

بی بی مجھے مارے گی آپا جی آپ انہیں ساتھ نہ لے جائیں۔"

"چل مشٹنڈی خبردار جو پیچھا کیا ہمارا پتہ نہیں میرا۔"

لڑکی خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ میں شہزادے کے ساتھ لوٹنا چاہتا تھا لیکن اصل میں کچھ ایسی بات تھی کہ میں خوفزدہ ہو گیا۔

گلی تنگ اور خاموش تھی دو رویہ پرانی وضع کے چھجے اور شہ نشینوں والے مکانات تھے جن پر پرانے پینٹ کے جالی دار دروازے اور بوسیدہ کھڑکیاں اس وقت سختی سے بند تھیں۔ رات کو یہاں سے موسیقی کی آواز اور گھنگھروؤں کی جھنکار نکلتی ہو گی اس وقت ان مکانوں کے پٹ کھلتے تو کھانستے ہوئے بڈھے پان کھاتی ادھ کھلے

امرود جیسی عورتیں اور مٹھیوں میں پیسے بھینچے بچے باہر نکلتے۔ گلی ویران تھی۔ جوان پیشہ ور عورتیں اس وقت رات جاگے چوکیداروں کی نیند سو رہی تھیں اپروائی منزلوں سے گندا پانی رس رس کر گلی کی نالیوں میں پڑ رہا تھا پرانے گھروں کی دیواروں میں پیپل کی کونپلیں پھوٹ آئی تھیں۔ یہ گلی بالکل شانت تھی اس کا رات کے کاروبار کے ساتھ دن کے وقت کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کے اندر باہر اس وقت ٹوٹے ہوئے میلے جیسی اداسی تھی۔

"دیکھو اجمل میری ریکارڈنگ ہے پورے گیارہ بجے ساری کاسٹ جمع ہو گی۔ پھر انجینیر وقت دے سکے یا نہ دے سکے اب مجھے جانے دو۔"

اجمل کے گھر کے سامنے میں نے منت سے کہا۔

"سر جی آپ کی بڑی مہربانی ہو گی کہ آپ آج میرے گھر چل کر ایک بوتل پی لیں۔ خدا قسم سارے محلے میں میری بڑی عزت ہو جائے گی۔ اب تو کئی سالوں سے میرے گھر نہ کوئی فلم والا آیا ہے نہ ریڈیو سٹیشن سے کسی نے خبر لی ہے۔"

باہر ڈیوڑھی میں اپنی موٹر سائیکل پارک کر کے ہم دونوں اندر صحن میں داخل ہوئے ان صحن کے اردگرد کمرے ہی کمرے تھے۔ آنگن میں ڈھیلی چارپائیاں پڑی تھیں ان چارپائیوں پر رنگ برنگ مختلف عمروں کے لوگ بیٹھے ہم دراز اور لیٹے ہوئے تھے جا بجا بڑی برتنوں کے ٹوکرے کوڑے کی ٹوکریاں، پرانے کپڑوں کے انبار پڑے تھے بچے رو رہے تھے عورتوں کے بولنے کی آواز آ رہی تھی ریڈیو چل رہے تھے حساب ہو رہے تھے عورتوں کے بولنے کی آواز آ رہی تھی ریڈیو چل رہے تھے حساب ہو رہے تھے یہ گھر کسی کا گھر نہیں تھا اور سب کا گھر تھا بہت سا بے مصرف سامان زائد چہرے اور فرنیچر کی وجہ سے یہاں سب کچھ فالتو اور بیکار نظر آتا تھا۔

اجمل میرا بازو تھامے بڑے فاتحانہ انداز میں صحن میں داخل ہوئی میں اس کی ٹرافی تھا اور وہ مجھے جیت کر لائی تھی ہم دونوں بغلی سیڑھیوں سے اوپر والی منزل میں داخل

ہوئے یہاں بھی نچلے کمروں کی طرح چاروں طرف کمرے ہی کمرے تھے لیکن اوپر والی منزل میں داخل ہوئے یہاں بھی نچلے کمروں کی طرح چاروں طرف کمرے ہی کمرے تھے لیکن اوپر والی منزل قدرے غیر آباد تھی صحن کی جانب کھلنے والی کھڑکیاں بند تھیں۔ کمرہ بے ترتیب تھا ایک پرانا پلنگ تھا جس پر بوسیدہ کھیس اور نسواری رنگ کی شنیل کی رضائی پڑی تھی الماری کے پٹ بالکل کھلے تھے اور ان میں ٹھنسے ٹھنس بغیر تہہ کیے ہوئے کپڑے الٹے رہے احمل نے کمرے میں گھستے ہی اماری کے پٹ بند کر کے اس کے سامنے کرسی رکھ دی بوسیدہ صوفے پر چڑھ کر پھر سڑک کی جانب کھلنے والی کھڑکیاں کھولیں اور مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"یہ اتنی ساری مخلوق یہاں رہتی ہے احمل تمہارے ساتھ؟"

"ہاں سر جی ہمارا رواج ہے ہم لوگ اپنے بزرگوں کی بہت عزت کرتے ہیں"

وہ اپنا دوپٹہ اتار کر صوفہ جھاڑنے لگی۔

"یہ سب تمہارے بزرگ ہیں بچے لڑکیاں سب؟"

"کچھ بزرگ ہیں کچھ رشتہ دار ہیں۔ اچھا یہ بتائیں کو کا پئیں گے لینا۔"

"احمل سچ پوچھو تو کچھ بھی نہیں ریکارڈنگ ہے میری۔"

"چائے سبز قہوہ؟"

"چلو چائے سہی۔"

اب اس نے دوپٹہ رقعہ سب پلنگ پر پھینک دیا اور اندر صحن کی جانب کھلنے والے چھجے کی طرف چلی گئی۔

"بی بی بی بی جی چائے بھجوائیں اوپر پارٹی آئی ہے" پشت سے وہ بالکل بیالیس برس کی معلوم نہ ہوتی تھی اس کے کولہے کمر کندھے پچیس برس کی جوان عورت کے نظر آ رہے تھے جب وہ صحن کی طرف کھلنے والے دروازے کی چٹخنی لگا کر اندر آئی تو اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی تھی۔

"پارٹی کا کیا مطلب ہے احمل؟"

اس نے آنکھ مار کر کہا "سر جی پارٹی گاہک ہوتا ہے اب وقت بدل گیا ہے گاہک کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

میں کچھ گھبرا کر بولا "لیکن میں تو پارٹی نہیں ہو احمل"

"سر جی کیا بتائیں میری عزت بن جائے گی محلے میں آپ کا کیا جائے گا ویسے بھی اب تو میرے مہمان کی بی بی خاطر ہی نہیں کرتی اب تو فیروزہ کے دن ہیں۔"

"فیروزہ کون؟"

"میری چھوٹی بہن ہے سر جی اچھے پیسے لاتی ہے مجروں سے۔ اس کی خاطریں ہوتی ہیں اس کے مہمانوں کو ککڑ بھون بھون کر کھلاتی ہے میں تو چائے بھی منگوا لوں تو بی بی کو غصہ چڑھ جاتا ہے۔"

پتہ نہیں مجھے کیوں احمل پر شدید ترس آ گیا۔ جب آدمی اندر سے شدید بحران کا شکار ہو چکا ہو اور تنہائی کے دشت میں بہت گھوم پھرے تو عموماً وہ اپنے سے بڑی عمر کی عورت سے محبت کرنے لگتا ہے کیونکہ اسے ماستا کی سکورٹی درکار ہوتی ہے شاید یہی وہ لمحہ تھا جس میں ایک لاحاصل رابطے کا شکار ہوا۔

مجھے اس کے بوڑھے جسم میں دوشیزگی کی ادائیں دیکھ کر ایسی تکلیف ہو رہی تھی کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں اسے اس کی جوانی کہیں سے لا کر لوٹا دیتا دراصل یہی وہ وقت تھا جب مجھے بھاگنا چاہیے تھا کیونکہ وہ بھی میری طرح ادھ موا گرگ تھی اس گدھ کی ساری زندگی بیابانوں میں اجڑے محلوں میں سوکھے پیڑوں پر کٹی تھی لیکن ہم مشرب کو سامنے پا کر مجھ سے بھاگا نہ گیا اس میں کچھ ایسی گرمی جاذبیت اور خوبصورتی تھی کہ مجھے تھوڑی دیر کے لیے السر کا درد بھی بھول گیا۔

"میری بی بی بھی بہت بدقسمت ہے بیچاری۔ اگر اس کے گھر پانچ بیٹوں کی جگہ

پانچ بیٹیاں ہوتیں تو آج راج کرتی بی بی پر ایسی ٹھنڈی قسمت ہے بی بی کی دے لڑکا پے لڑکا دے لڑکے پر لڑکا جو کہیں فیروزہ پیدا ہوتی تو ہم سب تو فوت ہو مر جاتے۔ خدا قسم بی بی تو اسے بھی میرا قصور سمجھتی ہے اس کا بس چلے تو اس کی سزا بھی مجھے ہی دے۔"

پہلی بار میں ایک ایسی سوسائٹی میں داخل ہوا تھا جہاں بیٹے کی پیدائش غم انگیز امر تھی "پانچوں بہوئیں بھی تو آئی ہوں گی اسی گھر میں؟"

"ہماری طرف بہو پیشہ نہیں کرتی سر جی۔ پیشہ صرف بیٹی کرتی ہے۔"

"اس کی کیا وجہ ہے اصل"

"بظاہر تو کوئی وجہ نہیں سر جی صرف رواج ہے لیکن شاید صرف بیٹی ہی ماں کو سارا کچھ دے سکتی ہے، بہو ہمیشہ کرے تو بھی ساس کو کچھ دے؟ پھر پیشہ کرانے کا فائدہ؟"

اس وقت میں سوشیالوجی کا ایک پرانا طالب علم اصلی معنوں میں طالب علم بنتا ہے۔

"اصل یہاں کس قسم کی لڑکی اچھی طوائف بنتی ہے کچھ تو نشانیاں ہوں گی ناں؟"

"ہاں سر جی نشانیاں پکی ہوتی ہیں۔ جس لڑکی کی آنکھ بولے ہونٹ دعوت دیں چلتے میں کوٹھے لگیں تبھی بات ہے سر جی۔ جس کا جسم نہ بولتا ہو وہ ادھر بھی گرہستن رہتی ہے، آپ کے شہر میں بھی بیچاری بچے پالتی مرتی ہے عورت کا تو انگ انگ بولتا ہو تو کام بنتا ہے" میری نگاہوں میں گم سم بجھا بجھا صولت کا چہرہ گھوم گیا۔

"ادھر تمہاری طرف بھی کچھ Status وغیرہ کا چکر ہے اصل۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟"

"یعنی کچھ جتھے وغیرہ کچھ ذات برادری کا چکر اونچ نیچ۔"

وہ ہنسنے لگی۔

''تو سر جی اونچ نیچ کا چکر کہاں نہیں چوروں میں اس کا چکر سمگلروں میں اس کا چکر کچھ چور صرف نقدی سونا چرانے والے ہوتے ہیں۔ کچھ بھینس بکری کھول کر لے جاتے ہیں۔ کچھ صرف گٹروں کے ڈھکنے اٹھاتے ہیں۔

''اور تمہارے ہاں؟''

''ہمارے ہاں بھی سر جی تین طبقے ہیں۔ اونچا طبقہ امیر ڈیرے دار طوائفیں، درمیانہ طبقہ عزت دار غیرت دار لوگ رسم و رواج کے پابند تیسرے غریب مندے حال سب سے راندی ہوئی بھیڑے حال اور ٹکیائی ہوتی ہے۔ جسے ہونٹ لال کرنے جوگے پیسے بھی نہیں ملتے۔ اس کا پیٹ سینہ سب سپاٹ ہوتا ہے۔ بالوں میں پلاسٹک کے کانپ جسم پر نائیلون کے ایسے پرانے کپڑے جن سے پسینے کی بو آتی ہے۔ اس ٹکیائی کے کئی حرامی بچے ہوتے ہیں۔ ایک بیمار شوہر ہوتا ہے کئی ہرجائی مفت خورے آشنا ہوتے ہیں۔ یہ سوتی بھی بار بار ہے اور کاروبار بھی اس کا ادھر پر چلتا ہے۔ شوہر اس کا مارنے والا چرسیا ہوتا ہے۔ وہ سر جی کئی چکیوں میں پستی ہے۔ کبھی شوہر کی چکی میں کبھی بچوں کی چکی میں کبھی غریبی کبھی ادھار کی چکی میں، تیس تک پہنچتے پہنچتے تو اس کا صرف چھپڑا باقی رہ جاتا ہے ہڈیوں پر آپ کو ایسی طوائف نظر آ جائے تو آپ ناک پر رومال رکھ لیں۔ یہ جو آپ کے ادیب شاعر لوگ ہیں۔ وہ بھی ایسی طوائف کی کہانی نہ لکھیں اس پر کون غزل کہے؟ گندی نالی کے پاس کون بیٹھے بتائیے؟''

میں غور سے اصل کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ بہت تجربہ کار اور بوڑھی نظر آ رہی تھی۔

''دوسرا مڈل کلاس طبقہ ہے سر جی جس طرح آپ کی مڈل کلاس عورت شریف ہوتی ہے۔ رسم رواج کے ہاتھوں ہماری مڈل کلاس عورت پر بھی بڑی پابندی ہوتی

ہے۔

اس پر اخلاقی معاشرتی ذہنی کئی پٹیاں کسی ہوتی ہیں۔ یہ گروہ نہ کرو کی ٹکور لگی ہوتی ہے ان کے سر پر انہیں بھی شریف زادیوں کی طرح عشق کرنے کی اجازت نہیں ہوتی"۔

"وہ کیوں"

"طوائف کا تو ازلی دماغ خراب ہے۔ ادھر اس کو عشق ہوا ادھر وہ بھاگ جائے گی۔ سارا کاروبار ٹھپ اسی لیے تو کنجر، نائیکا گھر والے سب اسے ذرا دھمکا کر رکھتے ہیں۔ وہ عزت، غیرت، نفع نقصان، لین دین پردہ بے پردگی، کئی قسم کے نظریات میں جکڑی ہوتی ہے۔ نماز روزہ منذر نیاز، عاشورے کونڈے گیارھویں شریف گنڈہ تعویز دم درود سب اس کی زندگی پر چھائے ہوتے ہیں۔ دراصل وہ بھی آپ کی مڈل کلاس عورت کی طرح بڑی جذباتی وہمی اور ڈرپوک ہوتی ہے سر جی جو رقم وہ کماتی ہے سیدھی ماں کے پاس پہنچتی ہے۔ کیونکہ مڈل کلاس کی عورت کو اپنی ماں سے بڑا پیار ہوتا ہے۔ اس پیسے سے اس کے بھائی بوسکی کی قمیصیں پہنتے ہیں عطر لگاتے ہیں۔ بلیک میں ملنے والے سگریٹ پھونکتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ہر مڈل کلاس عورت کی طرح ڈنڈی مار کر رقم بچانے لگتی ہے۔ کسی کسی گاہک سے علیحدگی میں کچھ رقم موس لیتی ہے۔ پھر اس رقم سے پان مٹھائی کھانے کا آرام ہو جاتا ہے کا سٹیم جولیری خریدی جا سکتی ہے"۔

"اور اخلاقی طور پر یہ مڈل کلاس کی طوائف کیسی ہوتی ہے اصل"۔

شریف ہوتی ہے سر جی عموماً اسے شراب، جوئے اور اپنے پیشے سے نفرت بھی ہوتی ہے۔ آپ کی مڈل کلاس عورت کی طرح لیکن اس کا حسن بھی دو روزہ ہوتا ہے۔ عمر ڈھلنے پر چاہے وہ اچھی گانے والی ہو چاہے ٹھمکا مچانے والی سب اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں سب کے سب"۔

میں نے اصل کی جانب دیکھا۔ وہ سر سے پاؤں تک چھوڑی ہوئی مڈل کلاس طوائف تھی۔

"صرف اسی کو شادی کا شوق ہے۔ جتنی عورتیں ہیرا منڈی سے نکاح کے شوق میں بھاگ گئی ہیں وہ سب اس طبقے سے تعلق رکھتی ہیں۔ گرہستی کے شوق میں یہ ساری ساری عمر کنجری ہونے کا طعنہ سنتی ہیں اور کبھی لوٹ کر پیشہ کرنے نہیں جاتیں ان کی عقل ہمیشہ ان کو خراب کرتی ہے ان کا دل ہمیشہ ان کی مٹی پلید کرتا ہے۔"

"وہ سرجی ہر جگہ عیش کرتی ہے۔ آپ کی طرف ہو تو ایک مرد کی دولت اس کا نام شہرت اس کے کام آتا ہے۔ ادھر کی ہو تو کئی امیر آدمیوں کے گھروں میں سیندھ لگ جاتی ہے۔ آپ کا شاعر جب غزل کہتا ہے اس طبقے کی طوائف پر کہتا ہے فلم بنتی ہے تو اس کو سامنے رکھ کر کہانی لکھی جاتی ہے تو وہی نظر میں ہوتی ہے مشنٹڈی نہ نماز نہ روزہ لے دے کر ایک مذہب ہے اس کا کالے کپڑے پہن کر بڑھیا فرانسیسی خوشبو لگا کر مجلسوں میں جانا سرجی جس عورت کے منسٹر تلوے چاٹیں جاگیردار ہاتھ جوڑیں اونچا افسر جس کے گھر میں ٹائی اتار کر بیٹھے بھلا اس کے کیا کہنے؟ اللہ ادھر منڈی میں تو پیدا کرتا سرجی پر کسی اونچی ڈیرے دار طوائف کے گھر۔"

اس اصل سے میں واقف نہ تھا۔ وہ بڑے تسلسل اور تجربے سے بولنے کی اہل تھی اور اس کی باتوں میں ایک خاص قسم کی منطق تھی۔ پتہ نہیں یہ اس کی گفتگو تھی۔ کہ سوشیالوجی میں دلچسپی اب میں کافی حد تک ہو چکا تھا اور مختلف قسم کے سوال پوچھ رہا تھا۔ چائے کا ٹرے میز پر رکھ کر نوجوان لڑکے نے پوچھا "بی بی پوچھتی ہیں صاف چادریں اور غلاف بھی بھیج دوں۔"

اصل نے چور نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر کھسیانی ہنسی ہنس کر بولی۔

"لے اور نہیں تو کیا۔"

"اور پان کا بھی پوچھا ہے بی بی نے۔"

"وہ بھی بھیج دے۔"

نوجوان لڑکا ایک بھرپور نظر مجھ پر ڈال کر لجاجت سے بولا ... سر جی ذرا موٹر سائیکل کی چابی دیں ... میں لوہاری سے پتنگ لے آؤں۔

"تیری ٹانگیں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ یہ ریڈیو سٹیشن سے آئے ہیں کوئی ایویں کیویں نہیں ہیں جا ..... پھٹا کھا۔"

میں نے جیب سے موٹر سائیکل کی چابی نکال کر اس کے حوالے کر دی۔

"نہ سر جی جو ادھر آتا ہے یہی کرتا ہے یہ اسی لیے چوڑ ہو جاتے ہیں ہمارے لڑکے۔"

"اچھا بھئی جلدی آنا مجھے ریڈیو سٹیشن جانا ہے ... ریکارڈنگ ہے میری گیارہ بجے!"

"یہ کم بخت کبھی جو رات کے بارہ بجے سے پہلے آ گیا ... اچل نے جھپٹ کر چابی چھین لینا چاہی لیکن وہ اتنی دیر میں چمپت ہو گیا۔

"اب آپ ریڈیو سٹیشن کیسے جائیں گے؟

"تم فکر نہ کرو آ جائے گا ابھی ... اس عمر میں سب کو موٹر سائیکل کا شوق ہوتا ہے۔" وہ عمر میں مجھ سے قریباً دوگنی تھی۔ اس کے باوجود اس کی لجاجت، شرمندگی اور کم ہمتی نے عمر میں اسے مجھ سے چھوٹا بنا دیا تھا۔ ریڈیو سٹیشن پر وہ تھانیدارنی بنی پھرتی تھی یہاں اس کے چہرے پر کنواری لڑکی جیسی حیا چھلکنے لگی۔ پتہ نہیں کیوں یکدم میں اس کے ساتھ بہت آرام دہ محسوس کرنے لگا۔

بڑی دیر تک وہ آؤ بھگت میں لگی رہی۔ مہمان نوازی اس کے ساتھ ایک نیچرل نسوانی فعل تھا۔ جیسے ماں دودھ پلاتی ہے۔ میں اب اس علاقے کی طبقاتی کشمکش میں دل سے دلچسپی لینے لگا۔

"تم بھی تو بڑے ٹھسے کی ہو گی اپنے وقت میں اچل۔"

تھی جی پر ادھر مڈل کلاس کی عورت سے کچھ نہیں ہوتا۔ نا کیوں کی گڈی ہوتی ہے وہ تو میں نے ساری عمر اتنی مار شریف عورتوں سے نہیں کھائی سر جی جتنی امیر رنڈیوں سے کھائی ہے جو بھی اچھا گاہک کبھی ملا۔ بالآخر انہوں نے چھین لیا۔ جو کام کا گاہک لگا یا اڑا کر لے گئیں۔

پتہ نہیں کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ چپ ہوگئی۔

اصل بہت زیادہ وہ بک چکی تھی۔ ان گنت لوگوں سے ملتی تھی۔ اس کے تمام خوب صورت کنارے، منیارے، رنگ روغن، منقش پھول بوٹے ختم ہو چکے تھے۔ لیکن اس قدر استعمال شدہ ہونے پر بھی اس میں ایک حزن اور خوبصورتی ایسی بھی پیدا ہو گئی تھی جو پرانے کھنڈروں میں ہوتی ہے۔ ایک طرح سے وہ بجھا ہوا سگریٹ تھی۔ بے دھیانی، بے منزل کی انتہا لیکن کبھی کبھی اس سگریٹ میں آگ کے شعلے خود بخود نکلنے لگتے ریڈیو سٹیشن پر وہ اور ہوتی گھر پر ایک اور اصل ملتی بازار میں اس کا رنگ بالکل انوکھا ہوتا۔

نوجوان کے جانے کے بعد چادریں اور غلاف آگئے، اصل نے بستر اصفائی سے بچھایا اور مجھ سے نظریں چرائے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ ریکارڈنگ کا ٹائم نکل گیا۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے لیکن نوجوان موٹر سائیکل لے کر نہ لوٹا۔ میں چل تو جاتا۔ لیکن دوبارہ میں موٹر سائیکل لینے ادھر نہ آنا چاہتا تھا۔ جب ہم رات کا کھانا کھا چکے تو اصل نے لجاجت سے کہا۔ ”سر جی اب آپ چلے جائیں خدا قسم وہ تو چاہے کل تک نہ آئے الو کا پٹھا!“

مجھے دوبارہ ادھر آنے سے خوف آ رہا تھا۔ خیال تھا کہ اگر ایک دفعہ اور میں ادھر آیا تو پھر میں کبھی یہاں سے جا نہ سکوں گا۔ بازار جاگ اٹھا تھا اور موسیقی کی آواز اب ادھر بھی آنے لگی تھی۔

”آپ سو جائیں سر جی میں ادھر صوفے پر لیٹ رہوں گی صاف بستر ہے۔

"

میں چپ چاپ سگرٹ پیتا رہا۔

وہ لجاجت سے پلنگ کے پاس کھڑی تھی۔ اتنی عمر کی عورت کو میں نے اس قدر بے بس کبھی نہیں دیکھا۔

"آپ ٹیکسی پر چلے جائیں سر جی میں کل ریڈیو سٹیشن آپ کا موٹر سائیکل بھجو دوں گی۔"

میں چپ رہا۔

"یہ رضائی صاف ہے اس میں کوئی نہیں سویا سر جی" اس نے منہ پرے کر لیا۔ شاید وہ رو رہی تھی۔

میں نے جوتیں جرابیں اتاریں ٹائی کوٹ اتار کر صوفے پر رکھا اور چپ چاپ پلنگ پر دراز ہو گیا۔

"ادھر آؤ اصل۔"

"جی سر جی۔"

"میرا نام معصوم ہے ناں تمہیں؟"

"جی"

"تو مجھے قیوم کہو ناں؟"

"اچھا سر جی۔"

"یہاں بیٹھو۔"

وہ پلنگ کی پائنتی بیٹھ گئی۔ اس کے کندھے آنکھیں اور ہاتھ بہت خوبصورت تھے۔ یکدم وہ میری ٹانگیں دبانے لگی۔

"یہ کیا کر رہی ہو اصل؟"

"کچھ نہیں جی جی چاہتا ہے بڑی دیر ہو گئی میں نے کبھی کسی کی

ٹانگیں نہیں دبائیں۔"

"ادھر آؤ میرے پاس۔"

وہ ڈرتے ڈرتے سرہانے کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

"کبھی تم نے کسی سے محبت کی ہے لاحاصل محبت دیوانہ بنا دینے والی جیسے خالی کنویں میں گونج پھرتی ہے۔"

وہ چپ رہی میں کہنی کے بل ہو گیا۔ پھر میں نے اس کی جھولی میں ہاتھ ڈال کر پوچھا "لاحاصل محبت اور دیوانگی میں کچھ فرق تو نہیں ہوتا احل تم تو تجربہ کار ہو بتاؤ تم نے کبھی عقل شعور سے نکل کر محبت کی ہے۔"

میرے ہاتھ پر ایک بڑا سا آنسو گرا پھر احل نے لمبی سانس بھری۔ لیکن خاموش رہی۔

"بتاؤ احل۔"

اس نے منہ پھیر کر کہا ہمیں کیا پتہ ان باتوں کا سرجی ہم لوگ کوئی زخم تھوڑے ہوتے ہیں۔ زخم تو اور جگہوں سے لگتے ہیں۔ ہم تو صرف پھاہا رکھتے ہیں زخموں پر ہمارا تو فسٹ ایڈ کا محکمہ ہے۔"

"پھر کسی کا زخم ٹھیک ہوا تمہارے ہاتھوں۔"

اب اس کی آنکھوں سے جھرنے کی طرح آنسو گرنے لگے "نا سرجی یہ زخم ہمیشہ اسی سے ٹھیک ہوتے ہیں جو انہیں عنایت کرتا ہے کبھی کبھی تو یہ اس کے بس کی بات نہیں رہتی۔"

میں نے اٹھ کر اس کے دونوں کندھے پکڑ لیے بتاؤ احل جب آدمی کسی کو زخم عطا نہیں کر سکتا۔ خود کسی کا زخم بھر نہیں سکتا تو پھر وہ جیتا کیوں ہے؟ جیئے کیوں چلا جاتا ہے؟"

پتہ نہیں کیوں اس نے مجھے سینے سے لگا لیا اور روتے ہوئے بولی آپ کیوں

روتے ہیں روئیں آپ کے دشمن۔"

"آدھی رات گئے جب میرا موڑ سائیکل نیچے آیا تو میری آنکھ کھلی۔ باہر کے لیمپ پوسٹ کی روشنی تکیے پر اس جگہ پڑ رہی تھی۔ جہاں اصل سوئی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کی عمر اس کے چہرے پر لکھی تھی۔ آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے اور ہونٹ لکیر دار تھے۔ وہ منہ کھولے ہلکے ہلکے خراٹے لے رہی تھی۔ پہلی بار عافیت سے دو چار ہوا۔ اپنے ہم جنس کی رفاقت ملی۔ گدھ برادری کا کوئی فرد اس قدر قریب پا کر میں نے اسے آہستہ سے اٹھایا۔

"اصل!"

وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔

جی سر جی۔"

"مجھ سے شادی کرو گی۔ ہم دونوں ہمیشہ اکٹھے رہیں گے ہمیشہ ہمیشہ۔"

وہ عجیب طور پر ہنسی اور پھر مجھے تکیے پر دھکیل کر بولی "اچھا صبح سہی اس وقت تو مولوی نہیں ملے گا۔"

پہلی بار مجھے دیر تک ہنسی آتی رہی۔ اپنے آپ پر اصل پر اور ساری دنیا پر۔

یوں تو ہر دفتر میں یونہی آنے والوں کی کمی نہیں ہوتی لیکن ریڈیو ٹیلیویژن اور فلمی دنیا میں ایسے لوگوں کا تانتا بندھا رہتا ہے کچھ ایکٹر کچھ ادیب کچھ موسیقار پروگراموں کی تلاش میں آتے ہیں کچھ نفری یہاں محض ادیبوں گلوکاروں اور ایکٹروں سے ملنے آتی ہے کچھ ایسے خوش فہم خالی الوقت لوگ یہاں آتے ہیں جو سمجھتے ہیں ان شعبوں میں نام بنانا اور دولت کمانا بہت آسان ہے یہ لوگ ان مکھیوں کی طرح ہوتے ہیں جن کا شہد کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن وہ مکھیوں کی دیکھا

دیکھی پھولوں کا طواف کرنے میں مگن رہتے ہیں

میں کئی دن تک اسی کا اسی بھیڑ میں انتظار کرتا رہا لیکن وہ ریڈیو سٹیشن نہ آئی

اس روز میں دفتر جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ اچانک میرے سینے کے نیچے معدے میں جلن شروع ہو گئی میں کرسی پر بیٹھ گیا کچھ دنوں کے آرام کے بعد اب میرے اسر میں پھر تکلیف ہونے لگی تھی یکدم اتنا شدید درد اٹھتا اور جلن ایسی ہوتی کہ سانس رکنے لگتا کبھی کبھی تو اس شدت تکلیف سے میرا سارا بدن پتے کی طرح کانپنے لگتا اور میں سوچتا کہ کسی ہسپتال میں داخل ہو کر باقاعدگی سے اپنا علاج کراؤں۔

اس وقت دروازے پر دستک ہوئی اور بھائی مختار اندر آئے راجپوتی مونچھوں والے سیکرٹریٹ میں کام کرنے والے میرے بھائی نے کھانس کر میری جانب دیکھا اور پھر نظریں جھکا لیں۔

''بیمار ہو'' آفیسر آن سپیشل ڈیوٹی نے سوال کیا۔

''جی نہیں'' میں یکدم چوکنا ہو گیا۔

وہ تھوڑی دیر تک اپنے گھٹنے دیکھتے رہے

''نارمل صحت مند آدمی کو ایک وقت پر ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ وہ صحت مند نہیں رہ سکتا!''

''جی!''

''اچھا ہے کہ تم اب باقاعدگی سے دفتر جانے لگے ہو اور مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تم پہلے سے بہتر ہو رہے ہو نئی موٹر سائیکل کی بھی مبارک باد ہو۔''

''جی!''

''کالج کے زمانے میں ہر نوجوان کو عشق ہو جاتا ہے یہ واقعہ قریباً سب کو پیش آتا ہے لیکن اس کو روگ بنانا درست نہیں۔''

میں حیران رہ گیا مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے سوائے کوئی میرے حالات سے اس قدر اچھی طرح آشنا ہو سکتا ہے اس وقت میرے ٹانگیں برادے کی بنی ہوئی تھیں اور میرا بوجھ ان کے لیے بہت زیادہ تھا میں اور بھائی مختار مکمل طور پر ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے ایک نا آشنا کے منہ سے اتنی قریبی باتیں سن کر میں بھونچکا رہ گیا۔

"ہر آدمی اوسط زندگی بھر میں پانچ یا چھ فل سائز عشق کرتا ہے اور ہر عشق سے جانبر ہونے کے لیے اسے اوسطاً چار سے چھ ماہ تک لگتے ہیں تم نے بہت دیر لگا دی۔!"

میں چپ رہا۔

"تمہاری بھابی کا بھی یہی خیال ہے کہ شادی کی یہی عمر ہے اس کے بعد شادی بالکل بیکار ہے کیونکہ عادتیں راسخ ہو جاتی ہیں پھر آدمی کسی اور کے لیے زندگی میں جگہ نہیں بنا سکتا۔"

"میں سوچ کر جواب دوں گا۔"

"تمہاری نظر میں کوئی ہو تو ہمیں بتا دو۔"

میری نظر میں میری ہم مشرب ہم جنس ہم مسلک اصل گھوم گئی۔

"حامدہ نے اپنی چھوٹی بہن کے لیے کہلوایا ہے بلکہ اس نے تو بہت اصرار کیا ہے اگر تم چاہو تو۔"

"جی میں سوچ کر جواب دوں گا"

وہ چپ چاپ واپس چلے گئے جیسے چھٹی کی درخواست منظور کرائی ہو۔

یکدم میرے معدے میں دل جیسی دھڑکن پیدا ہو گئی میں لوہے کی سد خوں والی کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا میں کھنگار کر تھوک دور پھینکا۔ آگے بدر کی طرف سے متعفن بو کا ایک بھبھکا میری طرف لپکا۔

میری نظروں میں حامدہ بھی اصل پنکھے کے پروں کی طرح گھومنے

لگیں ۔ تیز گھومتیں تو ان کا ہیولا ایک ہو جاتا رفتار کم ہوتی تو علیحدہ علیحدہ نظر آنے لگتیں ۔

عابدہ نے اپنی چھوٹی بہن کا رشتہ کیوں بھیجا تھا؟

کیا وہ بہن کے توسط سے مجھے زیر منقار رکھنا چاہتی تھی ۔

کیا اپنی بہن سے مجھے بیاہ کر وہ مجھے انگوٹھا دکھانے کے منصوبے باندھ رہی تھی ؟

جس وقت میں ریڈیو سٹیشن کے باہر پارک کی ہوئی کاروں کے ساتھ اپنی موٹر سائیکل رکھ کر سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اظہر آمدے میں آتی ہوئی دکھائی دی اس وقت کچھ اسر کی درد اور کچھ ذہنی ناآسودگی کی وجہ میں باتیں کرنے کے موڈ میں نہیں تھا ۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے وہ اور میں کتاب کے صفحوں کی طرح بہت قریب رہ چکے تھے لیکن اجل ہر دن ، از سر نو شروع کرنے کی عادی تھی ۔ اس کے چہرے پر پرانی ملاقاتوں کا شائبہ تک نہ تھا اس نے ایک بار پھر مجھ سے قطعی اجنبی پن سے بات کی

"السلام علیکم سر جی !"

"وعلیکم السلام"

"سر جی اپنے دوست قاضی سے میری سفارش کر دیں سنا ہے رات ان کے گھر کاکا ہوا ہے آج موڈ بھی اچھا ہے ان کا چائے بھی پلائی ہے انہوں نے اپنے چپڑاسیوں کو ۔"

میں ذہنی طور پر اپنے اسر سے لڑ رہا تھا ۔

"آج نہیں اجل ۔"

وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی ۔

"میں آپ کے لیے کلیجی لائی تھی پکا کر آپ کے دفتر میں رکھا ہے ٹفن کیریئر میں نے ......"

"میں تو آج ایک لقمہ نہیں کھا سکتا اجل آج میرے اسر میں تکلیف ہے

ایک نوالہ بھی کھا لیا تو سارا دن معدے میں جلن رہے گی کھٹے ڈکار آتے رہیں گے۔"

جس وقت ہم مڑ کر پروڈیوسروں کے دفاتر کی طرف جانے لگے پروڈیوسر غنی کے کمرے سے ستارہ نکلی یہ پتلے ہونٹوں والی آرٹسٹ نیل کلاسیکی موسیقی کے پروگرام کرتی تھی۔ اسے آئے ابھی تھوڑا عرصہ ہوا تھا لیکن ریڈیو سٹیشن پر اس تفنگ اندر کے دگن لگانے میں مشغول تھے کچھ کن رسیا حضرات کا خیال تھا کہ اس کا مخرج بہت درست ہے۔ تلفظ میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے رچاؤ اور لگاؤ سے وہ گاتی تو تھی لیکن سب سے بڑی بات آرٹسٹ کا مقدر ہوتا ہے۔ یہ جس وقت یاور ہو دنوں میں ستارن مقبولیت کے ہوپ پر آفتاب کی طرح چمکنے لگتا ہے۔

پرانی گانے والیاں اس سے جس قدر جلن، حسد اور بیر کا اظہار کریں یہی اس کی شہرت کی سب سے بڑی دلیل ہوتی ہے۔

ستارہ کو آتے دیکھ کر اصل بھاگی اور اس سے بغل گیر ہو گئی۔

"سبحان اللہ سبحان اللہ کیا بات ہے تیری چن جی کل شام میں نے تیرا پروگرام ٹیلی ویژن پر دیکھا۔ واہ بی سادھائی یا پاپا کیا جگہ بنائی ہے تو نے پا کی کیا سر سجایا ہے کوئی کہہ سکتا تھا کہ لوک میوزک کا پروگرام ہے ماشاء اللہ ماشاء اللہ استاد محمود خان کی تعلیم کو چار چاند لگا دیے سارا ماں کا رنگ ہو بہو وہی لے پکڑنے کا انداز جیتی رہ چن جی۔"

ستارہ تعریف کے باوجود خفیف کھڑی تھی۔

ان اصل نے ستارہ کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ میری طرف کیا" دیکھیں دیکھیں سر جی اللہ کی کرامت دیکھیں ہے کسی کی ریڈیو سٹیشن پر ہے یہ موہنی صورت کسی کا رنگ اچھا ہوتا ہے کسی کے نقش اچھے ہوتے ہیں اس کو تو رب نے سب کچھ دے رکھا ہے چھپڑ پھاڑ کر دیا ہے اسے سب کچھ۔"

حالانکہ نو دریافت شہرت نے ستارہ کو بہت تیز کر دیا تھا وہ میز پشنو سے لیکر پروڈیوسروں تک سب کے ناک میں دم کرنے کی اہل تھی لیکن اس وقت وہ بھی گڑبڑ کر کھسیانی ہنسی ہنسنے لگی۔

"چھوڑیئے باجی اصل۔"

"ناں چمن جی میں کوئی تیرے گن گا رہی ہوں میں تو اللہ بچے کی تعریف کر رہی ہو کیا کیا صورتیں بناتا ہے ۔ اپنا روپ کیسے کیسے دکھاتا ہے سبحان اللہ"

" چلو میں قاضی کی طرف جا رہا ہوں " میں نے ان دونوں سے پیچھا چھڑانے کی غرض سے کہا۔

"چلتے ہیں سر جی چلتے ہیں یہ تل دیکھیں اس کی ناک پر اس کی ماں کے ہونٹ پر تل تھا سنا ہے سر جی عورت کے ہونٹ پر تل ہوں مرد اس سے بہت محبت کرتے ہیں ہیں جی ؟"

ستارہ مری ہوئی بھینس کے کٹے کی طرح منہ تھتھائے کھڑی تھی میں بھی رسہ تڑو کر بھاگنے کے موڈ میں تھا لیکن اس نے ہم دونوں کو پکڑ رکھا تھا۔ اپنے مضبوط ہاتھوں سے

"اس کی ماں کو بھی پہننے کھانے کا بہت شوق تھا سر جی پاکستان سے پہلے کا ذکر ہے میری عمر بہت کم تھی اس وقت لیکن میں نے اس کی ماں کو دیکھا ہے کناٹ پلیس میں میرٹ سوٹ سر جی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگا ہوا پیروں میں سفید سویڈ کے کورٹ شوز وکٹوریہ سے اتری تو سارا کناٹ پلیس ہل گیا مہاراجہ بڑودا ہاتھی دانت کا صوفہ سیٹ خرید رہے تھے اس وقت دو لاکھ روپے تک مول تول ہو تھا اس وقت صوفہ سیٹ تو کیا خریدتے دو لاکھ اس کی ماں کو دیئے ور ساتھ بٹھا کر لے گئے اپنی رولز رائس میں چمن جی تیری ماں کی کیا بات تھی بٹیا آفت تھی آفت......"

ہم دونوں برآمدے میں ساتھ چلنے لگے۔

"یہ تم مجھے اس کا چہرہ کیوں دکھا رہی تھیں اجمل؟"

"تو اور کیا اپنا چہرہ دکھاؤں سرجی؟ ہیں نا کھلے بادشاہو جوانی اتر جائے تو دوسروں کے ہی چہرے دکھانے پڑتے ہیں۔"

"تم اس کی ماں کا ذکر کیوں لے آئیں درمیان میں اسے کوفت ہو رہی تھی سے کوفت ہو رہی تھی۔"

"جھوٹی ہے سب کو بتاتی پھرتی ہے کہ یہ کسی ڈاکٹر کی بیٹی ہے بڈھی ہو کر اس کی ماں نے ڈاکٹر کر لیں تو کیا یہ ڈاکٹر کی اولاد ہو گئی ہم سے کسی کا پیچھا چھپا ہے دو گلیاں ہم سے آگے پیچھے والیوں کی گلی میں انکا چوبارہ تھا اب چاہے یہ گلبرگ رہے کالج جائے میم بن جائے ہم کو تو یاد ہے سب کچھ۔"

چاہے یاد ہو لیکن کسی کو یاد دلانے سے فائدہ؟ کوئی اپنا ماضی بھولنا چاہے تو تم اسے بھولنے نہیں دو گی ہے نا؟

ہم دونوں میرے دفتر کے اندر پہنچ گئے۔ اجمل نے برقعہ کا اوپر والا حصہ اتار کر کرسی کی پشت پر لٹکا دیا اور لمبی سانس بھر کر بولی۔

"بڑی مشکل ہے سرجی ہمارا دل بھی ہے ہم بھی انسان ہیں ہم سے شریف لوگ نفرت کرتے ہیں تو ہم برداشت کر لیتے ہیں لیکن ہم میں سے جب یہ لوگ اٹھ کر جاتی ہیں اور پھر ہم کو ذلیل سمجھتی ہیں تو ہم سے برداشت نہیں ہوتا سفیدی کروا کر کورے سے کبوتر بن جائیں اور پھر کوؤں سے ہی نفرت کریں سبحان اللہ ہم تو پھر تنا ہی کر سکتے ہیں کہ انہیں یاد دلائیں کہ وہ بھی کبھی کوّے تھے۔"

"اس بے چاری نے تمہیں کیا کہا تھا؟"

اجمل نے سگریٹ سلگا کر کہا "بیچاری نہیں ہے موقع شناس ہے یہ بھی اس کی ماں بھی پچھلیوں کو بھولتے دیر نہیں لگی انہیں اس کی ماں نے کسی ڈاکٹر سے

نکاح پڑھوالیا ہے اپنی کشتی تو بچالی ہے لیکن گھر والے تو اجڑ گئے ان کے بوڑھے نانی اور اس کے ماں باپ تو خوار ہو گئے سارے ..... ساری عمر جنھائیوں نے اس کی ماں کی کمائی پر راج کیا نشہ پانی کیا اب وہ مزدوری ڈھونڈنے نکلتے ہیں ..... لعنت ہے ایسی نیکی پر ..... ہم سے یہ نہیں ہو سکا۔ اس لیے تو اپنی جنت تلاش کی پیچھوں کے دوزخ میں اس کے ساتھ بیٹھے ہیں۔"

"اگر تمہارے دل میں اتنا بغض ہے تو اس کی تعریف کیوں کر رہی تھیں؟۔"

"پتہ نہیں جی کیوں؟ ..... شاید مجھے منہ پر خوشامد کرنے کی عادت ہے یا شاید میں لوگوں سے ڈر جاتی ہوں؟"

بہت بعد میں مجھے پتہ چلا کہ اہل کے متعلق پیش گوئی ناممکن ..... تھی کیونکہ وہ بچوں کی طرح کسی Sustained emotion کے قابل نہ تھی اس کا لڑنا جھگڑنا پیار محبت نفرت سب موڈ کے تابع تھے کسی تھیوری مسلک۔ موڈ کے تحت وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔ وہ سب کچھ بغیر سوچے سمجھے کرتی تھی اسی جی چاہا مدد کر دی دل میں آیا گالی دے دی۔ کسی کو کھانا کھلا دیا۔ نیا پرس عطا کر دیا کڑھا ہوا دوپٹہ اس کے کندھوں پر ڈال کر اس کا بوسیدہ دوپٹہ اپنے پر لے لیا۔ کسی سے بیس روپے ادھار مانگ کر شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ مدد کرنے تحفہ دینے کسی کو اونچا تے تعریف کرنے کے لیے اس کا کوئی فلسفہ نہ تھا وہ لہر تھی گالی آئی گالی دے دی مدد کو جی چاہا مدد کر دی غیبت پر طبیعت مائل ہوئی تو سارے بخیے ادھیڑ دیے خوش اور ہمدرد غالب آ جاتی تو پاؤں پڑ جاتی معافی مانگ لیتی۔ وہ وقت ضابطے اور طریقے کی پابند نہیں تھی اس کا سارا نظام Impulse پر چلتا تھا اسی سے اس کی رائے پر چلنا مشکل تھا کیونکہ اس کی دوستی دشمنی نظریے سب منٹ کی سوئی کے تابع تھے۔ کچھ بھی گھنٹوں دنوں سالوں پر محیط نہ تھا۔

"سر جی میں آپ کے لیے کلیجی پکا کر لائی ہوں۔"

"بھائی میں اسر کا مریض ہوں مدت ہوئی ایسی خوراک چھوڑ دی میں نے۔"

اسے مجھ میں اسر میں چھوڑی ہوئی خوراک میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''فکر نہ کیا کریں پہلے اسر ہوتے ہیں پھر پاگل ہو جاتا ہے آدمی چلیں قاضی کے پاس میرے سفارش کر دیں۔''

جس وقت میں اٹھ کھڑا ہو گیا وہ کسی واقف کار کا نمبر فون پر ملا بیٹھی احتل کو فون کرنے کا بہت چسکا تھا وہ ہمیشہ میز کی نکڑ پر چڑھ کر بیٹھ جاتی اور اپنی واقف کاروں کو نرا کلی کے دوکان داروں کو ریلوے سٹیشن انکوائری پر پی آئی اے کارگو والوں کو فون کھڑکاتی رہتی فون پر اسے لوگوں کو مرعوب کر کے بڑا مزہ آتا تھا۔

''ہیلو ہیلو ہے لو کون جی میں احتل بول رہی ہو۔ ریڈیو سٹیشن سے جی آر ڈی صاحب کے دفتر سے '' اس نے مجھے آنکھ ماری۔ ''کہاں ہو جی اب تو وقت ہی نہیں اب تو میں ضرور آتی لیکن ٹیلی ویژن والے چھوڑتے ہی نہیں میرا پروگرام ہے پرسوں شام سوا سات بجے ضرور دیکھیں۔ اچھا جی گڈ بائی۔''

''جب تمہیں ٹیلی ویژن کے پروگرام مل رہے ہیں تو ریڈیو سٹیشن والوں کے منتوں سے حاصل؟''

میں واپس کرسی پر بیٹھ گیا۔

''کس کافر کو ٹیلی ویژن سے پروگرام ملتا ہے۔''

''یہ تم اپنی ملنے والی کو کیا بتا رہی تھیں ابھی؟''

''اس چندری کا ٹیلی ویژن خراب ہے اسی لیے تو میں نے ذرا عزت بنائی اپنی کیوں آپ کو کوئی اعتراض ہے۔''

''یہ سارا وقت تمہیں اپنی عزت بنانے کی فکر کیوں لگی رہتی ہے؟''

''تو ہم لوگ اور کیا بنائیں سر جی جن کے پاس عزت نہیں ہوتی وہ ساری عمر اسے ہی بنانے میں گنوا دیتے ہیں سچ پوچھیں سر جی تو ستارہ کی ماں سے بڑی عقلمندی

کی چھوڑیں بارہ سال مجھ جیسے کمینے اس کا پیچھا کریں گے پھر بیٹی تو سکھ کی زندگی گزارے گی نانی تو ویسے بھی مرکھپ جائے گی دو چار سالوں میں اچھا ہی کیا بازار چھوڑ دیا۔"

اصیل کی آواز میں دکھ تھا جس درخت پر سارا دن دھوپ پڑتی ہے اس کے چکنے پتے چمکتے ہیں بچے اس میں جھولا ڈالیں عورتیں اس کے سائے تلے بیٹھیں شام پڑتے ہی ایسے درخت کے گرد اس کے اندھیروں میں بڑی اداسی ہو جاتی ہے ایسے ہی اصیل تھی ہر وقت ہنسی مذاق۔ چکا چوندا دھر ادھر کی بے تکی باتیں جب وہ تھوڑی دیر کے لیے چپ ہو جاتی تو اس کے اردگرد بڑی مایوسی پھیل جاتی۔

"کیسی تھی ستارہ کی ماں شکلاً عقلاً؟" میں نے موضوع کو ہلکا کرنے کی خاطر کہا۔

"اچھی تھی اتنی خوبصورت بھی نہیں جتنی مردمار تھی پیسہ زیادہ نہیں کمایا ہاں آدمی بہت ضائع کیا تو نوں کا ایک نوجوان زہر کھا گیا اس کے پیچھے چھ فٹ کا جوان تھا۔ اگلے دانتوں میں ایک پر سونے کا پترا چڑھا تھا جہلمی طرز کے پٹے تھے مسکرا پڑتا تو دل جلترنگ کی طرح بجنے لگتا۔ اس کے جنازے پر گئی تھی میں بس جی یہ کیا بات ہے کبھی کبھی مرد اپنی جان دے دیتے ہیں عزت کی دال روٹی نہیں دیتے۔؟"

"مردوں کے دینے کا بھی عجیب حساب ہے عجیب بادشاہ لوگ ہوتے ہیں مرد بھی۔"

"عزت کی دال روٹی میں بڑی بک بک ہوتی ہے اصیل ساری عمر کا لیکھ جان کا حساب تو ایک بار نپٹایا جا سکتا ہے ایک جھٹکا اور دوسرے پار"

"ہاں جی" اس نے لمبا سانس لے کر کہا۔

اس روز اصیل بار بار بجھ رہی تھی جیسے کھلے میدان میں آگ جلنے کی کوشش پر بوندا

باندی ہو رہی ہو۔

''ابھی تم کہہ رہی تھیں اصل کی ستارہ کی ماں کو تم نے کناٹ پیلس میں دیکھا تھا۔ یہ کس سن کی بات ہے بھلا؟''

میں نے اس کا موڈ بدلنے کی غرض سے کہا۔

''سن چھیالیس کی جی مجھے اچھی طرح یاد ہے آگ لگنے کی واردتیں عام تھیں ان دنوں۔''

''اس وقت تمہاری عمر چودہ برس کی تو ہوگی'' میں نے ہنس کر کہا۔

''کھلی جی کھلی چودہ کی''

''اس حساب سے تم پیالیس کی ہوئیں دیکھ لو پارٹیشن کو کتنے سال ہو چکے ہیں''

میرا خیال تھا کہ وہ جھگڑا کرے گی اور اس کا موڈ ہلکا ہو جائے گا۔ لیکن وہ خفیف ہو کر مسکرانے لگی اور بولی ''ایسے گھپلے تو ریڈیو سٹیشن پر عام ہوتے ہیں آرمی تھیٹر کے وقت سناتا ہے خاموش فلموں کے شاٹ بیان کرتا ہے اور عمر اپنی تیس سال بتاتا ہے ہم تمیں آل انڈیا ریڈیو کے زمانے کی کرتا ہے اور عمر پوچھو تو چالیس سے آگے نہیں جاتی سچی بات بتاؤں سر جی عمر تو سب کے منہ پر لکھی ہوتی ہے باتوں میں رنگی ہوتی ہے منوانے والے زیادتی کرتے ہیں مجھ سے تو جب کوئی عمر پوچھتا ہے مجھے لگتا ہے جیسے میں تھانے میں آ بیٹھی ہوں بھلا میری عمر اگر پیالیس کی ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟ ہوگئی سو ہوگئی۔''

بوندا باندی میں آگ پھر بجھ گئی۔

''فون کرنا ہو تو کر لو پھر قاضی کے پاس چلیں۔''

فون کا نام سن کر اس نے پی آئی اے کار گو سروس کا فون نمبر ملایا اور بولی ''ہیلو جی پی آئی اے کار گو؟ میرا ایک پارسل آنا تھا کراچی سے؟ ہاں جی؟

بڑا ضروری ہے جی تبھی تو پوچھ رہی ہوں جی میرا فون نمبر نوٹ کر لیں اور فوراً اطلاع دیں۔"

اس نے میرا فون نمبر دوسری طرف دے دیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو احتل؟ یہ سرکاری فون ہے۔"

"جب کارگو والے پوچھیں تو رانگ نمبر کہہ دیں آپ اتنی سی تو بات ہے۔"

"چلو اب۔"

"سر جی آج آپ میرے ساتھ چلیں۔"

"چلو تیری رہوں میں۔"

"قاضی کے پاس نہیں میرے کرائے کے گھر۔ انہوں نے مجھے چھ مہینے کا کرایہ نہیں دیا۔ کوئی مرد وہاں جاتا نہیں۔ وہ عورت سے کیوں ڈرنے لگے۔"

"تمہارے پانچ بھائی ہیں وہ نہیں جاتے کرایہ لینے۔"

"ناں جی۔ وہ کیوں خجل خوار ہونے لگے۔ وہ فیروزہ کی کمائی پر عیش کر رہے ہیں ان کو کیا پروا۔؟"

میں اس کے ساتھ دوبارہ جانا نہیں چاہتا تھا۔

"آپ کو کچھ کرنا کرانا نہیں ہے سر جی۔ صرف میرے ساتھ چل پڑیں رعب پڑ جائے گا کرایہ داروں پر۔ خدا قسم میرے پاس تو رکشا کو دینے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوتے اور بی بی تو اکنی پائی بھی نہیں دیتی ہم جیسے بیکاروں کو۔"

پتہ نہیں اس میں کیا تھا؟ اس جلتی بجھتی آگ کے ساتھ میں تو گڑے کی قبر کے پچھواڑے اس کے کرایہ داروں کے پاس چلا گیا۔

احتل کو اپنا سمجھنے کی صرف یہ وجہ تھی کہ شہر میں وہ اور میں بالکل تنہا تھے میں ذہنی اور جسمانی طور پر بیمار تھا وہ میری ماں کی عمر کی تھی پھر اس کا اور میرا مسلک گدھ جاتی کا

تھا ہم دونوں مردار آرزوؤں پر پلے تھے ہم دونوں بجھے ہوئے کارتوس تھے اور اتفاقاً

ایسے اکٹھے ہوئے تھے جیسے کوریس کرسٹی جیسی دور دراز جگہ میں اپنا ہم وطن ہم مشرب

ہم زبان مل جائے ہمیں آپس میں بات کرنے کے لیے زیادہ اوڑھنے بچھونے،

لگانے چھپانے، رکھ رکھاؤ کی ضرورت نہ تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے اٹھارہ بیس سال

سال بڑی تھی لیکن وقت بے وقت اس کے اندر ایک کھلنڈری سے بچی بھی جاگ اٹھتی

وہ جو کچھ بھی کرتی تھی کہتی تھی میں اس کا کبھی برا نہ مناتا اور نہ ہی اپنی باتوں کی اسے

کچھ سمجھ تھی اسے معلوم نہ تھا کہ روٹھا کیسے جاتا ہے اور کتنی دیر روٹھے رہنے میں عزت

بچتی ہے اس کی باتوں میں لغت سچائی اور کمینہ پن تھا کبھی کبھی جیسے کھلی کھڑکی سے

بارش کا ریلا اندر آ جائے وہ بڑی بے بس قسم کی گفتگو بھی کرنے لگتی۔ سچ وہ صرف اس

لیے بولتی تھی کہ اب جھوٹ اور سچ اس کے نزدیک بالکل برابر ہو چکے تھے وہ اپنے جسم

سے بے پروا عزت و شہرت سے بے نیاز روپے پیسے سے غنی تھی۔

افضل کا ایک چھوٹا سا گھر نوگزے کی قبر کے پچھواڑے بھی تھا یہ گھر بوسیدہ اور پرانا

تھا اوپر والی منزل میں کرائے دار رہتے تھے نچلی منزل کے دو کمروں میں غفور درزی

اپنی فیملی کے ساتھ مقیم تھا ہم دونوں جب یہاں پہنچے تو غفور درزی تیزی سے مشین چلا

رہا تھا۔ افضل کو دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہو گیا۔ غفور درزی کے چہرے پر اب صرف

آنکھیں باقی تھیں باقی سارا چہرہ وقت، صبر اور غریبی کی نذر ہو چکا تھا۔

”آئیں ۔۔۔ آئیں السلام علیکم صاحب جی“

”کیا آئیں، ماسٹر جی ۔۔۔ پھر آپ نے کرایہ لے کر نہیں دیا۔“

ماسٹر غفور یوں خفیف ہو گیا جیسے وہ قصوروار ہو ”بی بی جی ۔۔۔ ان کے مرگ

ہو گئی ہے میں پوچھا تھا دو بار۔“

”ور جب میری مرگ ہو گئی تب ۔۔۔ تب کفن دفن کیسے ہو گا ۔۔۔ کون خرچے

کرے گا ۔۔۔ کمیٹی والے ایم سی کے ٹرک میں ڈال کر لے جائیں گے۔“

ماسٹر غفور کا نچڑا ہوا چہرہ اور بھی نچڑ گیا "خدا نہ کرے"

"خدا نہ کرے کیا نہ کرے خدا؟ آپ کو کیا پتہ میرا گزارہ کیسے ہوتا ہے

میں بھوکی مر جاؤں آپ کو تو کرایہ داروں سے ہمدردی ہے۔"

ماسٹر غفور نے مشین کی ڈبیا میں سے دو سو روپے نکالے اور اصیل کو عجلت سے

پیش کرتے ہوئے بولا "آپ یہ لے جائیں میں خود ان سے وصول کر لوں گا۔"

اصیل نے پیسے لیے اور شکریہ کر کے دوکان سے نکل آئی "ماسٹر جی ان کو کہہ

دیں گر اگلے مہینے کرایہ نہ دیا تو میں انہیں نکالنے پر مجبور ہو جاؤں گی۔"

"اچھی جی کہہ دوں گا۔"

"زور سے کہنا ماسٹر جی رعب سے من من من نہ کرنا" روپے لے کر ہم

واپس اصیل کے دو منزلہ مکان میں چلے گئے۔

اصیل کا سارا روزگار یہ کرائے والا مکان تھا کھانا اور رہائش مفت تھی اور اوپر کے

خرچے کے یہ بھی دو سو روپے ماہوار اس کا کفیل تھا اس وقت مجھے اصیل کی بجائے

درزی غفور پر ترس آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسی بے چارگی اور شرم تھی جو آج

تک میں نے کسی چہرے پر نہیں دیکھی۔

اس روز پھر بی بی نے پارٹی کے لیے پر تکلف چائے بھیجی۔ نئی چادریں اور غلاف

آئے اصیل نے بڑے وقار کے ساتھ پچاس روپے نوجوان بھائی کو پکڑا کر کہا "

بی بی کو دے دینا کہنا ریڈیو والے صاحب نے پان سگریٹ کے لیے بھیجے ہیں۔"

نوجوان کے جانے کے بعد میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھ کر کہا "یہ

کیا؟"

"آپ کی عزت بن جائے گی بی بی کی نظر میں آپ کا کیا جاتا ہے۔"

رہ رہ کر مجھے غفور درزی یاد آ رہا تھا اس کی مسکینی، حیا، کم آمیزی نے میرے دل پر

عجیب اثر کیا تھا۔

"تم نے غفور درزی سے دو سو روپے کیوں لیے؟ اب بے چارہ کیا کرے گا۔"

"اسے خوشی ہوئی ہوگی"

"خوشی؟"

"یہ میری بڑی بہن کا عاشق تھا سر جی بلو مر کی دوکان نہیں اس کے پیچھے یک تین منزلہ بلڈنگ ہوتی تھی اس کی جائیداد تھی وہ ساری بلڈنگ سارا کچھ بک بکا گیا دھیلا دھیلا ہمارے گھر کی نظر ہوا۔ یہ جو ہمارا گھر ہے اسی نے بنو کر دیا تھا جب کچھ نہ رہا درزی بن گیا میرے سارے کپڑے مفت سیتا ہے ایسے ایسے نمونے بناتا ہے ابھی کل ہی فیروزہ کا غرارہ سی کر لایا تھا سارے پھڑک گئے۔"

"تمہاری باجی کو بھی محبت تھی درزی غفور سے۔"

"وہ بڑی مشغول رہتی تھی سر جی اسے اللہ نے جوانی میں اٹھا لیا سوچنے کا موقعہ ہی نہیں ملا اگر برف کی بنی ہوتی تو پگھل جاتی ساری کی ساری درزی غفور اسے ایسے دیکھتا تھا!

بڑی دیر تک وہ مجھے اپنی بہن کی طوفان آمیز زندگی کی باتیں بتاتی رہی درزی غفور کی داستان اس آندھی میں اڑنے والا ایک تنکا تھی۔ جب رات کے کھانے کا ٹرے سج کر آیا تو اصل نے سارے ڈونگے کھول کھول کر دیکھے سالن چکھے پھر نوجوان پر گر جی۔"

"گوشت کون لایا تھا آج۔"

"چاچا ابراہیم گیا تھا۔"

"اب چاچے کو کوئی قصائی سودا نہیں دیتا خود جایا کرو گوشت لینے آخر سارے خاندان نے کھانا ہوتا ہے۔"

آج اچھل کی جیب میں پیسے تھے وہ شیرنی تھی۔ ویسے بھی میں نے اسے کھانے کے معاملے میں ازحد محتاط پایا برا کھانا دیکھ کر فحش گالیاں بکنے لگتی قصائی، پکانے والا مرچ مسالا سب کی شامت آجاتی۔ دال سبزی سے اسے نفرت تھی اسے گوشت مرغی مچھلی کا شوق تھا کھا پی لیتی تو پھر ڈھیر ہوجاتی سونے کا بھی اس کا عجیب ڈھنگ تھا صوفے پر نیند آئی تو وہاں ڈھیر ہوگئی۔ کرسی پر اونگھ آئی تو ملکہ وکٹوریہ کا بت کرسی پر خراٹے لینے لگا۔ پلنگ پر سوئی تو ایسے جیسے دلدل میں بھینس دم چھوڑے پڑی ہو۔

"سوئیں گے سرجی؟"

"نہیں اب میں چلوں گا۔"

"اچھا جی " کھانے کے بعد وہ بیٹھی نہ رہ سکتی تھی آرام سے پلنگ پر روانہ ہوگئی

"آپ کے کون سے بیوی بچے روتے ہیں سوجائیں یہیں۔"

"نہیں چلتا ہوں اچھل۔"

"کیا سوچ رہے ہیں آپ"

میں غفور درزی کی گلی میں پھر رہا تھا۔

"ایک لڑکی یاد آرہی ہے کالج میں پڑھتی تھی میرے ساتھ"

"پرانے وقتوں کو یاد نہیں کرتے سرجی نئے دنوں میں گھن لگ جاتا ہے۔"

میں چپ ہوگیا، وہ ہنسنے لگی اس کی ہنسی میں کوئی چیز تھی جو بکھرنے کی طرف مائل تھی۔

"سرجی ہر انسان کے انجن چلانے کے لیے خاص کا پٹرول چاہیے جب تک یہ پٹرول گاڑی میں ہوگا گاڑی چلتی ہے انسان کا سلف چاہے چلے نہ چلے دھکے دے کر گاڑی چل پڑتی ہے کنڈم نہیں ہوتی۔"

میں نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ تکیے پر سر ٹکائے اس پر اپنا سر جمائے نیم دراز تھی "عورت کا ایندھن

ممتا ہے صبر ہے آنسو ہے جب تک شہد کی روکتی ہے جلتی رہتی ہے۔"

"اور مرد؟"

"مرد کے اندر کام کا پیٹرول چلتا ہے کام ہو یا کام رہے تو اس کا سلف چاہے

بیکار ہو جائے چلتا رہے گا عجیب بات ہے اب کبھی میں روتی نہیں آنسو ہی

نہیں آتے کبھی کبھی خیال آتا ہے یہ میرے آخری دن نہ ہوں۔"

اس کی خشک آنکھوں میں خشک آنسو تھے۔

"درزی غفور جیسا کوئی ہنر آتا تو رزق حلال ہی کھاتی اب تو سارا جسم بوجھ بنا

رہتا ہے دل پر کہاں سے اتنا ایندھن لاؤں اس کا دوزخ بھرنے کو کبھی وہ اس

کو بیوقوف بناتی ہوں کبھی فیروزہ کو لیکن کب تک ۔یہ حرام رزق کب تک؟

"میرے پاس اس وقت ڈیڑھ سو روپیہ ہے اجل "میں نے عاجت سے

اس کے تکیے پر پیسے رکھ کر کہا۔

"ناں سر جی ابھی نہیں ابھی ہیں میرے پاس یہ دیکھئے۔"

"رکھو اجل کام آئیں گے۔"

وہ ہنس دی "ابھی تھوڑی دیر کے لیے میں نیک بننے لگی تھی شکریہ سر جی

میرے لہو میں تو ایک بوند بھی حلال کی نہیں مجھے ڈر کیسا۔"

پیسے لے کر اس نے اپنی باڈس میں ڈال لیے اور میری طرف کمر کر دی جس

وقت میں اس کے کمرے سے نکلا مجھے شبہ ہوا کہ وہ رو رہی ہے۔

اجل سے میرا رابطہ کچھ کچھ عجیب نوعیت کا تھا آہستہ آہستہ اکے پرو تلے گھستا چلا

جا رہا تھا وہ ایک ماں تھی جو سانپنی کی طرح جھولی میں لاتعداد بچے کھا چکی ہو تجربات کا

دکھ سکھ دل پر اسی وقت آری کناری بنتا ہے جب یہ کبھی کبھی وارد ہوں۔وہ اتنے

سارے دکھ سکھ سے گزر چکی تھی کہ اب ڈاکٹروں کی طرح مریضوں کے وارڈوں میں پھرتے ہوئے اسے اختلاج قلب نہ ہوتا تھا۔ اصغل کے ساتھ رہنے میں ایک خاص آرام یہ تھا وہ کچھ نہ مانگتی تھی نہ جسمانی تعلق نہ روحانی محبت نہ روپیہ پیسہ نہ شہرت نہ تعریف جس طرح بچانوے فی صد شادی شدہ مرد اپنی محبوبہ سے دل کا ٹیلیفون ملا کر بیوی سے مباشرت کرتے ہیں

ویسے ہی اصغل بالکل لاتعلقہ کے ساتھ میرے ساتھ وقت گزارتی تھی اسے غالب میرا بالکل شوق نہ تھا کیونکہ وہ مجھ سے بھی پرانا گدھ تھی ہم دونوں زیادہ وقت ساتھ ساتھ تو ضرور گزارتے تھے لیکن جس طرح جوتے کے پیر الگ الگ ہوتے ہیں اور ساتھ ساتھ چلتے ہیں ایک نوعیت سے یہ رشتہ پہلے رشتوں سے بھی زیادہ بانجھ تھا اسی سے فریقین کو جذباتی ذہنی کوئی نکھار بھی حاصل نہ ہوا۔ اصغل وہ لاش تھی جو مدتوں بیماریاں جھیلنے کے بعد مری تھی اس کا گوشت انسانی نہیں تھا ایک طرح کا سنتھیٹک فائبر تھا جس کے ہر مردہ جزثومہ میں بے جان غیر نامی دوائیوں کا سٹور ہاؤس تھا۔

اصغل سے جب میری ملاقات ہوئی میں ذہنی جسمانی جذباتی طور پر بہت الجھا ہوا تھا میرا دل بلال گنج کی ایسی دوکانوں سے مشابہ تھا جہاں ہر طرف پرانا لوہا بکھرا ہوتا ہے۔ کاروں کی پرانی باڈیاں لوہے کی الماریاں، پہیئے۔ سریے۔ نٹ بولٹ، گراریں، پرانے سیلوک ہر طرف چیزوں کا انبار لیکن تالے نہیں تھے نہ اپنے نہ پرائے بارش جھکڑ آندھی میں یہ سامان باہر صرف اس امید پر پڑا رہتا کہ کبھی شہر والوں کو کسی پرانے پرزے کی ضرورت ہوگی تو وہ اسے یہاں سے خرید کر اپنی نئی کار موٹر سائیکل یا پرنٹنگ مشین میں لگالیں گے۔

اصغل سے ملنے کے بعد میں پہلے سے کم تھوکنے لگا تھا۔ اسلت کی تکلیف کو بھی کبھی بہت بڑھ جاتی اور جلن کا یہ عالم ہوتا کہ ہتھیلیاں بھیگ جاتی لیکن ذہنی طور پر میں سوسائٹی سے ابھی کٹا نہ تھا اور اپنی نوکری پر جانے کے قابل تھا Withdrawal کے

مجھے عموماً راتوں کو آتے جب میں چلتا چلتا عابدہ وہ رہی سے گزرتا گزرتا چندر امیں جا کر وہاں کی گلیوں میں گھومنے لگتا! اچھی یادیں یا تو کبھی مجھ سے وابستہ نہ ہو سکی تھیں یا ان کا تاثر گہرا نہ تھا اس لیے یادوں کی ٹونٹی جب بھی کھلتی اس میں سے کھولتا پانی نکلتا محرومیوں کی داستان حلقہ پوری کوشش رہتی کہ میں اپنا وقت یا تو کارآمد کاموں میں گزاروں یا پھر احتل کی صحبت میں، جس کے ساتھ وقت نہ بیکار تھا نہ کارآمد صرف گزرتا چلا جاتا تھا۔

مرد اور عورت کے رابطے کئی بار خود ان کی سمجھ میں نہیں آتے اور سارا شہر ان کی نوعیت سے واقف ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر سہیل کے بعد شہر میں میرا کوئی دوست نہیں تھا ریڈیو سٹیشن پر جن پروڈیوسروں سے صاحب سلامت تھی وہ گہری نہ تھی دفتر میں گپ شپ رہتی لیکن شام کو علیحدہ ہو کر ایک قسم کا سکون ملتا۔ پتہ نہیں احتل کے ساتھ میرے رشتے کی کس نے ہوئی چلائی تھی کیونکہ ہم دونوں ریڈیو میں بہت کم ملتے تھے اور میرے گھر وہ کبھی نہیں آئی تھی۔ اس روز میں سیڑھیاں اتر رہا تھا کہ آنگن میں مجھے صولت بھابھی ملیں یہ ان غمگین صورت عورتوں میں سے تھیں جنہوں نے شادی کی کاٹھی کو بہت سختی سے اپنی پیٹھ پر فٹ کر لیا ہوتا ہے صولت بھابھی اب ہر رت اور حالات کے مطابق بھاگی چلی جا رہی تھیں ان کی چال بدل جاتی کبھی دلکی کبھی پو یہ کبھی سرپٹ لیکن پیٹھ سے کاٹھی اتار کر ستانے کا کوئی لمحہ نہ آتا۔ وہ ہمیشہ مجھ سے ایسے بات کرتیں جیسے نامحرموں سے کی جاتی ہے نگاہیں جھکا کر آواز میں سختی پیدا کر کے بار بار کھانس کر۔

"قیوم" انہوں نے ستون کر مخاطب کر کے کہا۔

"جی؟"

"مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

"کہیے؟"

"یہاں نہیں اندر چلو یہاں بچے ہیں"

بڑی دیر کے بعد مجھے یاجوج ماجوج نظر آئے وہ ایک ہی رنگ کی بش سرٹیں اور ایک جیسی لکیر دار نیکریں پہنے انجن بنے آنگن میں چکر لگا رہے تھے پہلی بار مجھے افسوس ہوا کہ اتنی دیر میں ان سے واقفیت پیدا کرنے کی بھی میں نے کبھی کوشش نہیں کی

ہم دونوں اندر چلے گئے۔

میں موڈب بھائی مختار کے پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"جی۔"

بھابھی کھڑی رہیں، وہ بات کرتے ہی بھاگ جانا چاہتی تھیں۔

"شکر ہے کہ تم باقاعدگی سے نوکری کر رہے ہو رزق حلال کمانا مرد کا فرض ہے۔"

میں چپ رہا۔

"تمہارے بھائی تمہاری صحت کی وجہ سے پریشان رہتے ہیں۔"

"میں نے بھابھی کو بھرپور نظروں سے دیکھنا چاہا لیکن وہ چھت کو دیکھ رہی تھیں"

"آخر وہ تمہارے بھائی ہیں وہ سارا دن تمہارے متعلق سوچتے ہیں۔"

"میں ٹھیک ہوں بالکل "پتہ نہیں کیوں اس وقت میرا رونے کو جی چاہا۔

"کہاں ٹھیک ہو۔ کبھی شیو کرتے وقت اپنا چہرہ دیکھ لیا کرو ڈر آتا ہے ہاتھ دیکھو کیسی نسیں ابھری ہوئی ہیں اور تو اور اس عمر میں سفید بال آگئے ہیں تمہارے۔" میں نے حیرانی سے بھابھی کی طرف دیکھا۔ وہ میرے متعلق اتنا سب کچھ کیسے جانتی تھیں وہ اب کرسی کی بید پر نظریں جمائیں ہوئے تھیں۔

"تم کو کسی ڈاکٹر سے ملنا چاہئے جلد از جلد"

"مد تھا جی دوائیاں پیتا ہوں باقاعدگی سے"

صولت بھا بھی کا رنگ آہستہ آہستہ گلابی ہونے لگا

"تمہارے بھائی تم سے بات نہیں کر سکتے اس سلسلے میں لیکن یہی کافی نہیں

صرف ڈاکٹر ہی۔"

"جی؟ ارشاد؟"

"سنا ہے وہاں ریڈیو پر کوئی چکر چل رہا ہے رمھارا کسی بوڑھی عورت کے

ساتھ!"

میں سناٹے میں آ گیا

"ایسے چکروں سے بچنا چاہیے۔ آدمی ایک بار پھنس جائے تو پھر نکل نہیں سکتا

ویسے ادھیڑیوں کو پھنسانے کے خوب طریقے آتے ہیں۔"

میری آنکھوں میں احتل کی شکل گھوم گئی معصومیت حمق اور قلب کی صفائی کا ایک

کوند لپک گیا۔ اس احمق نے تو آج تک مجھ سے سگریٹ پان کے پیسے نہ لیے تھے

اسے کسی کو پھانسنے اور خود پھنس جانے سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی۔

"کچھ خاندان کی عزت کا ہی خیال کیا ہوتا تم نے" بہت آہستہ دبی ہوئی

آواز میں صولت بھابھی نے کہا۔

اب یقیناً یہ مشن ان کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔

چندرا گاؤں میں جس روز چاچا غلام نے عزیز گائن کی بے عزتی کی اور وہ گاؤں

چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اسی روز کے بعد میں نے پھر کبھی عزت کے متعلق نہ سوچا تھا۔

بھابھی صولت جیسے ابھی بھاگنے والی تھی اس نے آخر حملہ کیا "نوکری کرتی

ہے تو اب شادی بھی کر لو جگہ جگہ حرام کھانے سے حاصل؟ شادی حلال

چیزیں میں سب سے افضل ہے۔"

میں نے اس دیندار عورت کی طرف نگاہ ڈالی۔

"عابدہ کی بہن کا رشتہ آیا ہوا ہے کہو تو طے کر دوں"

یہ کہہ کر بھابھی رسہ تڑوا کر باہر بھاگ گئی۔

میں نے بھابھی کو پکڑ کر کہنا چاہا بھابھی کچھ لوگ معاشرے کے قابل نہیں ہوتے۔ معاشرے کے مطابق نہیں رہتے جیسے کچھ جانور جنگل میں رہ کر جنگل لاء کے تحت زندگی بسر نہیں کرتے ایسے لوگوں کو محبت کی تلاش ہوتی ہے۔ لیکن وہ محبت کے اہل نہیں ہوتے شادی کی نہ انہیں خواہش ہوتی ہے نہ ضرورت بھابھی تم ہمیں کرگس جاتی کے لوگوں کو حلال کھانے پر کیوں مجبور کر رہی ہو ہم تم جنم جنم سے مردار پر پلے ہیں ہمیں حلال سے کیا غرض؟

جب میں آنگن میں پہنچا تو مسعود اور فرید ایک ہی رنگ کے شلوار قمیص پہنے سگیے ہاتھوں میں کنگھیاں پھیر رہے تھے۔

پتہ نہیں کیوں اس روز بڑے دنوں بعد مجھے خیال آیا کہ چندرا چلا جاؤں اور اپنی آبائی کلر شدہ زمین آباد کرنے کی کوشش کروں؟ لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے علم تھا کہ وہاں پہنچ کر بھی کوئی بندھی ٹکی محنت نہیں کر سکوں گا میرا دل کسی ایک دریا میں رہنے کے قابل نہ تھا۔

جس وقت میں دفتر پہنچا قاضی اور راحیل دونوں میرے کمرے میں بیٹھے تھے، اور سگرٹوں کے دھوئیں سے فضا نیلی نیلی ہو رہی تھی راحیل حسب عادت بغیر غسل کیے صرف چہرے کا میک اپ درست کر کے آئی تھی اس نے کنگھی بھی صرف گردن تک پھیر رکھی تھی باقی سارے الجھاؤ واہم تھے بر قعے کا نقاب کرسی سے لٹک رہا تھا اور کوٹ اس کے جسم پر ایسے پھنسا ہوا تھا کہ تمام بٹن کھلنے ہی والے تھے۔

"لیجیے سر جی میں ان قاضی صاحب کو پکڑ لائی ہوں اب آپ میری سفارش کر دیں نا ان سے"

"بھائی اسے کوئی پروگرام وغیرہ دے دیا کرو ورنہ یہ مجھے قتل کر دے گی۔"

"ہائے یہ سفارش ہے" راحیل نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اور کیسی ہوتی ہے سفارش؟"

"رعب سے کہتے ہیں کہ یہ میری رشتہ دار ہے دس سال سے ہمارے تعلقات ہیں ان کا کام نہ کیا تو میں تم سے کبھی نہیں بولوں گا۔"

میں اس روز موڈ میں نہ تھا قاضی بونگا بھی چپ چاپ بیٹھا تھا۔

"جو کچھ یہ کہہ رہی ہے اس کے مطابق کردو یار"

"اب تم نے پروڈیوسر سے ان کی سفارش کرنا میری تو تبدیلی ہوگئی ہے حیدر آباد کی"

"کب؟"

"آج ہی آرڈر آئے ہیں" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اپنے آپ سے پیچھا چھڑا کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "تم تبدیلی سے خوش نہیں ہو۔"

"لاہور چھوٹتا ہے لاہور کے ساتھ اور بہت کچھ چھوٹتا ہے" قاضی کی آواز بھرا گئی

"کوئی سفارش لگوائی ہوتی"

"حیدر آباد نے جو لگوائی ہے"

"آپ کا کوئی قصور نہیں سر جی میری قسمت ہی ماڑی ہے۔ جس پروڈیوسر سے واقفیت ہوجاتی ہے اس کی تبدیلی ہوجاتی ہے اللہ کو منظور ہی نہیں کہ احل کوئی پروگرام کرے اب اس ڈاڈے کے ساتھ کون لڑے۔"

قاضی سد دعا کیے بغیر عاشق صورت رخصت ہوگیا۔

"اچھے آدمی تھے قاضی صاحب ہے نا سر جی؟"

میں کافی دیر چپ رہا۔

"شادی کیسی چیز ہے احل کبھی تمہیں اس سے پالا پڑا؟"

"ہاں جی کی تھی شادی میں نے بھی اس کا بچا ہا بھی ڈال تھا گلے میں"

"بچے؟"

"ایک لڑکا ہوا تھا سر جی لیکن اس کا بھی دماغ ٹھیک نہیں ہم جیسیوں کے ایسے ہی بچے ہوتے ہیں سر جی۔"

"کیا؟"

"ساری عمر حرام کھاتا ہم لوگ حلال کی اولاد کہاں سے پیدا کر لیں گی جی؟ میرے بیٹے کا بھی دماغ ٹھیک نہیں تین بار مینٹل ہسپتال رہ آیا ہے۔ اس کے باپ کا خیال ٹھیک ہے ساری وجہ میری ہے نہ میں حرام رزق پر پلتی نہ میرا بیٹا ایسا ہوتا۔ "

وہ بہت دکھی ہو گئی

"یہ پرانی باتیں ہیں۔"

"ہاں جی میں تو پرانی پر ٹھیک ہیں"

ہم دونوں چپ ہو گئے

"کہاں رہتا ہے تمہارا بیٹا"

"اسی کے پاس ہے جی اب تو جوان ہو گیا ہے۔ بڑا گبھرو ہے شکل سے تو نہیں لگتا کہ دماغ ٹھیک نہیں۔"

"تمہیں ملتا ہے اصل"

"ناں جی مجھے مل کر کیا کرے گا میں اسے کیا دے سکتی ہوں باپ نے تو ساری بلڈنگ اس کے نام کرائی ہے۔"

"پھر ایسے اچھے شوہر کو چھوڑا کیوں؟"

بس بھی صولت نے میرے دماغ میں ایک نیا ایٹم بم چھوڑ دیا تھا۔

"چھوڑا کیوں اسے اصل"

"بس سر جی کچھ نہیں"

"پر کیوں وجہ کیا تھی؟" میں نے اصرار کیا

"میں مڈل کلاس کی طوائف تھی سر جی اس چندری کہتی کو محبت درکار ہوتی ہے۔ لیکن عزت زیادہ پیاری ہوتی ہے اگر اسے صرف محبت درکار ہوتا ناں تو وہ ہمارے ہاں بہت لیکن یہ حریص چاہتی ہے جو بیاہ کر لے جائے وہ محبت کرے دوہرا پنگا دھروہ بھی کم بخت مڈل کلاس کا آدمی تھا۔ بھلا بتایئے نباہ کیسے ہوتا عشق کے بیے نہ مڈل کلاس کا مرد بنا ہے نہ عورت ایک ڈرپوک دوسرا تھوڑ دل بتایئے ان کا عشق کتنے دن چلتا؟"۔

"تھوڑ دل مرد کیسا ہوتا ہے اصل"

"تھوڑ دلے مرد کی ایک نشانی ہے صاحب جی۔ وہ عورت کو ضرورت کی ہر چیز لا دیتا ہے لیکن عیاشی کا کوئی سامان نہیں کرتا۔ زیور کپڑا سینما، پھول تعریف سب اس کے لیے بیکار چیزیں ہوتی ہیں۔"

"میں تمہارا مطلب سمجھا نہیں۔"

"سر جی یہ جو تھوڑ دلا مرد ہوتا ہے ناں وہ روٹی کپڑا مکان دیتا ہے جنس دیتا ہے کیونکہ یہ ضرورت کی چیزیں ہیں لیکن وہ بیوی پر محبت ضائع نہیں کرتا تعریف برباد نہیں کرتا لاڈ پیار سے خراب نہیں کرتا مثلاً تھوڑ دل مرد اگر سوٹ سلا دے گا تو اس پر کڑھائی کو اسراف سمجھے گا زیور اگر اپنی عزت کی خاطر بنوا بھی دے تو زیور کبھی جڑاؤ نہیں ہوتا شاعری کی کتاب کبھی خرید کر گھر نہیں لائے گا نیک بیبیوں کو نیک مشورے قسم کی کتابیں لا کر دے گا گھر میں۔ تھوڑ دلے مرد سے اللہ بچائے بھڑوے کو یہ علم نہیں ہوتا کہ عورت کا اندت ہی ایسا بنا ہے کہ وہ روٹی کے بغیر تو زندہ رہ سکتی ہے عیاشی کے بغیر نہ زیبائش کے بغیر کملانے لگتی ہے۔"

"کبھی تم نے سوچا اصل کہ شادی کے بعد محبت نبھتی کیوں نہیں؟" وہی جو ایک

دوسرے پر مرمٹنے کو تیار رہتے ہیں دشمن کیوں بن جاتے ہیں ایک دوسرے کے؟"

اس نے ناک میں انگلی ڈالی اور کھجلا کر بولی "بات یہ ہے سرجی کہ جب محبت مل رہی ہوتی ہے تو سمجھ نہیں آتی کہ کبھی محبت دینی بھی پڑے گی شادی ہوئی قربانی ساری کی ساری گاٹا اتروانا پڑتا ہے چاہے من کا چاہے تن کا۔"

"تمہیں اس سے اصلی گلہ کیا تھا احتل اب تک تو تم کسی نتیجے پر پہنچ چکی ہو گی۔"

"اس کا بھی قصور نہیں تھا کچھ ایسا بس سرجی اس کا دل چاہتا تھا کہ میں شریف عورتوں کی طرح بھانڈے مانجھ کر بچے پال کر بڑوں کی عزت کر کے چھوٹوں کی گستاخیوں سہہ کر اس کے گھر میں گزارہ کروں اور ثابت کروں سب پر کہ بازار والیوں شرافت میں کسی سے کم نہیں ہوتیں۔ چونکہ میں شریف تھی اس لیے مجھے ڈراموں سے نفرت تھی۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میاں اتنے لوہے کے چنے چبا کر جو تیرے گھر والوں کو قائل بھی کر لیا اپنی شرافت کا تو مجھے کیا حاصل ہو گا دراصل سرجی مجھے اپنے ہاتھوں سے کام کرنے کی عادت نہیں تھی میرا مزاج ہی نہیں تھا نوکرانی کا بڑی تو تو میں میں ہوا کرتی تھی۔"

"کس بات پر احتل؟"

"خاص بات کوئی نہیں ہوتی سرجی میاں بیوی میں تو تو میں میں کی بس ہر ہی ہانڈی میں بڑ بڑ ہوتی رہتی ہے کچھ لوگ بڑی چھوٹی مت کے ہوتے ہیں پہلے تتلی پر مرتے پر مرتے ہیں اسے پکڑنے کے جتن کرتے ہیں جب پکڑ لیتے ہیں تو پھر اسے شہد کی مکھی بنانے پر تل جاتے ہیں" وہ جہاندیدہ فلسفی جیسی باتیں کرنے لگی۔

احتل بڑی دیر تک تاسف کے انداز میں سر ہلاتی رہی۔

"کیا ہوا احتل؟"

"اپنا نقشہ یاد آ رہا ہے سرجی چہرے پر چھائیاں، کھردرے ہاتھ بوئیاں پھٹی ہوئی ہونٹوں پر لکیریں۔ یہ سب کس لیے کہ کچھ گمنام سے لوگ کہیں کرائی

تو بازار سے ہے لیکن شریفوں کو مات کر دیا ہٹ تیری! اتنی سی تعریف سننے کے لیے آدمی ساری عمر تلاش بنا رہے نہ زردہ ڈال کر پان کھائے نہ سر میں مہندی لگائے نہ نقلی باڈیں پہنے اور سنے کیا ہر وقت بازار سے بھاگ کر آئی ہے ہیرا منڈی سے اٹھ کر آئی ہے چلو جو یہ سننے میں آئے کہ بازار کا لفظ کبھی نہیں بھولتا۔ تعریف بھی کریں گے تو آپ کی اوقات آپ کو یاد دلا کر سر جی خود انصاف کریں جب بازار کا لفظ پیچھے سے اترتا ہی نہیں تو وہاں سے چھٹکارا حاصل کرنے سے فائدہ؟''

''تمہیں وہ اچھا نہیں لگتا تھا۔''

سگریٹ کا لمبا کش لگا کر وہ بولی ''لگتا تھا جی کبھی کبھی تو بہت لگتا تھا پر وہ سارا وقت مجھے ماڈل عورت بنا کر خاندان کے سامنے پیش کرنے میں لگا رہتا تھا بیچارا! ہائے ہائے اس نے بھی بڑے دکھ اٹھائے۔ لیکن کیا کرتی سر جی سے میری کمزوریوں غموں، غلطیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ یا یوں سمجھیے آپ کہ وہ معاف کرنا نہیں جانتا تھا۔ ہر جگہ ہر محفل میں ہر وقت اسے ایک ہی شو مارنی آتی تھی کہ دیکھو میں کتنا نیک ہوں میری وجہ سے ایک بازاری عورت تائب ہوئی ہے اسے میرے تائب ہونے کی خوشی نہ تھی اپنا دب اونچا کرنے کی فکر تھی ہر وقت چلیے سر جی محبت کی خاطر تو آدمی سولی پر چڑھتا رہے مرتا رہے کھپتا رہے پر کسی کی انا کو موٹا کرنے کے لیے کوئی کب تک اپنی جان مارے؟''

''اسے اسے تو پیار ہو گا تم سے اصل؟ جس نے معاشرے سے ٹکر لی گھر والوں کے سامنے کھڑا ہوا اسے پیار تو ہو گا تم سے۔''

سگریٹ ایش ٹرے میں بجھا کر وہ تھوڑی دیر خاموش رہی پھر بولی ''تھا جی پیار تھا کیوں نہیں پر پولا پولا پیار تھا۔''

''پولا پولا پیار کیسا ہوتا ہے اصل؟'' میں نے سوال کیا۔

''ایسا پیار رسی جیسی بودی رسی ہوتی ہے زور سے کچھ باندھو تو تڑک کر کے ٹوٹ

جاتی ہے ایسا پیار جس کا یقین سب کر دلاتے پھریں اور خود اپنے جی کو بھی یقین نہ آئے ایسا پیار سر جی تھبڑی جائے اس کا بھی کوئی قصور نہیں تھا اس کی دوکان تھی انارکلی میں کپڑے کی ماں تھی بہنیں تھیں ایک پچھلی منگیتر تھی ایک شادی کے بعد کی محبوبہ تھی اتنی لمبی چوڑی ذات برداری کی عورتیں تھیں جو آدمی اتنی عورتوں میں بٹا رہے وہ بیچارہ بھی خالی ہو جاتا ہے اس کی زندگی ساری حصہ پتی میں گزرتی تھی۔

ادھر مجھے عادت نہیں تھی بٹے کے سوالوں کی ہم بچپن سے مرد کے جسم دل روح پر سوار ہونا سیکھتی ہیں ہم جب بھی کسی کو پکڑیں مضبوطی سے پکڑتی ہیں پولے پولے]یاراں وہ مجھے نفرت تھی سر جی۔"

وہ تھوڑی دیر چپ رہ کر پھر آپ ہی بولنے لگی "ہمارے ہاں رواج ہے کہ مرد کو قابو کریں تو پھر ایسا کہ وہ اس کی ساری جائیداد بک جائے اور وہ ہمدردی چوکھٹ پر بیٹھ کر ساری عمر چلمیں بھرتا رہے غفور درزی کی طرح اس کی بیوی ساری عمر مزاروں پر بھٹکتی پھرے۔ بچے یتیموں کی طرح پھریں سر جی ویسے ہر انسان کا جی چاہتا ہے ناں کہ اس کے چاہنے والے کا کچھ نہ رہے ہر انسان کے اندر رب جو ہوا سر جی رب اپنے چاہنے والوں کا کچھ رہنے دیتا ہے کبھی؟ سوائے اپنے۔"

"ہر ایک کا نہیں اصل کسی کسی کا" میں نے لمبی آہ بھر کر کہا۔

"ناں سر جی ہر مرد کا ہر عورت کا ہر انسان کے اندر رب چاہتا ہے کہ کوئی اسے ٹوٹ کر چاہے اس کی پرستش کرے بیوی بچوں والا ہو تو بیوی بچے چھوڑ دے دولت مند ہو تو مانگتا پھرے کسی بیاہی ہوئی عورت سے پیار ہو تو عاشق چاہے گا کہ آدھی رات کو شوہر کے پہلو سے اٹھ کر آئے نیک نام ہو تو بدنامی کے کنوئیں میں اترے۔"

"تمہیں سر جی" وہ تھوڑی دیر بعد بولی۔

"کیوں؟ ...."

"بس انھیں مجھے ایک کام یاد آگیا۔"

میں اصل سے بھا بھی صولت کی بات کرنے والا تھا لیکن اس وقت اس کی آواز میں کچھ ایسی تیزی تھی کہ میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"مجھے آج بہت کام ہیں اصل ایک ریہرسل ہے ایک ریکارڈنگ ہے پھر کلائنٹ کو میں خاص بلوا رکھا ہے۔"

"آپ چلیں تو سہی جلدی آجائیں گے۔"

پہلے وہ میرے کمرے سے رخصت ہوئی دس پندرہ منٹ کے بعد میں نکلا ریڈیو سٹیشن کے روبرو وہ میرا انتظار کر رہی تھی سڑک پر پہنچ کر وہ میری موٹر سائیکل پر سوار ہوگئی چلتی سواری کے شور میں میں نے اسے کہا "تم وہاں سے میرے ساتھ کیوں نہیں آئیں؟"

"کچھ پردہ رکھنا پڑتا ہے" موٹر سائیکل کی فلا بلاسٹ آواز پر غالب آکر وہ بولی۔

میں نے اسے بتانا چاہا کہ احتیاط کے باوجود خوشبو کی مانند ہوتی ہیں جہاں کہیں ہوا جاتی ہے انہیں ساتھ لے جاتی ہے بھابھی صولت کو اس وقت سانده کلاں میں معلوم ہے کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔

ویلی اعتبار سے بھی اصل بڑی رنگا رنگ تھی۔

سکے گھر میں مجلسیں ہوتی تھیں اور وہ بڑی دھوم دھام سے محرم مناتی تھی۔ عاشورے کے دوران اس کے تن سے کبھی سیاہ کپڑا نہیں اترا پنج تن پر جان نثار کرتی تھی بی بی فاطمہ کے گھرانے کی عاشق تھی اس کے دومنزلہ مکان میں محرم کے دنوں میں مجلسوں کا زور شور سے انتظار رہتا تھا اور وہ ایسے ایسے مرثیہ پڑھنے والے حاضر کر

یتی جو ساری محفل کو رلائے بغیر نہ رہتے شیعہ رجحانات کے باوصف وہ لاہور کی تمام درگاہوں پر باقاعدگی سے جاتی تھی۔ حسین زنجانی میاں میر صاحب بابا شاہ جمال اور داتا صاحب کے قدموں میں جاتا تو اس کا معمول تھا کرسمس کی رات کو وہ بڑی خوش ہوتی اور اکیلی کرسمس مناتی اس نے مجھے بتایا تھا کہ قیام پاکستان سے پہلے وہ بڑے خوش سے دیوالی کے دن گھر کی منڈیر پر دیئے بھی جلاتی تھی اور اس نے یک مرتبہ ایک ہندو بزنس مین کو راکھی بھی باندھی تھی۔

جس وقت ہم دونوں لارنس باغ میں داخل ہوئے میرا دل دھک سے رہ گیا میرا خیال نہیں تھا کہ وہ مجھے باغ جناح لے جائے گی اس باغ میں ایک کافور کا درخت تھا اور اس درخت کی چھاؤں سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

"بس سرجی یہاں اترتے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے مجھے آج بہت کام ہے میں باغوں کی سیر کو نہیں نکل سکتا"

"میں آپ کو باغ میں نہیں لے جارہی سرجی وہ دیکھیے بابا ترت مرد کا مزار۔ بس یہاں حاضری دیں گے اور لوٹ جائیں گے بس دس منٹ "

ہم barrier کے پاس موٹر سائیکل پارک کر کے مزار کی طرف چلنے لگے مزار کی جانب سے قوالوں نے ہارمونیم کے سر اٹھانے شروع کر دیے تھے میں چپ تھا اندر باہر احتل سے مل کر میں نے سیمی کی یادوں کو قفل لگا کر کولڈ سٹورج میں رکھ دیا تھا۔

"بہت چپ ہیں آپ سرجی؟"

"ہاں کچھ کچھ۔"

پتہ نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ احتل کے کشادہ سینے پر سر رکھ کر رونے لگوں؟ لیکن رونے کی بھی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔

"اس عورت کو دیکھ کر چپ لگی ہے؟" احتل نے سوال کیا۔

"کون سی عورت۔"

"وہ   ؟"

میں نے سامنے دیکھا ایک جوان عورت ہاتھ اٹھائے مزار کی دیوار سے لگی، دعا مانگ رہی تھی اس نے ریشم کا کرتا پہن رکھا تھا اور مخالف رخ کی ہوا کے باعث وہ مڑی ہوئی شاخ جیسی لچکیلی نظر آ رہی تھی۔

"کیسی ہے؟" احمل نے پوچھا۔

"کسی بوڑھے مرد کی بیوی ہے جوان عاشق سے ملنے کی دعا مانگ رہی ہے۔"

"ناں جی   جوان آدمی کی محبوب ہے اور دعا مانگ رہی ہے کہ شادی ہو جائے اس سے۔"

"شادی شدہ تو نہیں لگتی" میں نے کہا۔

"لیکن ہے   ورنہ پیٹ ایسا نہ ہوتا"

"اگر شادی شدہ ہے تو پھر   بیٹے کی دعا مانگ رہی ہے"

"بیٹا تو ہے   اس کے پاس صرف محبت نہیں ہے بچپن کے عاشق کو یاد کر رہی ہے۔"

"پھر ہمیں کیا؟۔"

"ہاں ہمیں کیا۔"

ہم دونوں مزار کے قرب میں پہنچ کر چپ ہو گئے۔ ساری فضا وای کے اولین سروں سے بوجھل تھی ترت مراد کے مزار پر بہت کم لوگ تھے   ہر طرف آنند تھا شانتی تھی، خوشبو تھی کچھ مزار کے پھولوں کی   کچھ باغ سے اڑ کر آنے والی بہار کے دنوں میں مزاروں کی فضا آرزوؤں سے سسکنے لگتی ہے قریب پہنچ کر میں نے ریشمی کرتے والی کی طرف دیکھا وہ مزار سے باہر والی دیوار کے پاس ہاتھ اٹھائے چپ کھڑی تھی نہ اس کے چہرے پر کسی آرزو کا کرب تھا نہ کچھ پا لینے کی ہوس   وہ

لچکیلی شاخ کی طرح تمام کی تمام شکر گزاری کے پھولوں سے لدی تھی۔

مزار پر پہنچ کر یکدم احتل اجنبی ہو گئی اس نے وضو کیا۔ گیلے چہرے کے اوپر دوپٹے کی بکل ماری اور اندر مزار کی طرف چلی گئی میں قوالوں کے پاس درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ رہا۔

اسی طرح جب میں چندراں سے قصور آتا تھا تو میں ماموں کے گھر سے نکل کر روز بابا بلھے شاہ کے مزار پر عین وہاں جا بیٹھتا جہاں قبریں ہیں قوالوں کی آواز یں آتی رہتی اور میں مزار سے ہٹ کر ان قبروں کے بیچ بیٹھا رہتا گپ چپ ان دنوں نہ مجھے بابا بلھے شاہ سے عقیدت تھی نہ میں قوالوں کی موسیقی سے متاثر ہوتا صرف وہاں بیٹھ کر میں آنے جانے والے عقیدت مندوں کو دیکھتا رہتا مجھے ان عقیدت مندوں سے بڑا پیار تھا ان کی شکلیں بدلتی رہتی تھیں لیکن ہاتھوں کو جوڑنے کا انداز بھرائی ہوئی آنکھیں لرزتے ہوئے ہونٹ وہی رہتے تھے کئی کئی گھنٹے میں چپ چاپ قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھا رہتا چندراں میری ماں ابا عزیز کا تن سب مجھے ان قبروں میں سوئے ہوئے نظر آتے میں ان قبروں کے ساتھ ٹیک لگا سکتا تھا ان کے اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا

بڑی دیر بعد احتل میرے پاس آئی رونے کے بعد وہ بڑی کمسن لگ رہی تھی

''آپ بھی کوئی دعا مانگ لیجئے سر جی۔''

''مانگ لی ہے۔''

''کیا؟''

''بس بتائیں گے کبھی! اور تم نے کیا دعا مانگی ہے احتل؟''

''بس یہی یہی سر جی زندگی تو کسی پیار کرنے والے کے سہارے گزری نہیں اب موت تو کسی پیارے کے ہاتھوں آئے۔''

ہم دونوں واپس موٹر سائیکل کی طرف چلنے لگے۔

وہ بھی ہوا کی دھنسی ہوئی چپ تھی جس وقت ہم پیریئر کے پاس پہنچے تو پتہ نہیں کیوں مجھے خیال آیا کہ آج پہلی بار میں احمل کو وہ مزار دکھاؤں جہاں کبھی میرے خیالوں میں دفن تھی میں اسے کبھی کے متعلق وہ سب کچھ بتاؤں جس کا اظہار میں آج تک نہ کر سکا۔

"آؤ احمل۔"

"کہاں سر جی۔"

"یہیں اسی باغ میں۔"

"آپ کو دیر ہو رہی ہے بہت کام ہے آپ کو دفتر میں۔"

"کام تو ہوتا ہی رہے گا آؤ۔"

بہار کے نئے نئے دن تھے کچے ناریل جیسے کچر کچر دن گرم ملکوں میں بہار تھم نہیں آتی اس کے ساتھ گرمیوں کا احساس بھی آتا ہے جسم میں سردیوں کی یاد اور گرمیوں کا خوف ہوتا ہے پتے جھڑے درختوں میں نئی کونپلیں سبز براؤن چکنے پتے اور بند بند کلیاں ہوتی ہیں ہر رت میں تمام عناصر کی ہیئت بدل جاتی ہے ہوا پانی اور روشنی کا مزاج بدلتا رہتا ہے لیکن روشنیوں کا موسم کے ساتھ بڑا گہرا تعلق ہے سردیوں کی روشنی اور دھوپ میں معافی مانگنے کا انداز ہوتا ہے دیر سے آنے والے مہمان کی طرح وہ چوکھٹوں کے سایوں سے چمٹی رہتی ہے اور دیر سے آنے کا اعتراف کیے بغیر وقت سے پہلے رخصت ہو جاتی ہے گرمی کی روشنی دندناتا سا ہوکار ہے ہرشلی لاء ہے پولیس ایکشن ہے دندناتی آتی ہے گلیاں بازار سب سونے ہو جاتے ہیں جیسے کرفیو لگا ہو۔

لیکن بہار کی روشنی میں نہ تمد ہوتی ہے نہ شکست۔

وہ بار بار گلے لگنے والی محبوبہ کی طرح ہر ہر مسام میں خوشی بھر دیتی ہے بہار کی روشنی جگمگاتی ہے سدتی ہے ہوش میں رکھتے ہوئے بے سدھ کیے رکھتی ہے اس

میں دن چڑھنے سے دن ڈھلنے تک ہزاروں کیفیتیں بدلنے کا مادہ ہوتا ہے باغوں میں اس کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے۔

کوٹھوں پر بازاروں میں اس کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے کھڑکیوں دروازوں میں یہ منتظر کھڑی ہوتی ہے بار بار گلے ملنے والی محبوب کی طرح پذیرائی ہی پذیرائی ہوتی ہے

بچھڑنے سے پہلے بار بار ملنے کی وارفتگی!

دراصل بہار کی روشنی مکمل انتظار ہے۔

زردہ زردہ دھوپ میں گھومنے پھرنے والے بھونروں کا انتظار۔

موٹر سائیکل پر آنے جانے والے نوجوانوں کا انتظار۔ بسوں پر سوار ہوتی لڑکیوں کا انتظار۔

سارے شہر کو نہ جانے کس مسیحا کا انتظار ہوتا ہے کہ بہار کی روشنی پیلی پڑ جاتی ہے اور وہ بسنتی کپڑے پہن کر پیلی دھوپ میں نکل آتی ہے مجھے بھی اس بہار کے دن میں پتہ نہیں کس کا انتظار تھا؟ یسی کا؟ عابدہ کا یا فقط اپنی ذات کا۔

سامنے درختوں سے چمگادڑیں قطار در قطار، گروہ در گروہ چمٹی ہوئی تھیں۔ ایک اندھی چمگادڑ ہمارے سامنے اوپر سے گری اور چند بچے گھیرا ڈال کر اس کا معائنہ کرنے لگے۔ ہم چپ چاپ پہاڑی کے بائیں جانب منٹگمری ہال کی سمت چلنے لگے۔ بہار کے دنوں میں کبھی کبھی اچانک زندہ رہنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور اگر جسد زندگی کا لہو منہ کو نہ لگے تو آدمی بہار کی زرد روشنی میں صرف سانس روک کر مر سکتا ہے کافور کے درخت تلے پہنچ کر میں رک گیا۔

"یہاں کچھ کچھ دیر بیٹھیں افضل یہ بڑا مقدس درخت ہے۔"

افضل نے اپنے برقعے کا نقاب اتار کر گھاس پر بچھا دیا "آپ اس پر بیٹھ جائیں سر آپ کا سوٹ خراب ہو جائے گا۔"

میں نے نقاب کو گھٹنوں پر رکھ لیا اور چپ چاپ بیٹھ گیا۔

''اس درخت تلے ایک لڑکی ملی تھی مجھے ایک بار۔''

پتہ نہیں یہ کافور کا درخت کی خوشبو تھی کہ کسی کے نہ نظر آنے والے وجود کی لیکن اس وقت میں احتل کے ساتھ نہیں تھا میں اندر ہی اندر بھیگ رہا تھا جیسے کسی آبشار کے کنارے بیٹھا ہوں۔

''احتل! کبھی تم نے کسی ایسے شخص سے محبت کی ہے جو کسی اور کی محبت میں مبتلا ہو؟''

''ہاں جی .... بلکہ ہمیشہ!''

''بہت ٹوٹ کر .... پاگل پن کی حد تک۔''

''ہاں جی ایک شخص سے کی تھی''

''درزی غفور جیسی محبت۔''

''کی تھی سر جی ....'' احتل نے لمبا سانس لیا۔

''کہاں ملی تھیں تم اسے۔''

احتل نے اپنے گھٹنوں کے گرد بازو حائل کیے اور کھڑے زانو پر سر رکھ کر بولی

''پرانے ریڈیو سٹیشن پر ملی تھی جی اسے بہت سال ادھر کی بات ہے تب میری شادی بھی نہ ہوئی تھی ان دنوں ریڈیو سٹیشن شملے پہاڑی کے پچھواڑے ہوتا تھا میں ریڈیو پروگرام کیا کرتے تھے آر ڈی صاحب مجھے اپنے کمرے میں بلا کر دھیما دھیما ٹھرک جھاڑا کرتے تھے بڑی عزت تھی میری ان دنوں .... بڑی شان تھی پروگرام پروڈیوسر کار تک چھوڑنے آتا تھا۔ ذرا لیٹ جاتی تو فون پر فون آتے ریڈیو سٹیشن کی گاڑی لینے آجاتی .... گھر پر ریڈیو سٹیشن پر .... چہر میں ہر جگہ عزت ہی عزت تھی۔''

''کیا نام تھا اس کا؟۔''

''ایسے لوگوں کا کوئی نام نہیں ہوتا اور نہ ہی ایسے بندوں کا کوئی گرام ہوتا ہے

بس وہ دیس بدیس بجلیاں گراتے پھرتے ہیں۔"

"ہم دونوں بڑی دیر تک خاموش رہے سڑک پر لکڑی کی ہیل پہنے کوئی لڑکی جا رہی تھی میں نے آنکھیں بند کر لیں جوتوں کی چاپ بالکل ویسی جیسی تھی لکڑی کی ہیل سیسہ پلائی سڑک کا سینہ کوٹ رہی تھی۔"

"جس وقت میں آر ڈی صاحب کے کمرے میں پہنچی وہ جانے کے لیے تھر رہا تھا کھدر کی سفید شلوار قمیض کندھوں پر کالی سیاہ چادر سفید رنگ، براؤن بال براؤن آنکھیں کھڑا ہوتا تو لگتا کہ کھڑے رہنے میں اس کا سارا حسن ہے بیٹھ جاتا تو لگتا کھڑے ہو کر اتنا پیارا کبھی نہیں لگ سکتا مجھے دیکھ کر وہ دوبارہ کرسی میں بیٹھ گیا لیکن بولا نہیں میرے سلام کا جواب ہی نہیں دیا۔ آر ڈی صاحب نے تعارف کروایا اس نے صرف سر کے ہلکے سے اشارے سے جواب دیا۔ چائے آ گئی آر ڈی صاحب مجھ سے دھیما دھیما توجہ بھرا عشق کرتے رہے میں دو گھنٹے بیٹھی رہی وہ ایک لفظ نہیں بولا لیکن بار بار دیکھتا تھا لمبے لوگوں کی نگاہیں جب بھی آپ پڑتی ہیں ہمیشہ چوم کر اٹھتی ہیں ہے نا سرجی؟"

وہ چپ ہو گئی۔

یہ ایک نئی احتل تھی یادوں کی غلام گردش میں ننگے پاؤں بال کھول کر پھرنے والی احتل اس کی باتوں میں سے سارا چھکو پن غائب تھا اس کی آواز پنکھڑیوں کی طرح گر رہی تھی پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ ایک زمانہ ضرور ایسا بھی ہو گا کہ جب وہ بہت چھا گئی ہو گی اور لوگ ریڈیو سے کان لگا کر اس کے گیتوں کو سنتے ہوں گے۔

"پھر پھر احتل؟ ..."

"جب میں ریہرسل کر رہی تھی تو وہ اندر آ گیا۔ بڑا مشہور شاعر تھا ریڈیو کے لیے غزلیں بھی لکھتا تھا سب کے ساتھ صاحب سلامت تھی اندر آ گیا اور ایک کاغذ کا پرزہ مجھے پکڑا کر بولا اسے گائیے میں نے غزل پڑھی اور سٹنے میں آ گئی میں

بڑے بڑے خوبصورت مرد کو ٹھے پر دیکھے ہیں سر جی لیکن کسی خوبصورت مرد کو اتنی خوبصورت شاعری کرتے نہیں دیکھا دھن تیار ہوئی میں نے ریہرسل کی سارا وقت وہ آنکھیں بند کیے کونے میں چپ چاپ بیٹھا رہا جب کبھی اچانک وہ میری طرف دیکھ لیتا تو میں لے پکڑنا بھول جاتی اس طرح آغاز ہوا پھر پھر بھی داستان ہے بدنامی کی جھگڑوں کی ہماری طرف تو خدا نہ کرے کسی کو عشق ہو جائے ..."

میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں نے اس کے لیے کئی سویٹر بنے تمباکو کا اسے شوق تھا کئی پائپ منگوائے ولایتی ٹائیاں قمیضیں میں اسے جب بھی میرا جی چاہتا میں اس پر کچھ نہ کچھ نچھاور کردوں اپنا جسم اپنی روح ساری ریاضت دھری کی دھری رہ جاتی اور میں اسے خط لکھتی رہتی دن میں تین تین خط سر جی اور وہ مجھے ہفتے میں ایک آدھ غزل بھیج دیتا اسے نے کبھی مجھے خط نہ لکھا کبھی کوئی تحفہ نہ دیا کبھی میرے جسم کو ہاتھ نہ لگایا اس کے باوجود وہ ایسے لگتا جیسے کسی روز مجھے ٹوٹ کر چاہنے لگے گا۔ میں اسی دن کی آرزو میں جی رہی تھی ہم روز ملتے تھے ہر روز میں اس ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کرنے کی کوشش کرتی سر جی کبھی آپ نے ایسے زخمی پرندے کو دیکھا ہے جو اپنے گھونسلے تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن پہنچ نہ سکتا ہو؟ ہر اڑان کے بعد میں منہ کے بل گرتی اور اڑنے لگتی۔"

"ہاں اصل سیکھا ہے اصل غور سے دیکھا ہے۔"

میں ذہنی طور پر حاضر بھی تھا اور غیر حاضر بھی ہر انسان پر ایسے لمحے آتے ہیں جب ردگرد کی ہر چیز کافی ہوتی ہے کسی نئی چیز کی خواہش یا انتظار بھی نہیں ہوتا بلکہ ہر کسی سے کوئی شکایت یا گلہ بھی باقی نہیں رہتا عشق کا روگ بھی کوسوں دور ہوتا ہے آگے پیچھے ہر سمت سے سکھ کا سندیسہ آتا ہے فضا میں ہوا میں روح میں کوئی پھانس نہیں ہوتی

صرف اس کے سائے کا رنگ بدل جاتا ہے اور اس سائے میں نہ جانے کیا کشش ہوتی ہے کہ وہ سارے کا سارا خوف سے لبریز ہو جاتا ہے اور جیسے ہوا میں سگریٹ کی پنی کانپتی ہے ایسے ہی اس کی پسلیوں تلے اس کا دل کرزنے لگتا ہے انجانے خوف سے انجانی تبدیلیوں سے۔

''آخر میں نے ایک دن آر پار جانے کا فیصلہ کر لیا سرجی میں نے اسے خط لکھا کہ وہ مجھے رات کے دو بجے شملہ پہاڑ کے پاس ملے''

''اس نے میرے اس خط کا بھی جواب نہ دیا۔''

''تمہیں یقین تھا کہ وہ آئے گا؟''

''جی مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔''

''کیسے احمق؟''

''بس سرجی کچھ باتوں کا دل کو ایسے ہی یقین ہوتا ہے میں نے بڑا زمانہ دیکھا ہے مجھے معلوم ہے آج جس پر دم نکلتا ہے کل وہی اجنبی لگے گا وقت کے ساتھ ساتھ سب عشق عاشقی ختم ہو جاتی ہے لیکن وہ ایسا عشق نہیں تھا جیسے وقت کا ہتھوڑا کوٹ پیس سکے''

بڑی دیر تک وہ اپنے برقعے کے پھونسڑے نکالتی رہی پھر بولی ''بی بی کو مجھ پر بہت شبہ تھا۔ اس نے کئی دن سے میرا نکلنا بند کر رکھا تھا میرا سارا زیور کپڑا بھی بی بی نے نیچے لے جا کر اپنے قبضے میں کر لیا۔ بڑی کپتی تھی جوانی میں بی بی مجھے ایسا ایسا مارا ہے کہ کہ پتہ نہیں میں اندھ کیسے ہوں آج کنڈی والا ڈنڈا ہمیشہ سرہانے رکھ کر سوتی تھی۔''

''مارا کیوں؟''

''مارتی نہ تو اور کیا کرتی آپا کو مرے تھوڑا عرصہ ہوا تھا فیروزہ سات سال کی تھی اور باقی پانچ بیٹے تھے بی بی کے سارے کے سارے نکھٹو میری مانگ بھی تھی ان

دنوں ڈیرہ غازی خان ہزارہ سبی زیارت، شورکوٹ سکھر جانے کہاں کہاں مجرے نہیں ہوئے میرے ان دنوں بی بی مالداری ہو رہی تھی وہ میرا عشق کیسے برداشت کرتی بھلا؟“

میں بولنا چاہتا تھا لیکن ہر جگہ بسی بکھری پڑی تھی اس کی جوتیاں، کپڑوں کا بیگ، کھلے بال جینز گلابی عینک، کستوری کی خوشبو۔

”جس روز میں گھر سے بھاگی ہوں۔ اس کی روز شام سے بارش پڑ رہی تھی پہلے میں نے ان والے جی سے تین چار غزلیں گائیں اور پھر طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر کے بیٹھک سے آ گئی بڑی بارش تھی بڑی سردی تھی دروازے کھڑکیاں آنے جانے سے روکتے تھے میں سر پر لحاف لے کر جاگ رہی تھی کہ بی بی نے ایک سندھی نواب اوپر بھیج دیا بڑی بڑی مونچھیں گہری سیاہ آنکھیں بڑی بڑی بولنے سے پہلے مسکراتا اور مسکرانے سے پہلے ابرو کے بال کھینچتا پرانے مراسم تھے اس کے میرے ساتھ جب بھی لاہور آتا ہمارے پاس ہی ٹھہرتا تھا۔“

انجل نے لمبی سانس لی اور بڑی دیر بولی نواب صاحب کا باغ تھا حیدرآباد کے قریب کیلوں کا باغ بڑی آمدنی تھی تین تین کاریں تھیں لیکن ہمیشہ اپنے بٹوے کو ازاربند سے باندھ کر سوتا تھا باہر بارش کی چادر لٹک رہی تھی زیور کپڑا سارا بی بی کے پاس قسمت سے سواری کے لیے بھی دھیلا پاس نہ تھا بی بی نے سونے سے پہلے سارے پیسے مانگ لیے تھی بہانے بہانے سے اور میں نے اس سے وعدہ کیا تھا شملہ پہاڑی کے پچھواڑے ملنے کا۔“

”بڑی دیر تک سندھی سائیں اپنے باغ بیوی اور بچوں کی باتیں کرتا رہا پھر بے سدھ ہو گیا پتہ نہیں کیا بات ہے جب اللہ کو منظور ہوتا ہے تو خود بخود سبب بن جاتا ہے پہلی بار میرے دل میں کسی کو قتل کرنے کا خیال آیا۔ اس وقت وہ مجھے آدمی لگتا ہی نہیں تھا جی میں آئی کیوں نہ اس بھیڑ و کو ذبح کر دوں امیر آدمی ہے بٹوے میں ہزاروں ہوں

گے۔ لیکن مجھے قتل کرنے کا کوئی درست طریقہ نہ آتا تھا۔ نہ میرے پاس کوئی تیز چھری تھی نہ کبھی میں نے پستول کا لائسنس بنوایا تھا لیکن اس وقت مجھے پورا یقین تھا کہ اگر مجھے کہیں سے کند چھری بھی مل گئی تو میں اس کی شہ رگ کاٹ دوں گی کوئی بیس مرتبہ میں پلنگ سے اٹھ کر غسل خانے گئی آخر میں نے چھری کی تلاش شروع کر دی۔ کبھی کبھی پھلوں کی خاطر میں اپنے کمرے میں چھری رکھا کرتی تھی کبھی میں اپنا پرس اٹھا کر غسل خانے میں لے جاتی کبھی سوٹ کیس اٹھا کر غسل خانے میں لے جا کر اس کی تلاشی لیتی آخر کو میں نے سندھی نواب کے ساتھ والی سائیڈ ٹیبل کا دروازہ کھولا جس وقت میں نے دروازے کھولا تو نواب صاحب نے میری طرف کروٹ لی اور بولے کیا کر رہی ہو سو جاؤ" میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا میں نے دبی آواز میں کہا میری طبیعت خراب ہے دوائی تلاش کر رہی ہوں۔ سندھی سائیں اچھا کہہ کر سو گئے میں نے پھر کچھ دیر بعد دروازہ کھولا سامنے چھری اور بٹوہ ساتھ ساتھ پڑے تھے۔"

میں نے دلچسپی سے اجل کی طرف دیکھا پھر اجل پھر؟"

"میں نے چھری اور بٹوہ دونوں اٹھا لیے اور غسل خانے کی طرف لی لیکن وہاں تک کا فاصلہ سراط کا پل تھا میں جیسے تپتی ریت پر چل رہی تھی غسل خانے میں پہنچ کر بٹوہ میں نے اپنے ازار بند سے باندھ کر اندر اڑس لیا اور چھری کموڈ پر رکھ دی شہ نشین والے راستے سے پچھلی سیڑھیوں پر گئی بڑی احتیاط سے کنڈی کھولی اور باہر۔

"

"کتنی رقم تھی بٹوے میں؟۔"

"ایک فیروزے کی انگوٹھی اور بائیس ہزار روپے تھے۔"

"پھر پہنچیں تم شملہ پہاڑی۔"

شاہی محلے سے داتا دربار تک پیدل گئی وہ بارش وہ بارش ایک سردی کہ

ہڈیوں تک جم گئیں لیکن میرا دل گرم تھا اس رات میں اپنی زندگی کا سب سے اہم
فیصلہ کرنے والی تھی بالآخر ایک رکشا مل گیا سالم پھر کبھی میں اپنا دوپٹہ نچوڑتی
کبھی چادر کبھی بال جھٹکتی مجھے رکشا ڈرائیور سے بھی خوف آ رہا تھا لیکن پتہ نہیں
کیا بات تھی کہ دل میں خوشی ہی خوشی تھی جب میں شملہ پہاڑی کے سامنے پہنچی تو پتہ
نہیں کیوں سرجی میرا جی چاہنے لگا کہ واپس جا کر نواب صاحب کو بٹوہ لوٹا دوں
اس سے پہلے کبھی میرا ضمیر نہ جاگا تھا لیکن ابھی میں نے رکشا والے کو
موڑنے کے لیے کہا ہی تھا کہ وہ مجھے لیمپ پوسٹ کے سامنے بھیگتا ہوا نظر آ گیا۔"

"آ گیا وہ بڑی خوش نصیب ہو تم!"

"اس وقت میں بھی یہی سمجھتی تھی ہم دونوں مل کر ایک ہوٹل میں چلے گئے وہ
سارے کا سارا بھیگا ہوا تھا اور بار بار چھینک رہا تھا ہم دونوں ہیٹر کے سامنے بھیگے
پرندوں کی طرح بیٹھ گئے وہ پہلی دفعہ بولا کہنے لگا "دیکھو نند میں تم سے شادی کر
سکتا ہوں نہ محبت / میں کسی اور کا ہوں تم اپنے آپ کو سمجھا لو۔"

میں رونے لگی بڑی دیر تک روتی رہی پھر میں نے گیلے کپڑے اتار دیئے اور بستر
پر لیٹ گئی مجھے سردی لگ رہی تھی کپکپی سے میرا سارا بدن ہچکولے کھا رہا تھا

"مجھے سردی لگ رہی ہے"

"میں چائے منگواتا ہوں۔"

جب چائے آ گئی تو اس نے پیالی بنا کر مجھے دی لیکن بستر کے پاس نہیں آئے
میں کئی گھنٹے روتی رہی وہ ہیٹر کے سامنے بیٹھ کر اپنے بدن کے کپڑے سکھاتا رہا آخر
جب رونے سے بھی جی کا بوجھ نہ اترا تو میں نے اسے پکارا

"کیا نام تھا؟"

"آپ کو نام سے کیا لینا ہے سرجی ایسے لوگ بے نام ہوتے ہیں میں نے اسے
پکارا تو وہ پاس آ کر قالین پر بیٹھ گیا اس کے کندھے پر میری چادر تھی اور وہ بارش میں

نہا کر اور بھی شفاف ہو گیا تھا میں نے بائیس ہزار روپیہ سرہانے سے اٹھا کر اس کی جھولی میں پھینکا پہلے وہ بھونچکا رہ گیا پھر روپے کو دیکھتا رہا۔"

"تمہارے لیے ہیں ــــــ یہ سب"

"افسوس میں تمہارے کسی کام نہیں آسکتا اجل۔" بڑی دیر کے بعد وہ بولا "میں اپنی ماں کا کلوتا بیٹا ہوں اس نے بیوگی کے سارے دکھ جھیل کر مجھے پالا ہے۔ گر میں نے تم سے شادی کر لی تو وہ مر جائے گی ــــــ میں کبھی کسی عورت کا نہیں ہو سکتا، اجل میں صرف اپنی ماں کا ہوں ــــــ میں اس کے دکھوں میں حل ہو چکا ہوں سارے کا سارا۔ پھر اٹھ کر اس نے روپے مجھے لوٹا دیے۔ اجل وہ کہنے لگا میرے دکھوں سے مجھے یہ روپیہ نجات دلا سکتا ہے لیکن میں تمہاری عمر بھر کی کمائی لینا نہیں چاہتا۔ اس نے روپیہ میرے سرہانے رکھ دیا میں اصرار کرتی رہی اور پھر سو گئی۔ اٹھی تو مجھے تیز بخار چڑھا ہوا تھا کھڑکی سے پھیکی روشنی آ رہی تھی میں نے سرہانے تلے ہاتھ مارا وہاں روپیہ پیسہ کچھ نہ تھا ایک پرزے پر دو شعر لکھے تھے جن میں روپے کا شکریہ ادا کیا تھا ــــــ اس کے بعد سرجی ایک اور لمبی کہانی ہے وہ تو بیچارہ سندھی نواب شریف آدمی تھا ورنہ ہمیں تو تھانے کی شکل دیکھنا پڑتی۔"

"پھر تمہیں نہیں ملا وہ شاعر؟"

"پہلے تو میں کئی مہینے ریڈیو سٹیشن نہ گئی جانے لگی تو پتہ چلا کہ وہ کراچی چلا گیا ہے "اجل نے لمبی سانس بھری اور چپ ہو گئی۔

اس نے اپنے اندر کنڈی لگا لی تھی ــــــ بہار کی فضا خاموشی اور خوشبو کی وجہ سے بوجھل ہو گئی ــــــ ہم دونوں کی سوچ الگ الگ سمت میں رواں تھی۔

بڑی دیر بعد وہ بولی ــــــ سو گئے بادشاہو۔

وہ موڈ بدلنے کی کوشش میں تھی۔

"سوئے تھے پر کسی خصماں نوں کھانے نے جگا دیا۔"

وہ جھوٹی ہنسی ہنس کر بولی "بات نہیں بنی سر جی اگر مجھے پان کھانا اور بات کرنا آتا تو میں آپ کا دل بہلاتی۔"

"آج تو خوب باتیں کر رہی ہو۔"

"کچھ نہیں سر جی نہ بات کرنی آئی نہ پان کھانا آیا۔ دونوں باچھوں سے پان کی دھاری بہنے لگتی ہے بیگمات کو پان کھاتے دیکھا ہے پان گلے میں اور رنگ ہونٹوں پر عورت اچھا پان کھانے والی ہو اچھی بات کرتی ہو تو مرد ضرور متاثر ہوتا ہے۔"

"مجھے تو تم ویسے بھی متاثر کرتی ہو۔"

"چھوڑیئے سر جی اب وہ ٹیم نہیں رہا۔ ویسے آپ بھی بہت دور نکل چکے ہیں آپ کو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"پڑتا ہے اصل بہت پڑتا ہے۔"

پہلی بار دونوں ایک دوسرے کے ماضی سے متعارف ہو رہے تھے وہ مجھے اندوال اصل سے مدد رہی تھی اور یہ اصل میرے لیے بالکل نئی تھی واقفیت بڑھنے کے باوجود عجب بڑھ رہا تھا ہم دونوں قریب آنے کے بجائے اجنبی بنتے جا رہے تھے۔

"آپ سر جی؟ —— آپ نے بھی کبھی زخم کھایا ہے؟۔"

بڑی دیر تک میں اسے سیمی کے متعلق سب کچھ بتا رہا تھا اپنے دکھ اس کی حرماں نصیبی ہم دونوں کمان اور تیر کی طرح کیسے ساتھ رہے اور کیسے دور دور نکل گئے وہ چپ چاپ سنتی رہی گردن گرائے نظریں جھکائے ایک بار بھی اس نے کوئی سوال نہ کیا کوئی تفتیش نہ کی۔

شام پڑنے لگی اور ہوا میں خنکی آ گئی۔ باغ کی چہل پہل میں اضافہ ہو گیا۔ پھر شام کے جاگتے اندھیرے میں بتیاں روشن ہو گئیں اور ہم دونوں بیٹھے رہے آمنے سامنے الگ الگ وقتوں میں مقید علیحدہ گردشوں پر گھومتے ہوئے۔

"آپ کو ایک مشورہ دوں سر جی؟ قسم لے لیں کئی برسوں سے میں نے کسی کو

مشورہ نہیں دیا۔"

"ضرور دو۔"

"آپ شادی کرالیں سرجی آپ جیسے لوگ صرف شادی کے قابل ہوتے ہیں حرام سے کوئی واسطہ نہ رکھیں میں بتاؤں حرام سے کچھ ہوجاتا ہے یہاں۔" اس نے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا مطلب؟۔"

"آپ جیسے لوگ کچھ کرنے کرانے جوگے نہیں ہوتے نہ کوئی دھماکہ نہ قتل نہ خودکشی۔ آپ جیسوں کے لیے شادی بڑی اچھی رہتی ہے۔"

"مجھ جیسوں سے تمہاری کیا مراد ہے۔"

"آپ جیسے آدمی بندآدمی!"

"بندآدمی سے تمہاری کیا مرادی ہے اصل۔؟"

اصل نے ماتھے پر تیوری ڈالی کچھ دیر سوچتی رہی پھر بولی ایک نیک آدمی ہوتا ہے سرجی اور ایک بندآدمی دونوں ایک سے لگتے ہیں کچھ فاصلے سے پر بڑا فرق ہوتا ہے دونوں میں نیک آدمی کی سرشت نیک ہوتی ہے قدرتی طور پر ہو چاہے نیچ لوگوں میں رہے چاہے بدلوگوں کی صحبت میں اس کی سرشت کوئی اور رنگ قبول نہیں کرتی بھوک سے مر جائے لیکن عقاب مردار نہیں کھاتا سرجی حرام کی طرف مائل نہیں ہوتا۔

"میں تمہاری بات اچھی طرح سے سمجھا نہیں اصل "میں نے کہا۔

"نیک آدمی کے اندر جھگڑا نہیں ہوتا لیکن بندآدمی کے اندر بڑے جھگڑے ہوتے ہیں سرجی اس کے اندر بدی کی کشش ہوتی ہے لیکن وہ اپنے آپ کو بدی کی اجازت نہیں دیتا اس کے اندر نیکی موجود نہیں ہوتی لیکن وہ نیکی کیے جاتا کئی بار سوسائٹی کے ڈر سے کبھی کسی چاہنے والے کے خوف سے وہ دراصل خود پہ نہ

نہیں ہوتا دوسرے لوگوں کی رائے اس کا پیمانہ ہوتا ہے۔ بے چارہ کبھی آنکھوں پر پٹی باندھتا ہے کبھی سرپٹ بھاگتا ہے کبھی کانوں پر انگلیاں کبھی منہ پر تالا تو بہ توبہ سرجی بڑے عذاب میں زندگی گزرتی ہے اس کی میرا مطلب ہے سرجی نیک آدمی بدی دل سے کرنا نہیں چاہتا اس کی بس طبیعت ہی راغب نہیں ہوتی بند آدمی سب کچھ کرنا چاہتا ہے پر خوف سے مفلوج رہتا ہے وہ بھی ایسا ہی تھا وہ شاعر بھی ''آج تک بالکل نئی اصطلاح سے متعارف ہونے کا اتفاق تھا۔

''میں بھی اس کی طرح ہوں یا پیسے ہزار لے جانے والے کی طرح ؟''

میں نے سوال کیا۔

''بالکل سرجی بالکل آپ بھی بند ہیں سیل بند مہر بند ہوا بند آپ کے اندر بھی کوئی روشن دان نہیں آپ کے چوبچے سے بھی کوئی موری نہیں نکلتی سرجی وہ بھی بند کمرہ تھا آپ کو بھی گولک کی طرح بند ہیں۔ ہاں کبھی کبھی کوئی شخص آپ کے اندر گھس کر چور کو ہتھکڑی پہنا دیتا ہے ایسے میں اپنے آپ کو سزا دینے سے آپ بچ جاتے ہیں ورنہ تو ورنہ تو ''

میں نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا آج میں نے اسے سیمی کے متعلق سب کچھ بتایا تھا اور پہلی بار مجھے لگ رہا تھا کہ وہ اور میں ایک دوسرے کو بالکل نہیں جانتے اور اب جاننے کا وقت نکل گیا ہے تیل اور پانی باہم رہنے کے باوجود ایک دوسرے میں حل ہونے سے قاصر ہے انسان کا بھی خواب المیہ ہے کبھی کبھی کسی شخص سے پورا رابطہ بڑھا لینے کے بعد یکدم اسے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ تو حل ہونے کے بجائے سطح پر بیٹھ رہا اور ذرا دی چھیڑ چھاڑ سے اوپر آ کر کارک کی شکل میں تیرنے لگا ہر انسان کو کسی اور میں حل ہو جانے کی شدید آرزو ہوتی ہے اسی لیے وہ ساری عمر ہم جنسوں ہم زبانوں ہم وطنوں ہم شہریوں میں گھومتا ہے جھانکتا ہے اور رابطے جب بہت بڑھ

جاتا ہے تو ہر رشتے سے ایسی صدائیں آتی ہیں جیسے اندھے کنویں کی سطح سے جا کر خالی ڈول ٹکرائے اور شرمندہ ناٹک ٹوپیاں مارتا ہلکا پھلکا باہر کی طرف نکلنے لگے۔

"یہاں ہم سب کس لیے آتے ہیں سرجی صرف مرنے کے لیے ناں؟۔ زندہ رہنے کے لیے بھی اصل زندہ رہنے کے لیے بھی شاید۔"

اصل نے ماتھے پر ان گنت سلوٹیں ڈالیں ناں سرجی آنا صرف مرنے کے لیے ہے زندہ رہنا تو ٹائم پاس کرنے کے لیے ہوتا ہے اور ٹائم پاس کرنے کے لیے شادی سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں جلدی سے عمر کٹ جاتی ہے اور پھر حلال رستہ ہے یہ۔

"شاید اصلی مقصد اپنے اپ کو تلاش کرنا ہو اصل۔"

"اپنے آپ کو تلاش کرنا بہت مشکل ہے سرجی آپ جوان ہیں صحت مند ہیں بڑی عزت ہے آپ کی ریڈیو سٹیشن پر آپ سیدھی شادی کرالیں بھی آپ کا بیلنس ٹھیک نہیں دو پہیوں پر گاڑی چلے تو بیلنس ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تم تم مجھ سے شادی کرالو اصل ہم دونوں۔"

یکدم اس کی آنکھوں سے آنسو بے تحاشا گرنے لگے اور اس کا چہرہ بوڑھی عورت کا ہو گیا وہ بیالیس سے بھی زیادہ کی لگنے لگی۔

"ہم دونوں سرجی؟ ہم دونوں؟ میرے جسم کا تو ہر قطرہ حرام پر پلا ہے سرجی میں اس لہو سے اب کوئی حلال زادہ پیدا نہیں کر سکتی میں میں نے کوشش کی تھی ایک بار شادہ کی سرجی پر چھوڑ دیں اس بات کو میں شادی کے قابل نہیں ہوں۔"

وہ آنسو پونچھنے لگی۔

"تمہیں کبھی اپنا بیٹا یاد نہیں آتا۔"

"اپنا جو ہوا سرجی یاد کیسے نہ آئے؟ پر کیا کروں اسے یاد کر کے

آپ سرجی غلط عورتوں کے پیچھے وقت ضائع نہ کریں آپ کو چاہیے ایک باکرہ لڑکی طیب دوشیزہ جو آپ کو سیدھا راستہ دکھا سکے"

"باکرہ کیوں احتل۔"

"آپ کو عورت کے دل کی تلاش ہے باکرہ جو ہوتی ہے سرجی اس کے چمن سے ابھی کسی نے پانی نہیں پیا ہوتا وہ جسم اور دل ایک ہی جوئے میں ہارتی ہے آپ کے بڑے احسان ہیں مجھ پر خدا قسم میں اگر پہلے جیسی ہوتی تو فوراً آپ سے شادی کرا لیتی۔"

اس وقت وہ کسی مصری راہبہ کی طرح بڑی پرشکوہ لگ رہی تھی۔

"یہ جسم اور دل بڑے بیری ہیں ایک دوسرے کے سرجی۔ جسم روندا جائے تو دل کو پلنے نہیں دیتا ان دونوں کو کبھی آزادی نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ جانے کیوں میرے مولا نے ان کو ایک ہی ہتھکڑی پہنا دی اور پتہ نہیں آپ سے میں کبھی کبھی کیسی باتیں کرنے لگتی ہوں؟ میں تو نہیں بولتی سرجی میرا تجربہ بولتا ہے مجھ کو تو باتیں کرنے کا ڈھنگ ہی نہیں۔"

باغ میں شام آگئی بہار کی خوشبوؤں سے بوجھل شام۔

ہم دونوں نرگس جاتی کے شو در تھے۔ کوئی بات ہمیں اندر ہی اندر آگاہ کر رہی تھی کہ وہ رابطہ جو اتنی دیر ہمارا بھار اٹھائے رہا اب ٹوٹنے والا ہے لیکن اس شام ہم دونوں نے ایک دوسرے کو اچھی طرح پہچان لیا اسی لیے ہمیں بچھڑنے میں مشکل پیش نہ آئی۔ یہ ایک بات ہے کہ اس شام کے بعد ہم پھر نہیں ملے لیکن اگر ہم ملتے بھی رہتے ریڈیو سٹیشن میں سڑکوں پر بازاروں میں تو اس شام کے بعد ہر ملاقات اجنبیوں کی ملاقات ہوتی ہم ایسے ہی ملتے جیسے چیونٹیاں اپنے اپنے رزق کا دانہ منہ میں لیے راستے میں ایک دوسرے سے دعا سلام کرتی ہیں اور پھر اپنی اپنی راہ چلی جاتی ہیں نہ کوئی ماضی کی یاد نہ کسی فردا کا وعدہ۔

جب ہم دونوں باغ سے نکلے تو اجل نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "بس سر جی اب آپ جائیں۔"

"میں تمہیں گھر چھوڑ کر جاؤں گا۔"

"نہیں سر جی میں چلی جاؤں گی خود ہی۔"

"تمہیں

کہیں اور جانا ہے"

"ہاں جی۔"

"کہاں؟"

"بس پرے ہی سر جی بابا شاہ جمال کے۔"

"میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ"

وہ منہ پرے کر کے بولی "ناں سر جی میں ضعیف الاعتقاد عورت ہوں آپ اب گھر جائیں بڑی دیر ہوئی ہے پہلے ہی میں نے آپ کا بڑا وقت ضائع کر دیا ہے۔"

"وہاں کیا دعا مانگو گی اجل سچ سچ بتانا؟"

وہ ہونٹ چبا کر بولی "شاید وہی دعا مانگو شاید ہی دعا جو بابر ترت مراد کے مانگی تھی۔"

میں اس کی دعا بھول چکا تھا

"کون سی دعا؟"

"یہی سر جی زندگی تو کسی پیار کرنے والے کے سہارے گزری نہیں۔ اب موت تو کسی پیار کے ہاتھوں آئے موت تو حلال ہو میری۔"

وہ بغیر سدم دعا کے مڑ گئی اور جلدی جلدی سڑک کراس کرنے لگی میں نے اس کے پیچھے جانا چاہا لیکن پہلی بار مجھے اس سے خوف سا آ گیا۔

دوسری صبح میں سیر تک سویا رہا۔ خواب میں رات کو کئی مرتبہ میں نے ذبح کیے ہوئے مرغے، اونٹ اور بکرے دیکھے۔ رسی سے بندھے ہوئے جانور آسمان کی طرف منہ کرکے روتے نظر آئے کئی بار میں اتھا السر میں شدید جلن اور تکلیف تھی پچھلے دن کا سارا واقعہ تھامت میں تیزابی کیفیت تھی رات کو اٹھ کر میں نے ٹھنڈا پانی پینا چاہا تو مجھے یوں لگا جیسے نلکے سے فراٹے بھرتا تازہ لہو بہہ رہا ہے سناٹے اور اندھیرے کے باوجود سارے سانده کلاں سے کتوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اعصابی سکون کی گولیاں کھا کر بہت دیر میں سویا تو صبح خلاف معمول صولت بھابھی مجھے جگانے آ گئیں پہلے انہوں نے ٹیبل پر چائے کا ٹرے رکھا پھر کرسی سے ٹکرائیں اور اندر غسلخانے میں جا کر انہوں نے نلکا چھوڑ دیا۔ پھر اندر کھلنے والی سیڑھیوں پر کھڑی ہو کر مسعود اور فرید کو ڈانٹتی رہیں جمیں جاگ گیا تو وہ بغل میں اخبار دبائے چائے کے پاس کھڑی تھیں۔

"بڑی خراب ہے آج اخبار میں۔"

میں سمجھا ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ گئی۔

"کیا" میں نے حواس مجتمع کرکے سوال کیا۔

"کسی اچھل عزیز طوائف کو اس کے بیٹے نے قتل کر دیا کل رات۔"

میں ہڑبڑا کر اٹھا۔

"کون کیا کس کا قتل"

"ایک حرام کھانے والی کا اور کس کا۔"

بھابھی نے کچھ جواب نہ دیا اخبار میرے بستر پر پھینکا اور سیڑھیوں کی طرف چلی گئیں۔

اخبار میں اچھل کی پرانی تصویر چھپی تھی جس میں اس نے دو چوٹیاں کر رکھی تھیں

اس کے ساتھ اس کیپٹن کی تصویر تھی لڑکے کی شکل ماں سے مشابہ تھی وہی نتھنے وہی ہونٹ وہی آنکھیں جو کھٹکے کے اوپر جلی حروف میں رقم تھا مخبوط الحواس بیٹے نے غیرت میں آ کر ماں کو قتل کر دیا۔

مجھ میں ساری خبر پڑھنے کی ہمت نہ تھی میں نے اخبار تہہ کیا اور اسے عابدہ کے سیپر کے پاس جہاں کسی کا خوشبودار رومال بھی پڑا تھا رکھ دیا پھر میں نیچے گیا مجھے معلوم تھا کہ بھابھی بن کہے بغیر کسی سے پوچھے سارا معاملہ جانتی ہیں وہ باورچی خانے کے سامنے کھڑی اپنے دانتوں کو برش کر رہی تھیں۔

"بھابھی جی"

"جی۔"

"آپ میری شادی کا انتظام کریں۔"

بھابھی نے میری طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں

"لیکن ایک شرط ہے"

"وہ کیا"

"لڑکی باکرہ ہونی چاہئے"

"اچھا۔"

رات کے پچھلے پہر

موت کی آگاہی

جنگل سے ایسی آوازیں آ رہی تھی جیسے تنگ سرنگ میں بڑی تیز رفتار سے ہوا داخل ہو رہی ہو۔

ٹوں ٹوں گرو گرو حلقہ بہ حلقہ موج در موج بجانت کے پرندے سوکھے تال کے ارد گرد بڑے بڑے چھتنارے درختوں پر جمع تھے بڑے بڑے پنکھوں والے پرندے تال

کے پاس شامیانوں کی طرح تنے بیٹھے تھے اونچے اونچے ٹیلوں پر جھاڑیوں میں ڈالیوں میں گچھے دار بیلوں سے وفد الائے بیٹھے تھے الاسکا سے بھی چند پرندے سیاہ برقعے اوڑھے ہانپ رہے تھے رایو گرینڈ اور برازیل سے لمبی چونچ اور جھبرے پروں والے پرندے فیصلے کے انتظار میں تھے۔

سانپ بھی آج جرات کر کے باہر دو با گھاس میں چھپے بیٹھے تھے لیکن ان کی سائیں سائیں سے گھاس سرسرانے لگا تھا پرندوں میں بات کا چرچا تھا کہ دوسرے سب جگ کے آغاز سے پہلے ایک بار ایسا ہی اجلاس ہوا تھا لیکن اس کے بعد پرندوں کی برادری کبھی انبوہ در انبوہ اس طرح اکٹھی نہ ہوئی اس مرتبہ جب تبت کی سطح مرتفع پر پرندوں کا اکٹھ ہوا تھا تو پرندے انسان سے کلی طور پر مایوس ہو کر کسی اور سیارے میں ہجرت کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔تب متمدن دنیا پہلی بار تباہ ہوئی تھی انسان نے اپنی مکمل دیوانگی کا ثبوت دے کر اپنی ہی نسل کو دنیا سے مٹانے کی کوشش کی تھی نیویارک، ماسکو، پیرس، فرینک فرٹ لندن جیسے ہزاروں اور ان گنت شہر چشم زدن میں راکھ کا ڈھیر بن گئے تھے ساری دنیا پر غبار کا ایک گھومتا غلاف چڑھا تھا آتش فشاں پہاڑ اور انسانی تخلیق کا لاوا ہاتھ میں ہاتھ دیے ہر طرف بہتا تھا دور دور تک کسی براعظم پر سبزے کا نشان نہ تھا ملکوں ملکوں محشر بپا تھا تب سارے پرندے تبت کے مرتفع پر جمع ہوئے تھے اور یوں ہانپ رہے تھے جیسے دب دمے کے مریض ہوں۔

انسان تمدن کی آخری سیڑھی پر پہنچ کر قلابازی کھا گیا تھا اس نے اپنے ہی لوگوں کے لیے ایسے بم ایجاد کیے تھے جن سے نہ صرف انسان ہلاک ہوتا ہے بلکہ عورت کا رحم بچہ بنانے اور مرد کا عضو تناسل بیج بونے سے قاصر رہ جاتا ہے اس نے شہروں پر ایسے بم بو پھینکے کہ میٹھے پانیوں کے ایٹم پھٹ کر زہر میں تبدیل ہو گئے۔پھر جس نے اس پانی سے چکھا وہ اولین گھونٹ کے ساتھ جان بحق ہوا نسل انسانی کے اکا دکا پانی

کی تلاش میں ننگے بوچے سرگرداں ہوئے ان کی تلاش ایسی تھکا دینے والی تھی کہ قافلے کے لوگ ہر پڑاؤ پر گھٹتے گئے اور پڑاؤ کم ہوتے گئے۔ یہ دوسرے ست جگ کے آغاز کا ذکر ہے تب پرندوں نے تبت کی اونچائی پر بیٹھ کر سوچا تھا کہ آؤ یہاں سے پرواز کریں اور کسی ایسے سیارے میں چل کر گھر بنائیں جہاں انسان کی دیوانگی سے پناہ ملے وہ کئی روز تک مشیت ایزدی کے انتظار میں رہے اور ہجرت نہ کر سکے حتیٰ کہ ان کا صبر دیکھ کر اللہ کی رضا سے تمام برا عظموں پر پھر سے ہاتھی دوبا ڈگھاس اگ آئی۔ جنگل ہرے بھرے ہو گئے اور تال میٹھے پانیوں سے بھرنے لگے۔

اس وقت دوسری بار اس قدر تعداد میں پرندے، چرتھے اور چہ تھے مسئلہ پھر وہی درپیش تھا جنگل سے ایسی ہوک اٹھ رہی تھی جیسے زرد کھیتوں سے پھیکے چاند کی طرف تیتری کی آواز لپک رہی ہو پھر سیمرغ نے تین بار اپنے تن کی بتی بجھائی اور گویا ہو سرخاب تو غیر جانب دار ہے کھیتوں کھلیانوں کا نگہبان رزق کی خوشخبری دینے والا تجھے خدا کی قسم مختصر الفاظ میں بیان کر کہ اصل وجہ نزاع کیا ہے تا کہ جو نئے مہمان آئے ہیں اصل حالات سے واقف ہوں۔

سرخاب نے سارا ماجرا مختصر الفاظ میں بیان کیا تو نا کبیریا کی چیل ملکہ اٹھ کر بولی "آقا جو کچھ سرخاب نے کہا ہے درست ہے لیکن ہماری التجا ہے کہ اس بار انسان کا حوالہ درمیان میں نہ آئے وہ سیاں ہو یا نقال وہ آئینہ ہو کہ کاربن پیپر۔ اس میں گھٹنے بڑھنے کی صلاحیت چاند سے بھی بڑھ کر ہو ہم کو اس کی تہہ در تہہ سرشت سے کوئی سروکار نہیں ہم کو انسان سے کوئی غرض نہیں ہم جانوروں سے کیڑے مکوڑوں سے اس بحث کا پاک رکھنا چاہتے ہیں ہمیں جل باسیوں کا حوالہ نہ دیا جائے ہم ہواؤں کے مسافر ہیں اور ہمارا اپنے رب سے معاہدہ ہے کہ ہم صرف رزق حلال کھائیں گے اور سرشت کی حد کو پار کر گئی ہے اور حرام رزق کھانے لگی ہے اس کا سارا دیوانہ پن اسی

سے نکالا ہے پیشتر اس کے کہ یہ بھی ہوا باسیوں کو جنگل سے نیست و نابود کر دے اسے جنگل بدر کر دینا چاہیے۔"

گیدڑ نے نہایت ادب سے تین بار ماتھے کو دم سے چھوا اور بولا "شاید چھپکلی بو رہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ باوجودیکہ رزق حرام ہی سے راجہ گدھ میں دیوانگی کے آثار پیدا ہوئے ہیں لیکن مسئلہ دراصل سرشت کا ہے اگر راجہ گدھ کی سرشت میں حرام کھانا لکھا ہے تو پھر اس کے لیے حرام گناہ نہیں عین ثواب ہے لیکن گر اس نے اپنی عقل سے رزق حرام کھانا سیکھا ہے تو پھر یہ ضروری اس کے لہو پر ژند ز ہوگا اور دیوانگی پیدا کرے گا طے یہ کرنا ہے کہ کیا رزق حرام گدھ کی سرشت کا حصہ ہے کہ اس کی اپنی تجویز کا ردعمل۔"

اب چیونٹیوں کی ملکہ برافروختہ ہو کر اٹھی اور بولی دیکھو دوست گیدڑ ہم اللہ کی عطا کردہ سرشت سے جنگ نہیں کر رہے۔ اس جنگل میں جہاں ڈسنے والا سانپ رہتا ہے وہیں مٹی رنگا مینڈک بھی پھدکتا پھرتا ہے چنگھاڑنے والی شیرنی اور اس کے روغ سے بھاگنے والی نیل گائے

بھی یہیں رہتی ہے ہم جنگل والوں کا سادھوں سے کوئی بیر نہیں جو ہماری سرشت کا حصہ ہے کیونکہ ہم جانتے ہیں ہماری سرشت میں بدی کا عنصر ابلیس کی تخلیق نہیں روز ازل سے بنانے والے نے کسی مصلحت کے پیش نظر ہم میں کچھ ایسے وصف رکھے ہیں جو ہمیں تحفظ سے تو آشنا کرتے ہیں لیکن ظلم پر آمادہ نہیں کر سکتے جنگل میں کوئی سانپ سے نہیں لڑتا پھنکارنا ڈسنا اس کی سرشت ہے چیتے سے کسی کا بیر نہیں کیونکہ بنانے والے نے اسے اسی ڈھب سے بنایا ہے لیکن گدھ نے اپنی سرشت خود بدلی ہے پہلے یہ بھی شکار کرنے کو اپنی زندگی کا طرہ امتیاز سمجھتا تھا پھر اس نے اپنی عقل سے اپنی تجویز سے اپنی سرشت میں ترمیم کی اور حرام کھانے کا مرتکب ہوا یوں اعتراف کر ہم جنوں انسانوں فرشتوں، جانوروں پرندوں کی سرشت کے

خلاف نہیں اس رزق حرام کے خلاف ہیں جو اپنی عقل سے کھایا جاتا ہے جس کی منا ہی موجود ہوتی ہے اور جو زہر بن کر لہو میں پھرتا ہے اور دیوانگی باعث ہوتا ہے۔

ایک سانپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا "دیکھو یہ ہمارا ذکر ہے یہ موقعہ ہے صفائی کا کچھ کہہ گزرو۔"

سانپوں کے راجہ نے آہستہ سے جواب دے۔ "چپ رہو پہلے ہی ہم پر بہت بڑا الزام ہے کہ ہم نے اماں حوا کے ورغلایا ان کو سوشت سے زیادہ بدی پر آمادہ کیا۔ حالانکہ ان کے نفس نے انہیں دھوکا دیا ان کی سرشت میں تو پہلے سے سوچ کی دو شکلیں موجود تھیں اگر اب کی سرشت میں شروع سے دو راستے نہ ہوتے تو وہ میری بات کیونکہ مانتیں؟ چپ رہو اور یہاں آنے کا راز مت کھوو۔"

سرخ برادری کو مخاطب کیا اور کڑک کر بولا کیا یہ شان عبودیت کے خلاف نہیں کہ کوئی ذی روح اپنی عقل و تجویز سے اپنی سرشت میں نئے رنگ کا اضافہ کرے کائنات کی ہر چیز سے کوہی لے بیٹھے کے حکم سے پیار ہوئے اور کبھی سفر کے مرتکب نے ہوئے جانوروں کی ان کی جبلت کی پاسبانی رہنے کا حکم تھا سو وہ رہے۔

تو نے انسان کی نقالی کیوں کی؟ کیا یہ تیری کم عقلی نہ تھی کہ تو نے اپنی عقل سے رزق حرام کھایا؟۔

"تھی تھی" گدھے نے زمین پر سر رکھ کر کہا۔

میہو کی ٹولی بھاگنے والی تھی لیکن پاس ہی بیٹھے ہوئے مہر لاٹ نے ہمت دلائی اور کہا "ہم کم عقل ہیں آقا ہم کو تو سمجھ نہیں آئی کہ رزق حرام سے دیوانہ پن کیونکر پیدا ہے ہم سرشت کی بات تک کیونکر پہنچیں۔"

عقاب کی ٹولی سے ایک پاپائے روم اٹھا "سن مہر لاٹ! رزق دو طو کا ہوتا ہے ایک رزق وہ ہے جو جسم کا ایندھن ہے اور دوسرا رزق وہ ہے جو روح کی توانائی کا باعث بنتا ہے جیسے پانی خوراک حدت ہوا جسم کو پالنے کا وسیلہ ہیں اسی طرح

عبادت وعشق قربانی روح کی استقامت کی غذا ہیں۔ بتا گدھ جاتی کے راجہ کہ تو نے جسم کا رزق حرام کھایا کہ روح کا۔ بتا وہ رزق کون سا تھا جس سے تیرے جرثومہ ٹوٹ کر پاگل پن کا شکار ہوئے؟"

اب چیل ملکہ اٹھی اور چلا کر بولی "ان بیکار باتوں میں الجھنا تضیع اوقات ہے ذ فضل جج جانتا ہے کہ جسم کا رزق بالآخر روح کو لگتا ہے اور روح کا رزق آخر کار جسم کا حصہ ہو کر رہتا ہے رزق حرام چاہے بدنی ہو یا روحی دیوانہ پن کا باعث ہوتا ہے۔"

گیدڑ یہ بات سن کر بہت متاثر ہوا اور تالی بجا کر بولا "خوب چیل ملکہ یہ بات طے ہے کہ رزق چاہے بیرونی ہو یا اندرونی اگر حرام ہے تو ٹوٹ پھوٹ کا باعث بنتا ہے لیکن بات وہیں ہے کہ کیا گدھ اپنی شرکت کے خلاف رزق حرام کھاتا ہے۔"

مہر لاٹ نے پھر سوال کیا۔ "یہ کیا بحث ہے رزق حرام کا دیوانگی سے کیا تعلق؟"

شاہین بچے اٹھے اور خفگی سے بولے "کیا تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ پاک رزق سے لہو میں ایسی مثبت لہریں ہوتی ہیں جن سے روح میں کوئی مغایرت پیدا نہیں ہوتی۔ جس وقت حلال رزق پیٹ میں پہنچتا ہے تو انسان رب کی ثنا اور اس کے احکامات کا خود بخود پابند ہو جاتا ہے لیکن جب رزق حرام جسم کے اندر داخل ہوتا ہے تو منفی لہروں کا جال لہو میں پھیل جاتا ہے اور ہر جرثومہ کی زندگی منفی طور پر متاثر ہوتی ہے اور وہ وقت سے پہلے ٹوٹنے لگتا ہے۔ اس گدھ سے پوچھا جائے کہ یہ اس حقیقت سے واقف نہ تھا؟"

"تھا۔۔۔ تھا۔۔۔ تھا" راجہ گدھ چلایا۔

چیل برادری سے آواز آئی "لمبے بکھیڑوں میں پڑنے سے حاصل؟ ہم جانتے ہیں کہ گدھ پہلے طیب رزق کھاتا تھا پھر یہ اپنی عقل سے حرام کی طرف

راغب ہوا"

تیھو کی ٹولی سے ایک پرندہ بولا "آقا! ہم بحث کو الجھانا نہیں چاہتے صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ انسان نے اپنی سرشت کیونکر بدلی اور وہ رزق حرام کی طرف کیسے مڑ گیا؟۔"

تب ایک مریل سے تیغ بولی "ہم کو پتہ چلا ہے کہ انسان کی سرشت ٹھہرے ہوئے پانیوں کی مانند ہے جس میں ہر قسم کا عکس پڑتا ہے درختوں میں رہے تو درختوں جیسا پہاڑوں میں رہے تو پہاڑوں جیسا اٹل مضبوط، جانوروں میں بسیرا کرے تو ان ہی کی مانند حیوان اچھوں کی صحبت ملے تو فرشتہ رذیلوں کا رنگ چڑھے تو شیطان!"

نیلی چونچ والا ست رنگا پرندہ اچانک بولا "تو انسان سیال ہوا کبھی شیر سا بہادر کبھی اونٹ سا کینہ ور کبھی فاختہ کی طرح معصوم کبھی پتے کی طرح چکنا اور کبھی پھول جیسا گلرنگ لے یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی لے دے کے انسان تو ارد گرد کا پابند ہو گیا۔"

"انسان تلاش ہے وحدت کی کثرت میں تلاش۔" ایک طرف سے آواز آئی "نہیں صاحبو انسان تضاد ہے آگ پانی کے میل سے بنا ہے۔"

"آقا! انسان نہ رزق حرام کی وجہ سے دیوانہ ہوا ہے نہ اس حاقت کی وجہ سے جس کا ذکر نجد کی مینا نے کیا تھا بلکہ تضاد کے ہاتھوں دیوانہ ہوا ہے دن کے ساتھ رات ہے زندگی کے ساتھ موت شمال کے مخالف جنوب لیکن بیچارے انسان کے اندر ہر وقت نیکی بدی کی جنگ ہوتی رہتی ہے اگر اس کے اندر جنگ ساکت ہو گئی تو خدا ہار جائے گا۔"

یہ کفر کے کلمات سن کر سارے پرندے سناٹے میں آ گئے اور آواز کا تعاقب کرنے لگے۔

”بزدلوں کی طرح بات نہ کر سامنے آ۔“

ذ سفوریس کی جی سے آواز آئی۔

ایک چھوٹا سا کھٹ بڑھئی باہر نکلا اور زمین چوم کر بولا ”پہلے آقا انسان کی سرشت میں بدی نہ تھی۔ وہ بھی فرشتوں کی طرح نیک اور آئینے کی طرح پاک تھا لیکن یک روز ابلیس نے موقعہ پا کر اس میں جھانکا اس لمحے حضرت آدم کے مدر حق و باطل کی جنگ شروع ہوئی اگر اللہ اپنے اذن سے اس عکس کو نکال دیتا جو آدم کے دل میں پڑ چکا تھا تو بے انصاف کہلاتا اس لیے اس نے ابلیس کو مہلت دی اور نسان کو ترغیب دی کہ وہ اپنا آئینہ صاف کرے اس وقت سے آج تک حق باطل کی جنگ جاری ہے جنگ کا میدان ”انسان ہے اللہ کی کل کائنات میں صرف انسان ایس ہے جو اپنی سرشت بدلنے پر قادر ہے اپنے آئینے کو صاف کر سکتا ہے جیت اللہ کی ہوگی لیکن موقع ابلیس کر برابر کا فراہم کیا جائے گا آپ دیکھتے نہیں آقا اس جنگ کی وجہ سے انسان کی کیا حالت ہوئی اگر وہ دیوانہ ہے تو اس تضاد کے ہاتھوں فرزانہ ہے تو اسی تضاد کی وجہ سے سرخاب اٹھا اور مودب لہجے میں بولا ”آقا یہ بحث لمبی ہے انسان کی سرشت کو یا تو خدا سمجھتا ہے یا ابلیس انسان تو ابھی خود اپنی سرشت کو سمجھ نہیں پاتا تو جانتا ہے کہ انسان کا خمیر نیکی سے اٹھا ہے چور اچکا ڈاکو کو بدمعاش ساری عمر بدی کمائے ایک توبہ کے وضو سے اس کی بدی دھل سکتی ہے بدی اس کے آئینے میں فقط ابلیس کے عکس کی طرح رہتی ہے عکس ڈالنے والا نہ ہو تو آئینہ پاک رہتا ہے لیکن پھر یہ بات لمبی ہے۔“

اتنے میں ایک بوڑھا کوا اٹھا اور کہنے لگا ”میں انسانوں کے پاس رہا ہوں اور جانتا ہوں کہ ان کی دیوانگی کا ان کی سرشت بھی ایک ایک انسان کو خالق نے اس طور پر بنایا ہے کہ اس کا وجود تو ایک ہے لیکن اس کی روح، سانگی سرشت عقل قلب جانے کیا کیا کچھ کئی رنگ کے ہیں وہ کسی کے ساتھ شیر ہے کسی کے ساتھ بکری

کسی کے ساتھ سانپ بن کر رہتا ہے تو کسی کے لیے کینچوے دے بدتر ہے بدی ور نیکی روز ازل سے اس کے اندر دو پانیوں کی طرح رہتی ہے ساتھ ساتھ ملی جلی علیحدہ علیحدہ جیسے دل کے تیسرے خانے میں صاف اور گندہ لہو ساتھ ساتھ چلتا ہے وہ تو ہمیشہ ڈھلتا ہے ہمیشہ بدلتا ہے کہیں قیام نہیں کہیں قرار نہیں وہ ایک زندگی میں ایک وجود میں ایک عمر میں لاتعداد روحیں ان گنت تجربات اور بے حساب نشوونما کا حامل ہوتا ہے اس بے افراد مرتے ہیں انسان مسلسل رہتا ہے ہم جنگل والے سیدھے ہیں ہماری سرشت طے ہے ہم اس تہہ در تہہ کو نہیں سمجھ سکتے ہمیں انسان کے پرت کھولنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا وہ رزق حرام سے دیوانہ ہو کہ تضاد سے عشق لا حاصل ہے کہ تلاش بے سود ہے ہم جس کی سرشت کو نہیں سمجھ سکتے اس کی دیوانگی کا بھید ہم پر کیا کھلے گا بہتر ہے کہ ہم اس باب کو بند کر کے صرف راجہ گدھ کے مسئلے پر توجہ دیں۔"

اس وقت ایک مینا اٹھی اور بولی "انسان کے ساتھ میری پہچان بھی پرانی ہے گر تضیع اوقات نہ ہو تو کچھ عرض کروں۔"

چیل ٹولی سے نفی کی آوازیں اٹھیں لیکن سرخاب نے اجازت دے دی۔

مینا گویا ہوئی "میں جانتی ہوں آقا! انسان خود اپنی وحدت کی تلاش میں ہے اور وہ اپنی وحدت کو اس لیے تلاش نہیں کر سکتا کہ وہ ساری زندگی آرزوؤں کے جنگل میں سے گزرتا ہے آرزوؤں کے جنگل کی سرشت کا یہ عالم ہے جیسے ایک آئینہ ٹوٹ کر ہر ٹکڑے میں ایک ہی عکس دینے لگے جن انسان ایسے جنگل سے گزرتا ہے آقا تو باوجودیکہ ہر ٹکڑے میں اس کا اپنا عکس ہوتا ہے لیکن ہزارہا آئینے کے ٹکڑے اسے اپنے وحدت سے ملنے نہیں دیتے اس جنگل کا عجیب شعور ہے یہاں آرزو کی ناکامی ہو کہ آرزو کی بر آوری کثرت موجود رہتی ہے اسی کثرت کی وجہ سے انسان کبھی اپنی وحدت سے دوچار نہیں ہو سکتا۔

مجھے ایک واقعہ پیش آیا میں وہ بیان کرتی ہوں شاید انسان کی سرشت کا کچھ سراغ اس سے لگے آج سے دو ہزار سال پہلے سائپرس کے ملک میں ایک بادشاہ رہتا تھا وہ ہفت اقلیم کا مالک تھا صبح خیزی اس کی عادت تھی کجروم اپنے براق برق رفتار گھوڑے پر سوار ہوتا اور جنگل کے باسیوں کے ملنے چلا جاتا اسے جانوروں کی بولی سے شغف تھا دن کا وقت وہ راج پاٹ کے کاموں بسر کرتا لیکن دوپہر ڈھلتے ہی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر وہ پھر پہاڑوں میں نکل جاتا اور پہاڑوں سے گفتگو کرتا رہتا۔ دن ڈھلے گھر آتا تو تھکا ہارا ایک ایسے کمرے میں استراحت کرتا جس کی دیواریں چھت فرش تمام چھوٹے چھوٹے آئینوں سے مزین تھے۔"

وہ حسن میں اس قدر لاثانی تھا کہ آدھی رات کو میں نے اس کے بستر کے گرد ملائکہ کو طواف کرتے دیکھا ہے۔ اسے سحر آتا تھا آرزوؤں کی تکمیل کا سحر ادھر خواہش کا بیج اس کے دل میں پڑتا ادھر وہ اس سحر کی بدولت حصول آرزو میں کامیاب ہو جاتا۔

اس کے حرم میں دس ہزار پری جمال دوشیزائیں تھیں۔

اس کے خزانے بارہ سالوں میں بھی نہ دیکھے جا سکتے تھے۔

اسے آنے والے واقعات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا۔

وہ چہرے سے دل کا حال معلوم کرنے میں لاجواب تھا۔

اسے جڑی بوٹیوں کا مکمل علم حاصل تھا۔

لیکن رفتہ رفتہ اس نے اپنے برق رفتار گھوڑے پر سوار ہونا چھوڑ دیا اور سحر خیزی کی عادت ترک کر دی۔ پھر اس نے اپنے برق رفتار گھوڑے کو بھی ایک اصطبل کے حوالے کر دیا اور خود اپنے آئینے خانے میں اکیلا رہنے لگا۔ چونکہ میں آئینے خانے میں مثل قطب نما رہتی تھی اس لیے سارا سارا دن اسے ملول دیکھ کر میرا دل پھٹنے لگتا میں اسے دور دراز کے ملکوں میں ملنے والی خوبصورت دوشیزاؤں کے جمال کی باتیں

سناتی لیکن وہ کروٹ بدل کر کہتا "مجھ سے حسن ناپائیدار کی بات نہ کرنا مینا۔ کبھی تو نے ایسی عورت دیکھی جو بوڑھی نہ ہوئی۔؟"

میں اس سے دوسرے ملکوں کے عجائبات کی بات کرتی تو وہ کہتا "عجائبات وقتی کرشمہ ہیں ان کو مسلسل دیکھو تو عجائبات نہیں رہتے!"

رفتہ رفتہ وہ ہر طرح کے عیش سے متنفر رہنے لگا ہفتے میں ایک بار جو کی روٹی کھاتا قلیل الطعام، قلیل الکلام قلیل المنام اپنے پر ایسی پابندیوں کا شکنجہ کس لیا کہ اس کی رعایا کا مفلوک الحال فقیر بھی حالت میں اس سے بہتر ہو گیا۔

ایک رات جب پورا چاند چڑھا اور ہر آئینے میں بادشاہ کی صورت منعکس ہوئی۔ میں نے جرأت کر کے اس سے پوچھا "اے شاہ سچ سچ بتا تجھے کیا ہوا ہے؟"

کہنے لگا "اے مینا! میں اپنی رنگارنگی سے اکتا گیا ہو آرزو کی ناکامی ایک حجاب ہے لیکن آرزو کی بر آوری دوسری قسم کا ایک پردہ ہے میں اپنے میں دو راستے دیکھنا نہیں چاہتا میں اس قدر تنہا ہونا چاہتا ہوں کہ مجھ میں صرف ایک رنگ رہ جائے دیکھتی نہیں کہ میں نے ہر ذی روح کو چھوڑ دیا نباتات جمادات مجھ سے چھوٹ گئے میں نے ہری کی ساری پنیر اکھاڑ پھینکی تاکہ نیکی کا خاکستر رنگ میری ذات کو ایک رنگ میں رنگ دے میں اپنی تنہائی کی ایسی اکائی تلاش کر رہا ہوں جہاں بنانے والے کو مجھ پر ترس آ جائے اور پھر میری وحدت کی بیچارگی کو وہ اپنی وحدت میں سمو لے گا میں اپنی وحدت کی تلاش میں ہوں تاکہ اس کی وحدت کی پہچان سکوں جو ہمیشہ تنہا رہتا ہے اور جسے زوال نہیں۔"

دوسری صبح جب اس کا برق رفتار گھوڑا کھڑکی کے پاس آ کر ہنہنایا تو میری آنکھ کھلی وہ مر چکا تھا اس نے اپنے خنجر سے خودکشی کر لی تھی ہر آئینے میں ایک خنجر کا عکس تو موجود تھا لیکن کسی شیشے میں اس صاحب جمال کا عکس نہ تھا اس کی خودکشی خودکشی جو دیوانگی کی دوسری شکل ہے کیا اس کی سرشت کی وجہ سے نہ تھی۔ کیا اس دیوانگی

کا تعلق اس تلاش سے نہ تھا جو کثرت میں وحدت کی تلاش کرتی ہے؟۔

اس وقت چیونٹیوں کے ہراول دستے میں دھما کہ خیز شور ہوا۔

ایک بوڑھی لقوہ زدہ چیل نے اٹھ کر کہا ''آقا! ہم ان مباحثوں سے بددل ہو چکے ہیں جو گھوم پھر کر انسان کی سرشت کے گرد گھومتے ہیں تجھ کو اگر انصاف کرنا ہو تو کر ورنہ ہم چلے تمام گدھ جاتی منقار زیر پر بیٹھے تھے۔''

''بول راجہ گدھ کیا تجھ پر جو الزام لگا ہے درست ہے۔''

''الزام درست ہے لیکن میں خود نہیں جانتا کہ مجھ میں دیوانگی کے آثار پہلے پیدا ہوئے کہ میں نے رزق حرام کی طرف پہلے قدم اٹھایا پتہ نہیں مردار کھانے سے میری روح موث ہوئی کہ میری روح کو گھن لگ چکا تھا اس لیے میں نے رزق حرام کھایا؟۔''

چیل ملکہ چلائی ''ہم سے برسوں سے دیکھ رہے ہیں اس کا دیوانہ پن بڑھ رہا ہے تو ہمیں باتوں میں نہ بہلا ہم سب جانتے ہیں ایک دن یہ تمام پرندوں کو نیست و نابود کر دے گا۔''

گیدڑ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ صلح کے انداز میں پھرا کر کہا ''حضور! یہ بات طے کیجیے کہ کیا راجہ گدھ اپنی سرشت سے مجبور ہو کر رزق حرام کھاتا ہے کہ یہ اس کی اپنی اختراع ہے اپنی عقل کا کرشمہ۔؟''

''راجہ گدھ سے پوچھا جائے'' قاقنوس کی چیخ تین بار گونجی۔''

سرخاب نے راجہ گدھ کو مخاطب کر کے پوچھا ''کیا تو بتا سکتا ہے کہ اول تیری سرشت کیا تھی۔''

راجہ گدھ نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

''آقا! یہ اپنی اولین سرشت کو بھول چکا ہے!'' گیدڑ نے التجا کی۔

سرخاب نے سخت لہجے میں سوال کیا ''تو یہ بتا کیا تجھ میں انسان کی طرح

تضاد کا خمیر موجود ہے؟"

"نہیں ذی فضل سرخاب نہیں۔"

"کیا عشق لاحاصل کے آب حیات سے تجھے گوندھا گیا۔"

"نہیں بڑی شان والے میری سرشت میں عشق کا عرفان شامل نہیں۔"

"تو کیا تو تھکا دینے والی جستجو کا حامل ہے؟ کیا تیری سرشت میں ایسی تلاش ہے جو زمان و مکان سے پرے کھینچتی ہے ایسی تلاش جو کثرت میں وحدت کی متلاشی رہتی ہے۔"

"کیا تو بے نشان منزلوں کی تلاش میں دیوانہ ہوا؟۔"

"نہیں کھلیانوں کے پاسبان ایسا نہیں۔ میری سرشت کو تلاش سے کوئی سروکار نہیں۔"

"پھر یہ بات طے ہے کہ تو مردار کھانے کے باعث دیوانہ گردانا گیا؟۔"

"شاید۔"

ذی سفورس کی باطنی روشنی تین بار گل ہوئی اور سیمرغ کی گرجدار آواز آئی "راجہ گدھ الزام تجھ پر ثابت ہوا ہی چاہتا ہے تجھے اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہو تو کہہ۔"

گدھ مردار کھاتے ہیں

وہ جانے زیست کے کس موڑ پر رزق حرام سے شناسا ہو چکے تھے۔

ان کی اڑانیں شاہین سے بھی زیادہ تھکا دینے والی تھیں۔ گیدڑ نے تالی بجا کر کہا

"اس کی صفائی میں جو کچھ کہوں گا میں کہوں گا آقا!"

لیکن گدھ نے اپنی گردن زمین پر رکھ کر عرض کی "نہیں اپنی صفائی میں جو کہوں گا میں خود کہوں گا۔"

سرخاب نے زور سے سانس لے کر کہا "دیکھ راجہ گدھ الزام کی نوعیت بدل چکی ہے اگر تو نے کوئی تشفی آمیز جواب دے سکا بری الذمہ ہو جائے گا اگر تیرے

جواب سے حاضرین کی تسلی نہ ہو سکی تو تجھے جنگل بدر کا حکم سننا ہوگا۔

بتا بول کیا تو نے اپنے ماحول سے خائف ہو کر اپنے آپ کو بدلا کیا تو نے انسان کی تقلید میں اپنی سرشت بدلی؟ کیا وجہ تھی کہ تو نے اللہ کی دی ہوئی سرشت پر قانع نہ رہا اور مردار کھانے پر مجبور ہوا؟۔"

گیدڑ نے راجہ گدھ کو سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ آنکھیں بند کر کے گویا ہوا

"آقا میں بھی تمام پرندوں کی طرح یکسر معصوم تھا اور اپنی سرشت بھر نیکی اور بدی کے سہارے زندگی بسر کر رہا تھا۔ میرے اندر اپنے متعلق کوئی شبہ موجود تھا نہ اپنے گردوپیش کے متعلق کوئی تجسس لیکن جس درخت پر بیٹھ کر میں شکار کے لیے نگاہیں دوڑایا کرتا اس کے نیچے ایک جوگی نے آ کر بسیرا کر لیا اس کے تن پر بھبھوت کے علاوہ کوئی لباس نہ تھا رفتہ رفتہ اس کی ڈاڑھی اس قدر لمبی ہو گئی کہ وہ برگد کی جڑوں میں بیٹھا درخت کا ایک حصہ نظر آنے لگا ۔۔۔وہ سارا دن نگاہیں آسمان پر جمائے دیکھتا رہتا میں اس کی شخصیت سے اس درجہ مغلوب ہوا کہ میں نے اپنی تھکا دینے والی اڑانیں ترک کر دیں اور پہروں اسے دیکھنے کا کسب اختیار کیا

ایک روز اس نے مجھے نیچے اترنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں بغیر آواز کے آپس میں باتیں کرنے لگے اب ہمارا معمول ہو گیا کہ ہم دونوں روز کچھ دیر کے لیے یکجا ہوتے ۔وہ مجھے زندگی کے کئی بھید بتاتا اور میں اسے جنگل کی زندگی کے راز سمجھاتا وہ آرزو کے جنگل سے نکل تو آیا تھا لیکن تمام آرزوؤں سے چھٹکارا پا لینے کے بعد اب وہ ابدیت کے خواب دیکھنے لگا تھا وہ خدا کی طرح مستقل ہونا چاہتا تھا ہر صبح جب موت اپنے ترشول لے کر آتی اور برگد کے درخت کے سامنے ترشول پر اپنا سرخ ہاتھ رکھ کر پوچھتی چلتا ہے کل آؤ تو جوگی ہنسنے لگتا اور کہتا جا اپنا کام کر تو مجھے کیا مارے گی۔"

جب موت بہت اصرار کرتی تو جوگی کہتا جسم لے جاتی ہے تو لے جا!

موت کچھ اور تقاضے کرتی۔

میں اس کی یہ جنگ روز دیکھتا۔

رفتہ رفتہ موت کے آنے پر جوگی چھپنے لگا۔ جب وہ چلی جاتی تو جوگی مجھے بلاتا۔ ہم دونوں بغیر آواز نکالے گھنٹوں باتیں کرتے۔ ان باتوں میں وہ مجھ سے ہر روز ایک بات ضرور کہتا کہ اس کی روح ہمیشہ رہے گی سو اس کی روح نہیں لے جاسکتی۔

یک روز صبح کے وقت جب سورج ابھی اچھی طرح دریا سے اشنان کر کے نہ نکلا تھا جوگی برگد کے سر خت سے لٹکا ہوا تھا اس نے برگد کی لٹکتی جڑ سے پھندا لے کر جان موت کے سپرد کر دی تھی۔ میں اونچی شاخوں سے اترا اور میں نے اسے اس گرہ سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ میری چونچ اور پنجے گرہ کھولنے میں مصروف تھے جب اس کے لہو کی پتلی سی دھار میرے حلق میں داخل ہوئی۔

آدم زاد کا لہو!

"جوگی درخت سے اپنے بوجھ سمیت زمین پر جا گرا ایسے کہ میری چونچ اس کی گردن میں پیوست تھی اس وقت میری سرشت بدل آقا! سوائے انسان کے کوئی موت سے خائف نہیں پہلی بار میں موت سے ڈرا اس روز کے بعد میں اونچے درختوں پر موت سے چھپ کر رہتا ہوں لیکن موت سے میرا رشتہ کچھ ایسے منسلک ہوگیا ہے کہ میرے جسم میں تمام لہو دار جسم سے بنتا ہے میں موت کا دشمن اور موت ہی کا پروردہ ہوں۔"

"پھر؟ پھر؟" سارا جنگل گونجا۔

"اس واقعے کے بعد میری آنے والی نسلیں حرام کھانے لگیں میں دریائے نیل کے شمال میں آباد ہوگیا۔ مجھ سے پیدا ہونے والوں میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جس میں ایک بھی زندہ باقی نہ رہا۔ وحشتے بھوک کو انہوں نے شعوری طور پر زندگیسے نکال

دیا۔ اس علاقے میں اڑنے والی مادہ گدھ جب بچہ پیدا کرنا چاہتی تھی تو ہوا میں دور تک اڑتی اڑتی اڑان میں واپس لوٹتے وقت خود بخود اس کا رحم کھل جاتا ور وہ ہوا سے ایسے بار آور ہوتی جیسے درخت پودے ہوا سے پولن لے کر بار آور ہوتے ہیں ہماری سرشت میں اس کے بعد تبدیلیاں آتی رہیں کچھ کا علم رہا کچھ تبدیلیوں کو ہم نے اپنی ازلی سرشت کا حصہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ حتیٰ کہ ہم پر دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔ ہم اب موت سے گریزاں لیکن موت ہی کی تلاش میں رہتے ہیں مردہ جانوروں سے زندگی کی حدت حاصل کرتے ہیں چرند پرند کوئی موت سے آگاہ نہیں صرف انسان موت سے خائف رہتا ہے موت! اس کے بے ایک حقیقت ہے آقا بچپن میں وہ باقی ذی روح کی طرح موت سے آشنا نہیں ہوتا لیکن جوں جوں وقت گزرتا ہے اور اس میں شعور پیدا ہوتا ہے وہ موت سے شناسا ہونے لگتا ہے پہلے چھوٹی چھوٹی حقیقتیں کھلتی ہیں ناپائیداری بے ثباتی تبدیلی موسم بدلتا ہے تو وہ اندر ہی اندر ڈرتا ہے بچپن گزرتا ہے تو وہ غیر شعوری طور پر بےچین رہتا ہے محبوب کا رنگ روپ گہنا جائے تو وہ تلملاتا ہے یہ تبدیلی ناپائیداری یہ احساس زیاں یہ سب چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں ہیں جو ایک منظر کی طرف کھلتی ہیں موت کا گھپ اندھیرا فنا کی آخری منزل جانور پرندے سب آزاد ہیں اس آزار سے لیکن انسان اور میری جاتی کے لوگ صدیوں سے دیوانے ہیں آقا صدیوں سے اور اسی آگاہی کی وجہ سے انسان دیوانہ ہے وہ چھوٹی سی ناپائیدار زندگی میں ہمیشہ کی بقا چاہتا ہے کیا اس احساس کے ساتھ کوئی دیوانے پن سے بچ سکتا ہے"

سارے میں خاموشی چھا گئی۔

گیدڑ نے دل ہلائی اور تحقر سے بولا "آقا! اب بات واضح ہے موت کا احساس انسان اور گدھ کی سرشت کا حصہ ہے جو فیصلے رب اور اس کی مخلوق کے

درمیان ہوں ان فیصلوں پر ہم قادر نہیں موت سے آگاہی کا مسئلہ گدھ اور اس کے رب کے درمیان ہے ہم کو اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہیے۔ کون جانے اصلی مسئلہ کیا ہے۔"

"لیکن یہ آگاہی یہ احساس اولاد اس کی سرشت میں نہ تھا۔؟"

راجہ گدھ نے پرنام کے انداز میں پر جوڑے اور بولے "چیل جاتی کی ملکہ دیکھ تو اپنے آپ کو شانت رکھ! اور میرے رب اور اس کی بنائی ہوئی سرشت کو سمجھنے کی کوشش نہ کر ہم تو خود ہجرت کرنے والوں میں ہیں ہمارے بے قیام ورسفر میں فرق نہیں لیکن جانے سے پہلے ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔"

گیدڑ نے اونچے اونچے رو کر کہا "یہ تو کیا کر رہا ہے راجہ گدھ۔!"

راجہ گدھ نے نظریں جھکا کر جواب دیا "آقا! ہم جارہے ہیں ہرے بھرے جنگلوں کو چھوڑ کر اجڑے بنجر علاقوں کی طرف لیکن ایک غلط فہمی میں مت رہنا دیوانگی دو طور کی ہوتی ہے ایک دیوانہ پن وہ ہوتا ہے جس کی مختلف وجوہات یہاں بیان کی گئیں جن کی وجہ سے حواس مختل ہو جاتے ہیں اور انسان کائنات کی ارذل ترین مخلوق بن جاتا ہے لیکن ایک دیوانگی وہ بھی ہے جو انسان کو ارفع واعلٰے بلندیوں کی طرف یوں کھینچتی ہے جیسے آندھی میں تنکا اوپر اٹھتا ہے پھر وہ عام لوگوں سے کٹتا جاتا ہے دیکھنے والے اسے دیوانہ سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اوپر اوپر اور اوپر چلتا جاتا ہے حتیٰ کہ عرفان کی آخری منزلیں طے کرتا ہے عام لوگ اسے بھی پاگل سمجھتے ہیں لیکن انسان جب بھی ترقی کرتا ہے پاگل ہوتا ہے اس وقت وہ ایسے زہر آگیں بم بنا رہا ہے جن سے یہ کرہ زمین تباہ ہو سکتی ہے یہ اس کے دیوانے پن کی دلیل ہے لیکن جب اس کرہ ارض کو بچانے کی ضرورت آئے گی۔ تب بھی ایک مقدس دیوانے آئے گا کاش ملکہ چیل کو میرے دیوانے پن پر اس قدر اعتراض نہ ہوتا تو ہم بزرگوں کے لیے نئی سمتیں

نئے دروازے   نئی جہتیں کھول دیتے ہمارا دیوانہ بھی عرفان کی ایک شکل ہے

"

راجہ گدھ نے اپنی برادری کا حکم دیا اور وہ چپ چاپ پرے باندھ کر جنگل سے نکل گئے۔ آہستہ آہستہ تمام پرندے جنگل سے کھسکنے لگے۔ برگد کے درخت میں روشنی نہ رہی صرف دیر تک چیل برادری کے لوگ چپ چاپ تال میں بیٹھے رہے اور ہاتھی ڈوبڈو گھاس سے سانپوں کی سائیں سائیں فیڈ بیک ہوتی رہی۔

☆☆☆☆☆

بظاہر آفتاب کی موت کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ لیکن دفتری کام کرنے کی   اہلیت اچانک مجھ میں نہ رہی اور میں نے دفتر سے چھٹی لے لی۔ ادھر بھی صولت میرے بے رُخی تلاش کرنے میں مصروف تھیں ادھر میں کمرے اور کوٹھے کی چھت پر گھومتا رہتا بے مصرف بے ارادہ جاگتے میں سونا اور سوتے وقت چوکس رہنا میرا معمول ہوگیا۔ پہلے مجھے انہماک سے کتابیں پڑھنے کی عادت تھی اب مطالعہ عبث خیالات کے ہیر پھیر کا باعث ہوتا پہلے میں نے کئی ناول شروع کیے لیکن تعجیل کی وجہ سے میں آخری صفحے پہلے پڑھ لیتا، پھر باقی ناول پڑھنے میں لطف باقی نہ رہتا۔ سیاست، سوشیالوجی اور سائیکالوجی کی کتابیں دل چسپ تھیں لیکن ان کے مطالعے میں دماغی توجہ کو دوڑنے پھرنے کی مہلت نہ ملتی۔ ایک ایک جملہ کئی کئی بار پڑھنا پڑتا پھر کچھ عرصہ میں نے جاسوسی کہانیوں سائنس فکشن پر بسر کیا۔ ان کی طلسماتی فضا بھی موافق نہ آئی جنس اور شادی سے محبت کے متعلق کتابوں سے بازار بھرے پڑے تھے۔ ان کتابوں میں وہی بات بار بار دہرائی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے دو چار کتابوں کے بعد دلچسپی کا گراف گرنے لگتا۔ سفرنامے اور یادداشتیں وقت گٹی کا باعث ہوتیں اگر میں موجودہ سستا مطالعے میں جو سب سے بڑی مشکل درپیش تھی وہ یہی تھی کہ کاغذ کی سطح پر الفاظ کے ساتھ ساتھ واقعات، چہرے، کیفیات، باتیں حتیٰ

کہ خوشبوئیں بھی تیرنے لگتیں دماغ کہیں کا کہیں بھٹک جاتا اور ایک ایک صفحہ کئی کئی گھنٹوں میں ختم ہوتا۔ کتابوں کی پناہ جب تمام وجود کو مرکز پر لانے سے قاصر رہتی تو میں اٹھ کر باہر شہ نشین پر جا بیٹھتا کبھی کبھی آسمان کو تکتے مجھے آدھی رات ہو جاتی چاند راتوں میں مجھے لگتا جیسے میں نقل مہتاب کے ساتھ اوپر کی طرف اٹھ رہا ہوں بالکل سمندر کی بہروں جیسی بیتابی مجھ میں پیدا ہوا جاتی۔ چاند کی روشنی میرے وجود میں شبنم کی طرح اترتی اور میں محسوس کرتا کہ میرا جسم پتھر کی طرح ٹھنڈا رہنے لگا ہے ایسے میں بار بار میں اپنے ہاتھ پاؤں دیکھتا اس روشنی میں مجھے اپنے جسم پر قلعی کیے ہوئے برتن کا شبہ ہوتا۔ میری آرزو ہوتی کہ میں کسی سارس کی طرح پہروں ایک ہی ٹانگ پر کھڑا رہوں چپ چاپ!

جسمانی طور پر بھی میں نارمل نہ تھا سارا منہ کڑوا رہتا اور زبان پر کتھئی رنگ کا لیپ چڑھا نظر آتا۔ دن کے وقت میں ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد کچھ نہ کچھ کھانے کی کوشش کرتا۔ لیکن سہ پہر کے قریب ایک غبار سا دماغ کو چڑھنے لگتا جیسے معدے میں جلن شروع ہوتی پھر جلن کا غبار بن کر سینے میں اوپر کی طرف اٹھنے لگتا۔ مجھے محسوس ہوتا کہ تھوڑی دیر بعد میرا دل بند ہو جائے گا کئی گولیاں اور مکسچر میرے پاس جمع ہو گئے تھے اصلی دورہ رات کو ایک اور تین کے درمیانی وقفہ میں شروع ہوتا اس وقت میرے ہاتھ پاؤں میں پہلے چیونٹیاں سی چلتیں بعد میں سارے جسم پر رعشہ طاری ہو جاتا اس لرزے کی وجہ سے میں خوف زدہ رہتا دن کے وقت بھی مجھے اس لرزے کا خوف متوحش کرنے کو کافی تھا میرے آنکھیں اندر کو دھنس گئی تھیں اور کان باہر کو نکلے ہوئے دکھائی پڑتے۔ ہونٹوں کو دیکھتے رہنا میرا محبوب مشغلہ تھا ان کا کھردرا پن بیت ناخن ہاتھوں کی لکیریں میری دلچسپی کا باعث تھیں اسی کی تکلیف کے باعث میں بار بار ڈاکٹر سے ملتا ایک ڈاکٹر تسلی بخش ثابت نہ ہوتا تو پھر کسی اور ماہر کے پاس منتقل ہو جاتا حالانکہ میرے اندر غالباً یہ آرزو

تھی کہیں میں ٹھیک نہ ہو جاؤں میں withdrawal اور anxiety کی وجہ سے کبھی دوست نہ بنا سکا کالج کے دوست تو چھوٹ ہی چکے تھے اب ریڈیو سٹیشن سے بھی کوئی ملنے آ جاتا تو میں یہ بہانا بنا دیتا کہ میں گھر پر نہیں ہوں میں اندر سے یوں بنج ہو چکا تھا جیسے کنوئیں میں اگے ہوئے خودرو پودے

اول تو میں ساری رات جاگ کر گزارنے کا خواہش مند رہتا۔ لیکن اگر ڈاکٹر کی دی ہوئی خواب آور دوائیوں سے نیند آ جاتی تو اچانک پسینے میں شرابور آدھی رات کو آنکھ کھل جاتی جونہی آنکھ کھلتی مجھے محسوس ہوتا جیسے کمرے میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی زیادتی ہے اور میں آسنو گیس کے مرض میں مبتلا ہوں ایسے میں میرے پھیپھڑے شدید گھٹن محسوس کرتے لیکن مجھے کھانسی نہ آتی فقط حلق کا پردہ بند ہونے لگتا میرا منہ ایسے سوکھ جاتا جیسے میں صحرائے گوبی میں سفر کر رہا ہوں ہڑبڑا کر میں بستر چھوڑ دیتا گرمیوں کا آغاز تھا نلکے کے نیچے سر رکھ کر میں پانی کھول دیتا۔ جب ٹھنڈے پانی کی جھڑ سے کچھ افاقہ ہوتا تو پھر میں باہر کوٹھے پر جا کر شہ نشین پر جا بیٹھتا یہاں بھیگے سر کی وجہ سے ایک بار پھر بھرا کر تھرتھری چھوٹ جاتی ایسا لرزہ طاری ہوتا کہ پاؤں کے انگوٹھے تک کانپتے نظر آتے کبھی کبھی میرا جی چاہتا کہ میں نیچے جا کر صولت بھابی سے اپنی حالت کہوں اور پھر ان کے گلے لگ کر اونچے اونچے رونے لگوں لیکن بھابی صولت اور بھائی مختار گدڑی کا غز میں لپٹے رہتے تھے ایسے کہ نظر تو آتے لیکن ان تک رسائی نہ ہو سکتی۔

نیند کا وقفہ گو کم تھا لیکن ان میں آنے والے خواب لاتعداد تھے۔ خوابوں میں نہ کبھی سیمی نظر آتی نہ عابدہ نہ امتل بلکہ ایسی انجانی لڑکیاں جو کبھی کبھار ریڈیو سٹیشن پر نظر آتی تھیں جب بھی کوئی لڑکی مجھے خواب میں دکھائی دی اس کا دامن ہمیشہ پھٹا ہوا ہوتا جیسے ہاتھ ڈال کر مچھلی کے گلپھڑے نکال لیے جائیں ایسے ہی لڑکی کی زبان دانتوں کے اندر سے نظر آتی بے آباد ریگستان اور ریگستانوں میں گھومنے وال

چھوٹا سا خرگوش بمباری سے تباہ شہر اور شہر میں بجنے والا اکلوتا سائرن اندھے کنویں میں مصلوب کتا بنجر زمین میں مری ہوئی وہیل مچھلی بغیر پائیلٹ کے اڑنے والا جہاز پانیوں کے بغیر کھڑی ہوئی نہریں انسانی ڈھانچے قبروں کے اندر اور باہر ٹن ٹن ٹوٹنے والے برتن اور ان سب خوابوں میں ہر جگہ خالی براؤن گدھ چپ چاپ دم سادھے شانت پرانت ٹولی در ٹولی ہجرت کرتے ہوئے جنگل سے کوچ کرتے ہوئے۔

جاگنے کا سماں سونے کے وقت سے بھی نرالا تھا۔

صبح شیو کرتے وقت مجھے اپنی شکل یوں نظر آتی جیسے روشنی کی سفید کرن لطیف منشوری میں سے نکل کر سر رنگوں میں بدل جاتی ہے سادہ شیشے میں میری شکل کئی چکلوں میں منتقل ہو جاتی کسی عکس میں مونچھ غائب ہوتی۔ کسی حصے میں ببر بادشاہ جیسی ڈاڑھی نظر آتی کبھی کبھی اوپر والے ہونٹ پر لپ سٹک لیپ ہوتا۔ ناک میں چھوٹی سی نتھنی ہوتی کبھی کسی چہرے کی آنکھیں غائب ہوتیں آئینے میں نظر آنے والی صورتوں سے میں خوفزدہ ہو جاتا۔ پھر میں الماری کھول کر اندر دیکھا مجھے یقین تھا کہ الماری میں ٹرنک کے اندر گدے کے نیچے مجھ سے مشابہ کئی بونے رہتے ہیں اور کسی دن مجھے اکیلا پا کر وہ مجھ پر اچانک حملہ آور ہو جائیں گے۔

چونکہ میرا دن زیادہ تر گھر پر گزرتا اس لیے لوگوں سے ملاقات نہ ہو سکتی۔ اسی دوران ایک دو خط ڈاکٹر سہیل کے آئے۔ وہ امریکہ میں دھڑا دھڑ تجربات علمی وسعت اور مغربی کلچر سیکھ رہا تھا۔ اس کے ایک خط میں درج تھا کہ وہ ایک ٹاپ سس ہار پر گیا۔ لیکن ایسی جگہیں اتنی ہلا دینے والی ہوتیں ہیں کہ دوبارہ جانے کی ہمت نہیں ہوئی مجھے وہاں کا کلچر اور اپنے کلچر کے تقابل: میں کوئی دلچسپی نہ تھی امریکہ خلاقی طور پر تنزل کی طرف راغب تھا کہ سائنسی اعتبار سے عروج کی جانب مجھے کسی ملک کسی مذہب کسی انسان کے عروج اور زوال کی پروا نہ تھی میں نے پہلے

پروفیسر سہیل کو خط لکھتے چاہے لیکن اب میں سہیل کے مشورہ سے آگے نکل گیا تھا۔ افضل کے مرنے کے تیسرے روز بعد مجھے آفتاب کا خط بھی ملا لیکن چونکہ اس میں کوئی پتہ نہیں تھا اس لیے میں جواب دینے کے فرض سے آزاد ہو گیا۔ ہاں یہ بات اس میں قابل ذکر تھی۔

"میرا خیال تھا تم سیمی کے بہت قریب ہو لیکن سیمی کے بعد تم نے بھی مجھے خط نہیں لکھا کیا بات ہے کیا وطن میں کسی کو بھی پروا نہ تھی وہ کیسے مری؟ کیوں مری تمہیں تو معلوم ہو گا؟۔"

کئی دن میں یہی خط پڑھتا رہا میں نے خواب بھی لکھ پھر مجھے محسوس ہوا جیسے آفتاب نے جان بوجھ کر مجھے ایڈریس نہیں لکھا۔ وہ میرے خط کا منتظر نہ تھا۔ شاید اسے سیمی کے متعلق درست انفرمیشن بھی درکار نہ تھی۔

تنہائی بیماری، غم خوری اور بے اعتدال عادتوں کے باعث میں جلد کسی ہسپتال میں پہنچ جاتا اگر بھابھی صولت میرے لیے ایک لڑکی تلاش نہ کر لیتی۔ اس روز اچانک آسمان ابر آلود ہو گیا۔ سارے آسمان پر بھاری پستانوں کی شکل کے گول گول بادل چھائے تھے آسمان مائیکل انجیلو کی بنائی ہوئی تصویر نظر آتا تھا۔

میں چہ نشین پر بیٹھا تعجب سے آسمان کے ان ہی بادلوں میں حلول کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب بھابھی صولت اوپر آئیں وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر رک گئیں۔

"قیوم!۔"

"جی۔؟۔"

"اوپر کیا دیکھ رہے ہو۔"

"بادل دیکھ رہا تھا۔" میں نے نظریں جھکا کر کہا

"تمہارے لیے میں نے لڑکی تلاش کر لی ہے۔"

"میں عابدہ کی بہن سے شادی نہیں کروں گا۔"

"نہیں بھئی   وہ نہیں یہ اور   ہے۔"

وہ شہ نشین پر پہلی مرتبہ میرے قریب بیٹھ گئیں   "ستاروں نے بھی اسے بے نقاب نہیں دیکھا صوم وصلوٰۃ کی پابند   سلائی کڑھائی اچھی   کھانا پکانا جانتی ہے بڑے اچھے لوگ ہیں۔"

"آپ تسلی کرلیں۔"

"بالکل ہاں کرو ہاں عصمت لڑکی ہے جیسی تمہیں درکار ہے بالکل ویسی۔"

پہلی مرتبہ میں نے جرأت کر کے پوچھا   آپ کو کیا معلوم ہے کہ مجھے کیسی لڑکی چاہیے۔

بھابھی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا   "مجھے معلوم ہے ناں   تم چاہتے ہو کہ   کہ تمہیں ایسی لڑکی ملے جو پہلی نظر میں تمہاری ہو جائے۔ ہے نا؟"

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"جی ایسی   کہاں   !"

"بس وہ ڈبے میں پیک ہے پوری طرح   تم ہی اس کا کارٹن کھولو گے پہلی بار۔"

میں چپ ہو گیا۔

"کوئی فکر نہ کرو قیوم وہ خوبصورت بھی بہت ہے۔ پڑھی لکھی تو خیر زیادہ نہیں لیکن خوبصورت بہت ہے۔"

مجھے سر دست لڑکی میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میں نے نگاہیں آسمان پر جمالیں وہاں بڑے بڑے مرور پستانوں جیسے بادل ساکت کھڑے تھے مجھے یوں لگا جیسے ابھی ان میں سے دودھ برسنے لگے گا۔

"مجھے افسوس ہے۔"

''کس بات کا بھابھی؟''

''ہر بات کا   اماں جی کی موت کا   ابا جی کے پاگل پن کا   اور   اور

''

ہم دونوں نے ایک دوسرے سے منہ پھیر لیا اور وہ چپ چاپ نیچے چلی گئی۔ میری نظروں میں چندرا گھوم گیا۔

ہمارے گاؤں کو مکمل طور پر کلئر کیا گیا تھا۔ آخری بار جب بھائی مختار ابا سے ملنے گئے تو انہوں نے مجھے بھی ساتھ چلنے کو کہا   لیکن میں آخری بار ابا سے مل چکا تھا مجھے معلوم تھا کہ وہ حویلی چھوڑ کر کبھی لاہور نہیں آئے گا پھر بھی میرے اندر ہی اندر کہیں آرزو تھی کہ ابا لاہور آ جائے مجھے وہ ماں کی آخری نشانی لگتا تھا۔ میں بھائی مختار کی آمدورفت میں قطعی کوئی دلچسپی نہیں لیتا۔ لیکن جس روز انہیں شیخوپورہ سے واپس آنا تھا میں ایک موہوم امید کے ساتھ ریلوے سٹیشن پر پہنچا۔ وہ گاڑی سے اترے ابا ان کے ساتھ نہیں تھا مجھے سٹیشن پر پا کر لحہ بھر کے لیے ان کی آنکھوں میں حیرانی آئی اور پھر انہوں نے مجھے بیگ ایسے پکڑا دیا جیسے انہوں اسٹیشن پر لینے جانا میرا معمول ہی ہو۔

ہم دونوں چپ چاپ ٹیکسی میں بیٹھ گئے مجھے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ تھی وہ کچھ بھی بتانے پر رضامند نہ تھے سارا راستہ میں شیشے سے باہر دیکھتا رہا اور وہ سیٹ کی پشت سے سر لگائے آنکھیں بند کیے اصل موضوع سے گریزاں رہے جب ہم دونوں کرشن نگر کی حدود سے آگے کھیتوں کھلیانوں والے حصہ میں پہنچے تو میں نے ڈرتے ڈرتے بھائی مختار پر نظر ڈالی۔

''گاؤں کیسا تھا؟''

انہوں نے بغیر آنکھیں کھولے کہا   ''اب گاؤں کہاں؟ لوگ سب چلے گئے ڈھور ڈنگر مر کھپ گئے۔ مکان تقریباً گر گئے کنوئیں تال سب کھاری پانی سے بھر گئے

گاؤں اب کہاں؟"

"اور ابا؟"

مختار بھائی چپ ہو گئے۔

"ابا کو ساتھ نہیں لائے آپ۔"

"وہ نہیں آ سکتا اب۔"

"کیوں؟" میرا دل دھڑکنے لگا۔

پہلی بار بھائی مختار نے اتنی لمبی بات کی "جس روز میں رات کو پہنچا ہوں وہ اوپر والے چوبارے پر کھڑا تھا۔ میں بھی اوپر چلا گیا اس نے مجھے پہچانا نہیں میں پاس گیا سلام کیا — ابا بولا — چلو میں تیار ہوں اتنی دیر کیوں لگائی میں تو ہر روز تمہاری راہ دیکھتا تھا پھر ابا اتنی تیزی سے نیچے اترا کہ میں حیران رہ گیا چھو سیڑھیوں سے اتر کر اس نے کہا اب کل چلیں گے ابا آج تو نہیں جا سکتے نا اس کل شیخوپورہ سے روانہ ہوں گے یہ بات سن کر اس نے مجھے غور سے دیکھا دیکھتا رہا اور اچھا اچھا کہتا رہا بہت دیر کے بعد دیوار کے ساتھ لگ کر بولا لیکن میں شیخوپورہ تو جانا نہیں چاہتا مجھے وہاں کیوں لے جانا چاہتے ہو؟ تم مختار بھائی کے پاس سے نہیں آئے؟ نہیں ابا لاہور چلیں گے میں نے جواب دیا وہ چپ ہو گیا اور جیسے کچھ سوچتے ہوئے بولا کون ہو تم؟ جب میں نے اپنے باپ سے اپنا تعارف کرایا تو اس نے کہا۔ اچھا میں کچھ اور ہی سمجھا تھا تم وہ نہیں ہو جس کا مجھے انتظار ہے۔"

ڈرتے ڈرتے میں نے سوال کیا "اسے کس کا انتظار ہے مختار بھائی۔"

"وہ وہ موت کا انتظار کر رہا تھا۔ شاید جس روز سے وہ پیدا ہوا ہے اسی روز سے سے موت کا انتظار ہے لیکن اب وہ مزید برداشت نہیں کر سکتا۔ رات کو میں اسے مناتا رہا کہ وہ میرے ساتھ لاہور چلا آئے لیکن وہ بولا نہیں مانا نہیں بس

چپ چاپ چھت کی طرف دیکھتا رہا صبح میں اٹھا تو وہ اپنے پلنگ پر نہیں تھا۔"

"کہاں گیا؟"

"پتہ نہیں ... تین دن مسلسل میں اس کی تلاش کرتا رہا لیکن وہ مجھے کہیں نہیں ملا شاید ... وہ اب اور انتظار نہیں کر سکتا۔ یا شاید وہ کہیں چلا گیا سڑکوں پر مزاروں پر بازاروں میں ... ایسے لوگ ہوتے ہیں ناں قیوم۔"

بھائی مختار خاموش ہو گئے ہم سانڈ کلاں کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ ہم دونوں میں جو ستخارشتہ تھا تین دن کی مسلسل کوشش کے باوجود اس رسی کو وہ ساتھ نہ لا سکا جس پر چل کر ہم نٹ بازی گروں کی طرح ایک دوسرے کی طرف بڑھ سکتے تھے۔ اما شاید ان لوگوں میں سے تھا جو ساری عمر موت سے محبت کرتے ہیں انہیں زندگی سے اگر پیار بھی ہوتا تو وقتی ... موت ہی کی کشش انہیں زندہ رہنے پر مجبور کرتی ہے اما۔

میں اور بھابھی صولت خاموشی سے ٹیکسی میں بیٹھے رہے موچی دروازے کے باہر جہاں مونگ پھلی چلغوزے اور دیگر ڈرائی فروٹ کی دوکانیں ہیں۔ بھنیاں بھنے ہوئے چنے پھلیاں تھوک کے بھاؤ بکتے ہیں یہاں ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور پیدل چل دیے ... گرمیوں میں یہ بازار باہر کی نسبت بہت ٹھنڈا تھا اس بازار کی اشیاء لوگ اور بولی سن کر لگتا تھا جیسے ہم کسی قصباتی علاقے میں آ گئے ہیں چھوٹی اینٹوں کے مکان تین تین منزلہ اوپر کو نکلے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے اوپر جا کر ان کے ماتھے آپس میں مل جائیں گے۔

اچاروں کی دوکان کے پاس سے جہاں سامنے ہی پتنگوں والے نے بڑے بڑے قدِ آدم پتنگ سجا رکھے تھے ہم ایک بغلی گلی میں مڑ گئے۔ یہیں ہی اس گلی میں روشن کا مکان تھا یہ مکان ضرور غدر سے پہلے تعمیر ہوا ہو گا اس کے چھجے شہ نشین

کھڑکیاں اندر داخل ہونے والا دروازہ سب علی بابا کے عہد کی چیزیں تھیں اندر مکان کے فرشوں میں کالی سیاہ شطرنج بچھی تھی۔ جس کمرے میں ہمیں بٹھایا گیا وہ بیک وقت بیٹھک آفس اور مہمان خانہ تھا۔ ایک کونے میں ہر ٹیبل فین پڑا تھا جو ہماری آمد سے لے کر ہماری رخصتی تک بہت کوشش کے باوجود ایک بار بھی نہ چلا۔ صوفوں پر سفید چادریں اور پلنگ پر کڑھائی سے اٹا ہوا لیس لگا پلنگ پوش بچھا تھا۔

ہماری آمد کے بعد روشن کی ماں آئی ماں کے بعد روشن کی دو چھوٹی بہنیں دو ممانیاں اور پھر ایک پھوپھی آکر بیٹھ گئی۔ اس کے بعد مرد آنے شروع ہوئے آہستہ آہستہ کمرے میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جس پر کوئی بیٹھا نہ تھا۔ میزوں پر کوکا کولا پھل موچی دروازے کی خاص مٹھائی شامی کباب اور جانے کیا کیا سجا دیا گیا وہ تمام لوگ نروس ہونے کی وجہ سے خاموش تھے صرف گلبرگ میں بیاہی ہوئی ایک پھوپھی اپنے رتبے کے اعتبار سے بات چیت کرتی رہی۔

"آپ ریڈیو سٹیشن پر کام کرتے ہیں ناں" پھوپھی نے سوال کیا۔"

"جی۔"

"آج کل چھٹی پر ہیں ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں آجکل" بھابھی صولت نے میری طرف سے جواب دیا۔

"آپ حامد صاحب کو جانتے ہیں؟"

"کون سے حامد صاحب۔"

"وہ میرے شوہر کے کزن ہیں ریڈیو سٹیشن پر انجنیئر ہیں۔"

مجھے چھوٹے سے قد کے سیاہی بکری جیسے حامد صاحب یاد آگئے۔

"جی جانتا ہوں"

"ذکی صاحب کے گھر بھی آنا جانا ہے ہمارا۔"

"کون ذکی صاحب؟" میں نے سوال کیا۔

”وہ ڈراموں میں کام کرتے ہیں بڑی مزاحیہ طبعیت ہے ان کی میرے بچے انہیں بہت پسند کرتے ہیں جب بھی ہمارے گھر میں کوئی فنکشن ہوتا ہے وہ ضرور آتے ہیں اپنے سازندے بھی لے کے آتے ہیں ریڈیو سٹیشن کے۔ انہیں بڑے فلمی گانے آتے ہیں۔“

مجھے سرے سے یاد نہیں آ رہا تھا کہ ذکی صاحب کون ہے لیکن میں نے لاعلمی ظاہری کر کے پھوپھی کوشک کرنا مناسب نہ سمجھا

”بڑے اچھے آرٹسٹ ہیں۔“

”ان کو تو فلم میں کئی آفر آ چکی ہیں لیکن وہ جاتے نہیں کہتے ہیں فلم کا ماحول خراب ہوتا ہے بڑے شریف آدمی ہیں ہم جب بھی پارٹی کرتے ہیں انہیں ضرور بلاتے ہیں کوئی منع نہیں کرتا۔“

موچی دروازے کی باقی سادہ لوح عورتیں تحیر سے ہم دونوں کی باتیں سن رہی تھیں۔ شلوار قمیضوں میں ملبوس تاجر پیشہ، دوکاندار مرد کھانے کی چیزیں لانے میں مصروف تھے پھوپھی کی معلومات کے آگے کسی کا دیا جل ہی نہیں سکتا تھا۔

بڑی دیر تک پھوپھی جان مجھ سے گلبرگ والوں کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر انہوں نے اس سامان کا ذکر شروع کر دیا جو وہ حال ہی میں ہانگ کانگ سے لائی تھیں اس کے بعد انہوں نے اپنے بچوں کی پڑھائی کے مسئلے پر مجھ سے رائے چاہی اس موضوع کے بعد انہوں نے پاکستانی کردار کی دھجیاں بکھیریں ہم لوگ دوسرے ملکوں کے مقابلے میں کس قدر پست کردار ہیں اور کیوں ہیں اس کا تجزیہ کیا حالیہ سیاست پر اظہار خیال ہوا یہ ٹاپک ختم ہوا تو انہوں نے مرد و عورت کے باہمی تعلقات و مرد کی فطری کمزوری اور جبلی کمینگی پر بڑی فصیح گفتگو کی اس دوران بھی صولت مکان کے اندر روش سے ملنے چلی گئیں۔

بڑی دیر بعد بھی صولت باہر آئیں تو ان کے ساتھ روشن تھی۔

میں نے انچل کے سامنے کھڑے دیکھا موتیا رنگت، ہلکا زرد لباس، پھیکے پھیکے ہونٹ اور بہت خوبصورت ہاتھ اس کے بعد میں نے اس پر نظر ڈالی۔ وہ مجھے پیلی موم کا بت نظر آئی اس کی پلکیں رخساروں سے پیوست تھیں غالباً اس نے میری طرف ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا کمرے میں شام کا اندھیرا چھایا ہوا تھا جس وقت پھوپھی نے پہلا بلب جلایا میں اور صولت بھابھی وہاں سے رخصت ہوئے۔

واپسی پر چنگ بازار میں سے چلتے ہوئے بھابھی صولت نے پوچھا ''کیسی ہے؟''

''اچھی ہے''

''سب سے اچھی بات بتاؤں سخت پردے میں پلی ہے۔ ماموں زاد، چچا زاد پھوپھی زاد بھائیوں سے بھی ملنے کی اجازت نہیں تمہاری طرف بھی نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھی خوش نصیب ہو تو تم ایسی لڑکی اب ان ہی علاقوں میں مل سکتی ہے ورنہ گر گلبرگ میں ڈھونڈتے تو بڑی تیز لڑکی ملتی۔''

میرے دل میں چھوٹی سے امید کرن پھوٹی۔

بقول افضل ہر انسان کے اندر ایک چھوٹا سا رب چھپا ہوا ہے جو چاہتا ہے کہ زندگی میں اسے ایک سچا پجاری ایک صادق عبد اور ایک سر ہتھیلی پر رکھنے والا عاشق مل جائے جس وقت اللہ نے حضرت آدم میں اپنی روح پھونکی۔ اسی وقت سے یہ چھوٹا خدا اس بات کا آرزو مند ہوا۔ اسی لیے آدم کی خواہش کے احترام میں حضرت حوا وجود میں آئی یہ بات ہے کہ اس کے بعد حضرت آدم اللہ کے سچے عبد نہ رہے لیکن چھوٹا سا رب بننے کی تمنا ان کے ساتھ ہی زمین پر آئی۔

میں بھی کسی پجاری پر اپنی ذات کا مکمل بوجھ ڈال کر آزاد ہونا چاہتا تھا۔ انسان ساری عمر آزادی کی خواہش میں بھٹکتا رہتا ہے یہ اکی دوسری ایسی خواہش ہے جس

کے اندر رقص دیپ سے موجود رہتا ہے چونکہ مشیت غالباً آزادی کی خواہاں نہیں اس لیے اس نے روح کو پابند کرنے کے لیے جسم کی بیڑیاں پہنائیں جب بھی روح مکمل طور پر آزاد ہو جانا چاہتی ہے یہی جسم اس کی اڑانوں کو سست رفتار کرتا ہے جب جسم پورے طور پر کھل کھیلنا چاہتا ہے اور ہر جوا اتار کر اپنے لیے مکمل آزادی کی کوشش کرتا ہے روح جسم کے اندر کبھی احساس جرم کبھی احساس گناہ تصور خدا کبھی تخیل ما بعد کے نامعلوم جال پھیلا کر جسم کو قید کر لیتی ہے بنیادی طور پر شروع سے انسان قید پیدا ہوا ہے اور اس قید سے بھاگنے کی سعی میں دیوانہ وار بھاگتا رہتا ہے شاید اوکو بھی اسی قید کا شدید احساس تھا کچھ لوگ اسی احساس سے اس قدر ربوجھل رہتے ہیں کہ زندگی بھر انہیں نیستی کے سوائے اور کسی چیز سے پیار نہیں ہو سکتا۔ وہ صرف اسی وقت پر سکون ہوتے ہیں جب نیند یا بیہوشی کا غلبہ ان پر ہو جائے پھر ان کے اندر جسم اور روح کی جنگ وقتی طور پر بند ہو جاتی ہے عمر رفتہ میں محبوس یادیں ان کا کچھ بگاڑ نہیں سکتیں آنے والے مستقبل کی زنجیریں انہیں پابوس نہیں کر سکتیں اور وہ کچھ دیر کے لیے آزاد ہو جاتے ہیں بالکل آزاد۔ آزادی کی اسی خواہش نے انسان کو ہمیشہ بے قرار رکھا ہے حالانکہ وہ اندر ہی اندر جانتا ہے کہ اس کے ضمیر میں ایک بہت بڑا حصہ غلامی کا بھی ہے اور وہ مقید رہے بغیر پروان نہیں چڑھ سکتا آگے نہیں بڑھ سکتا جس قدر وہ آزادی کا خواہاں رہتا ہے اسی شدت سے اطاعت غلامی اور انکساری اس کی ذات کے لیے ضروری ہوتی جاتی ہے۔

شادی سے پہلے کئی دن میں ان ہی دو خواہشوں میں پروپا رہا ایک طرف یہ تسلی تھی کہ روشن جس وقت میرے گھر میں داخل ہوئی اس میں اتنی شکتی ہوگی کہ وہ میرے جسم اور روح کا تمام تر بوجھ اپنی محبت کے جیک پر اٹھا لے گی اور سچا پجاری بنا کر آئندہ میرے تجربات میرا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے میں اپنے آپ میں نہیں اس کے وجود میں زندہ رہنے لگوں گا دوسری طرف مکمل آزادی کی خواہش تھی مجھے لگتا تھا اگر وہ

روزن ثابت نہ ہوسکی تو پھر میں شادی میں محصور ہو جاؤں گا جیسے کبھی کبھی ندی رستہ پا کر ایک گہری جھیل میں جا گرتی ہے اور پھر اس کے پانی نشیب کی تلاش میں نہیں رہتے صرف پاتال کی طرف اترتے جاتے ہیں اندھیرے کی طرف گرم لاوے کی طرف۔

شادی سے دو ایک دن پہلے میرے دل دماغ اور جسم بالکل سن ہو گیا۔ سارا دن میری کھوپڑی پر ڈھولک بجتی رہتی نیچے کی رونق سے گو میرا تعلق کم تھا پھر بھی یہ شادی والا گھر تھا ور میں سارا سارا دن اکیلا نہ بیٹھا رہ سکتا تھا جس وقت میں سہرا پہن کر کار میں بیٹھا آخری بار رسہ تڑوا کر آزاد ہونے کی خواہش دل میں جاگی اور جب قبول ہے قبول کے مرحلے سے گزر کر سب طرف چھوہارے اچھلے مبارک مبارک کی صدائیں اٹھیں اس وقت میں نے جانا میرے اندر کے چھوٹے سے رب نے گواہی دی کہ آج مجھے ایک سچا عشق ملے گا جو میرے بوجھل وجود کا سارا بوجھ اپنے کندھوں پر ڈال لے گا۔ اب اس خواہش کے ساتھ ہی میرے دل میں عجیب قسم کی خوشی پیدا ہوئی ایک خاص قسم کی ecstasy جیسے بہار کے دنوں میں خوشبو سے بوجھل ہوا ہوتی ہے۔

رات گئے تک میں نیچے بھابھی صولت اور بھائی عنایت کے مہمانوں میں گھرا بیٹھا رہا کچھ ریڈیو سٹیشن کے ساتھی بھی موجود تھے کچھ آرٹسٹ برادری بھی آن پہنچی تھی۔ ان لوگوں کے بے تکلف لطیفوں نے مجھ میں اور بھی خوش اعتمادی پیدا کر دی اور مجھے ان سلیم شاہی جوتیوں نے کاشا بند کر دیا جو میرے پیروں میں کچھ کچھ تنگ تھیں آدھی رات کے قریب میں اوپر گیا یہ وہی کمرہ تھا جہاں عابدہ چائے کی ٹرے اور مونگ پھلیوں کا لفافہ لے کر آیا کرتی تھی اسے بیک وقت مونگ پھلیاں کھانے اور باتیں کرنے کا کس قدر شوق تھا عابدہ کہاں تھی؟ جس نے بچے کی آرزو میں اپنے آپ کو تنزا یوگا پر آمادہ کیا تھا شاید وہ بھی مہمانوں میں تھی لیکن آج میں

سارا دن اسے پہچاننے سے بھی قاصر رہا۔

کمرے کی صورت پھولوں اور ہاروں کی وجہ سے بدلی ہوئی تھی ہر جگہ نئے سوٹ کیس سرخ کسبری کاغزوں میں لپٹے ہوئے ڈبے پڑے تھے کمرے میں باسی چنبیلی کے پھولوں کے ساتھ ساتھ دلہن کی خوشبو تھی ہم دونوں اکیلے تھے اور شادی شدہ تھے۔ بڑی آرزوؤں کے ساتھ اور بڑے عہد و پیمان کر کے ہم دونوں کو باقی کی زندگی کا سفر کاٹنا تھا۔

''میرا نام قیوم ہے'' میں نے پلنگ پر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا ''میں نے سوشیالوجی میں ایم اے کیا ہے ریڈیو سٹیشن میں ملازم ہوں السر کا مریض ہوں، سالن میں مرچیں نہیں کھا سکتا آپ کو اس کی طرف سے احتیاط کرنا ہو گی مجھے ایم اے سوشیالوجی کی تعارفی کلاس یاد آ گئی کیا انسان ساری عمر اپنا تعارف ہی کراتا رہتا ہے۔''

روشن نے بغیر تکلف کے منہ سے گھونگھٹ اتار دیا ایسا زرد سورج مکھی میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

میں نے ارادہ کیا ہے کہ اپنی ساری زندگی آپ کو دوں بمع اس کی تلخ یادوں کے کیا آپ میں اتنی ہمت ہے کہ آپ میری یادوں کا بوجھ بھی اٹھا لیں اپنے دل پر؟ اور مجھے ہلکا پھلکا کر دیں؟ میں نے پوچھا۔

اس نے اپنا سر گھٹنوں پر رکھ لیا۔ اس کی آنکھوں سے پیلے رنگ کے آنسو زرد گالوں پر بہنے لگے۔ میرا خیال تھا کہ چونکہ وہ زیادہ پڑھی لکھی نہیں اس لیے غالباً وہ میری بات کی تاب نہیں لا سکی میں نے جیب سے رومال نکال کر اس کے آنسو پونچھے اس نے مدافعت نہ کی اور چپ رہی۔

''کیا آپ میری تلخیوں کو جذب کر لیں گی؟ میں اتنا کچھ سہہ چکا ہوں کہ اگر آپ نے وعدہ نہ کیا تو میں بالکل پاگل ہو جاؤں گا مینٹل ہسپتال سے مجھے صرف

آپ ہی بچا سکتی ہیں۔"

پہلی بار روشن بولی چھوٹی سی کم عمر آواز جیسے کوئی نو عمر کبوتری بولے "اگر آپ نے میری تلخیوں کو جذب نہ کیا تو میں تباہ ہو جاؤں گی پوری طرح پوری طرح پوری طرح ....."

میرے اندر کے مرد نے بیچاری عورت کو سہارا دینے کے لیے کہا "تم میرے ہوتے ہوئے تباہ نہیں ہو سکتیں روشن تمہاری تمام تلخیوں کو میں جذب کروں گا جیسے جیسے بارش کو ریت جذب کرتی ہے۔"

ہم دونوں خاموش ہو گئے مجھے لگا جیسے میں ناس ہار گیا ہوں میں نے سگریٹ سلگا لیا اور کتنی ہی دیر تک سگریٹ پیتا رہا۔

"پھر ؟ "بڑی دیر بعد میں نے سوال کیا۔

"جی "وہ اب ہولے ہولے رو رہی تھی اور کوئی چیز مجھے اندر ہی اندر بتا رہی تھی کہ میں اسے چپ کرانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔

"پھر ..... بتاؤ ناں .....؟"

"بتانے والی بات نہیں ہے میں اچھی طرح سے بتا بھی نہیں سکتی۔"

"ہم ریڈیو والے بہت کچھ جانتے ہیں ہمارے لیے کچھ نیا نہیں ہوتا، تم بتاؤ تو سہی! ....."

دو تین گھنٹوں کے دم دلاسے کے بعد وہ اپنی تلخی کی طرف آئی۔

"جی مجھے بچہ ہونے والا ہے۔"

یکدم مجھے یوں لگا جیسے کوئی بھاری چیز میرے ماتھے سے اندھیرے میں ٹکرائی میں بھنا گیا۔ بظاہر میں نے جرات سے کہا "اچھا پھر تو پھر تو ایک دوسری بات ہے۔"

اب وہ اونچے اونچے رونے لگی "میں نے اماں جی سے بہت کہا ہاتھ

جوڑے خدا قسم بہت منتیں کیں لیکن وہ تو کہتی ہیں میں کسی قصائی کو بیچ دوں گی اس کے ساتھ شادی نہیں کروں گی تیری۔"

"کون ہے وہ؟ بچے کا باپ؟"

"ہماری گلی میں پتنگوں کی دوکان ہے اس کے باپ کی پہلے وہ باپ کی دوکان پر بیٹھ کرتا تھا اب اب تو وہ جدے چلا گیا میرے گھر والوں نے اسے ٹکنے ہی نہیں دیا۔"

"بڑا افسوس ہے" یہ بات میرے منہ سے بڑی فروئی گی

"ایک روز وہ فلم دیکھنے گیا تو تو میرے بھائیوں نے اسے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کے سامنے پکڑ لیے کارے اتنا مارا اتنا مارا بھلا اسے کیوں مارتے تھے یہ لوگ قیوم صاحب قصور تو سارا میرا تھا ۔ سارا میرا اس نے کئی بار میری منتیں کیں ہاتھ جوڑے لیکن ۔۔لیکن میں اسے چھوڑ ہی نہیں سکتی نہ اس زندگی میں نہ "یکدم وہ میرا چہرہ دیکھ کر چپ ہو گئی۔

"آپ کو میری باتیں بری لگ رہی ہیں؟ روشن نے اٹک اٹک کر سوال کیا

"تم نے تو پھر تم نے یہ شادی کیوں کی روشن؟ جب تم اس حد تک بیاہی جا چکی ہو تو اس شادی کی کیا ضرورت تھی؟"

اب اس کی آواز دھیمی پڑ گئی "مجھے تو ضرورت نہیں تھی جی یہ میرے گھر والے اگر اسے جان سے مارنے کی دھمکی نہ دیتے تو تو میں کبھی رضامند نہ ہوتی میرا خدا گواہ ہے۔"

اتنے زرد معصوم چہرے پر اتنی وثوق کی باتیں کچھ اوپری معلوم ہو رہی تھیں۔

"اب کیا کریں روشن؟"

وہ چپ ہو گئی پھر چپ چاپ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

"جیسی آپ کی مرضی؟"۔

”تم جلدی سے خط لکھو کہ وہ تمہیں آ کر لے جائے میں تمہیں اس کی امانت سمجھوں گا۔“

یکدم اس کی آنسو خشک ہو گئے اور وہ ہکا بکا میرا چہرہ دیکھنے لگی۔ دیکھتی گئی اس کی آنکھوں میں تحیر خوف کی حد تک منجمد ہو گیا تھا۔

”آپ ..... آپ جی؟۔“

”چاہو تو میں ابھی تمہیں طلاق دے دوں چاہو تو اس کی آمد پر فیصلہ کر دوں گا “ میں نے جیب سے ایک خوبصورت گھڑی نکالی۔ اس گھڑی میں دن وقت مہینہ چاند رات سب کچھ نظر آتا تھا۔ یہ گھڑی میں نے اس امید پر خریدی تھی کہ جس وقت میں یہ گھڑی روشن کی کلائی پر باندھوں گا۔ اس لمحے کے بعد میں اپنی زندگی کا پیٹرن مکمل طور پر بدل دوں گا اس کے بعد میرے وجود کی تمام سوئیاں اس کی تابع چلیں گی اور اس طرح میں اپنے بوجھ سے آزاد ہو جاؤں گا میں نے گھڑی اس کے پاس رکھ کر کہا ”وقت دیکھ لو روشن اس وقت میں تم سے عہد کرتا ہوں کہ کہ تم یہاں مہمان ہو۔ جب تک تمہارے حالات اجازت دیں یہیں رہو اپنے آپ کو میری بیوی ظاہر کرنے میں سہولت ہو تو ایسے سہی میری بیوی کا رتبہ نا پسند ہو تو کھلم کھلا اظہار کر سکتی ہو کہ تمہارا مجھ سے کوئی رشتہ نہیں۔“ اس کی آنکھیں بالکل ساکت مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔

”آپ جی آپ کو “ وہ چپ ہو گئی۔

ہم دونوں تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے پھر میں نے گلے سے پھولوں کے سنہری تاروں والے روپے کے کئی ہار اتار کر اس کے پاس پلنگ پر رکھے۔ اپنی زری کی اچکن اتار دی عین صاف کی اور وہ سلیم شاہی جوتا جو صبح سے پاؤں دبا رہا تھا اتار دیا۔

”شکر ہے تمہارے ماں باپ ماڈرن نہیں ورنہ جہیز میں ڈبل بیڈ دے دیتے “ میں نے ہنس کر کہا ”اس صورت میں مشکل پیدا ہو سکتی تھی آرام سے سو جاؤ

جب میں آؤں گا تو یہاں اس پلنگ پر لیٹ رہوں گا۔"

"آپ کہاں جا رہے ہیں اس وقت؟۔"

"کوئی خاص جگہ نہیں بس ایسے ہی۔"

وہ گھبرا گئی۔

"آپ بھا بھی صولت کو بتانے چلے ہیں؟ ڈر کر اس نے سوال کیا۔"

"نہیں!۔"

"اگر آپ نے کسی سے ذکر کیا تو میں مر جاؤں گی۔"

مجھ میں عجیب قسم کی قوت آ گئی تھی میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا۔روشن۔

لیکن اگر جدے والا کسی وجہ سے نہ آ سکا اور بچے کی آمد ہو گئی تو تم اسے

میرا بچہ ظاہر کرنا۔"

وہ میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن آنکھوں سے مسلسل آنسو بہنے کی وجہ سے مجھے اس

کی آنکھوں دکھائی نہ دیتی تھیں۔

"وہ ضرور آئے گا ضرور آئے گا وہ ایسا نہیں ہے جیسا اماں سمجھتی ہیں۔"

میں روشن کے قریب ہو گیا اور آہستہ سے میں نے اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ

کر کہا "انشاء اللہ وہ ضرور آئے گا ہم دونوں دعا کریں گے۔"

یکدم روشن نے میرا ہاتھ پکڑ لیا جلبلا کر بولی "آپ کو بھی تو کچھ بتانا تھا مجھے

آپ کو بھی تو۔"

"ابھی اس کا وقت نہیں آیا روشن بتاؤں گا کسی روز۔"

جس وقت میں سیڑھیوں سے اترا سارا گھر خاموش تھا آنگن میں بریانی اور

قورمے کی خوشبو تھی سب ٹوٹے ہوئے پھول بکھرے تھے برآمدے میں قالین پر

ڈھولک کے ساتھ دو تین باکری لڑکیاں بے سدھ سوئی ہوئی تھیں ان کے پاس

بھابھی کے دونوں توام بیٹے مسعود اور فرید گتھم گتھا بے سدھ پڑے تھے۔اندر باہر بجلی

کے پنکھوں کی کھوکر جاگی ہوئی تھی۔میں نے سیڑھیوں کے نیچے سے اپنا موٹر سائیکل دبے پاؤں باہر نکالا اور دور تک موٹر سائیکل کو پیدل چلاتا نکل گیا پھر یکدم اس پر سوار ہو کر میں نے رس دی رات کے پچھلے پہر موٹر سائیکل کی آواز چنگھاڑ کر دور دور پھیل گئی یکدم مجھے یوں لگا جیسے دکھائی نہیں دے رہا میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا خدا جانے کب سے میرے آنسو بہہ رہے تھے۔

میں مال روڈ کی طرف سے جناح باغ میں داخل ہوا رات کے وقت منٹگمری ہال جنات کا محل لگ رہا تھا میں نے باغ میں جانے سے بہت پہلے موٹر سائیکل کا انجن بند کر دیا اور کینٹین کے قریب اسے پارک کرنے کے بعد میں بائیں جانب مڑ گیا کافور کا درخت تلے عجیب قسم کی خوشبو تھی۔سارے باغ میں جھینگروں کی آواز اور جگنوؤں کی ٹمٹماہٹ تھی۔باغ سے ایک خاص قسم کا خوف پھوٹ کر ساری طرف پھیل رہا تھا۔

میں چھٹکارے کا کافور کے درخت تلے لیٹ گیا۔ہوا میں موت کی خوشبو تھی۔ میرے معدے میں تیزاب کھنچا جا رہا تھا اور منہ کڑوے کھیرے کی مانند تھا میں کچھ بھی سوچنا نہ چاہتا تھا پھر بھی یادوں کی چیونٹیاں میرے جسم پر تیر رہی تھیں۔آہستہ آہستہ میرے تمام رونگٹے کھڑے ہو گئے اور مجھے لگا جیسے میری نکسیر بہہ رہی ہے۔

شادی سے چند دن پہلے مجھ میں دو خواہشیں آگاہی کے ساتھ ابھری تھیں۔اب مجھ پر یہ حقیقت بھی کھل رہی تھی کہ انسان جب تک چاہے جانے کی رب بننے کی آرزو رکھتا ہے وہ کبھی آزاد نہیں ہو سکتا۔چاہا جانا اور آزاد رہنا صلیب کے بازو ہیں جن پر آدمی مصلوب ہو جاتا ہے پہلی مرتبہ مجھے مہاتما بدھ کی سمجھ آئی کہ وہ کیوں خواہشات کو ختم کر کے اپنی مکتی چاہتا تھا جب تک انسان میں ہلکی سی خواہش بھی ہو وہ

تابع رہتا ہے خواہش کی وجہ سے قیدی ہوتا ہے کبھی حاکم نہیں ہو سکتا۔ خواہش سے آزادی کیونکر ممکن ہے؟

کیونکر کیسے؟

موت سے پہلے موت زندگی کے ساتھ زندگی کی نفی آخر نجات سے پہلے کلی فرار۔

نجات کی آرزو تک سے ہر مسلک سے ہر بت سے چھٹکارا حاصل کرنے یک ہی طریقہ ہے کہ نسان ہر قسم کے بت توڑ دے ہر مسلک سے آزاد ہو جائے۔ کسی مت میں شامل نہ ہو۔ کسی ملک کا باشندہ نہ ہو کسی معاشرہ کا فرد نہ ہو کسی۔ کلچر سے وابستہ نہ ہو۔ کسی خاندان کا فرد نہ ہو نہ کسی کا عاشق ہو نہ محبوب ہر کیفیت سے آزاد ایسی حالت میں وہ سوائے موت کے اور کسی کا مرہون منت نہیں ہو گا کسی اور کا عاشق نہ ہو گا۔

موت جو یقینی ہے موت سے پہلے موت۔

کیا انسان پیدائش کے لمحے سے لے کر موت کی گھڑی تک صرف اسی کوشش میں رہتا ہے کہ وہ کسی طرح اس محسن کو پہچان سکے جو اسے زندگی کے ہر احسان سے نجات دلا سکتا ہے کبھی کبھی اچانک کسی کے چہرے پر خاموشی اور غم کی دبیز لہریں چھا جاتی ہیں۔ کیا اس لیے اسے مراجعت کی فکر ہوتی ہے کیا موت کا مہربان سایہ اس پر پڑتا ہے؟ کیا ابدی وطن کی طرف لوٹ جانے کی آرزو ہر ذی روح کو یہاں کی لذتوں میں بھی ناآسودہ رکھتی ہے؟ کبھی کبھی بھری محفلوں میں شام کے وقت سب خاموش ہو جاتے ہیں کیونکہ موت کا فرشتہ وہاں سے گزرتا ہے اور سب کی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ نسان موت کی مدد کے بغیر مکمل طور پر کبھی آزاد نہیں ہو سکتا خواہشات کا تمام بوجھ نسان کے کندھوں سے اتارنے والی صرف موت ہے۔

سیمی زندگی میں کتنی کرب ناک تھی وہ کیسے تلملاتی رہتی تھی اور موت سے

ہمکنار ہوتے ہی اس کا چہرہ کتنا شانت   کیسا آزاد ہو گیا۔

اس دن کے بعد میری زندگی کا ہر لمحہ موت کے متعلق سوچنے میں گزرنے لگا۔ موت کے ساتھ ہمکلامی کے بعد مجھ میں ایسا خوف پیدا ہو جاتا ہے کہ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگ جاتا۔ مجھے گردوپیش کی سدھ بدھ نہ رہتی اور کئی بار ایک ہی پوزیشن میں کتنی کتنی دیر بیٹھا یا کھڑا رہتا مجھے لگتا تھا جیسے میں اسی لیے پیدا ہوا ہوں کہ موت کا منتظر رہوں۔ میں جیتے جی کسی عورت کے عشق کا سہارا لے کر آزاد نہیں ہو سکتا۔ خواہشات کے خوش رنگ اور عطر بیز جنگل سے اگر کوئی چیز مجھے نکال سکتی ہے تو وہ صرف موت ہے   اور اگر میں جسمانی طور پر نہ بھی مر سکوں تو بھی اندر مجھے مر ہی جانا چاہیے۔

اس وقت ایک گھنی جھاڑی سے ایک ٹوگزے آدمی برآمد ہوا۔ اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کئی آدمی تھے۔ کسی کے سر پر بال نہ تھے اور چار ابروؤں کا بھی صفایا تھا ان کے ہاتھوں میں لمبی لمبی روشن مشعلیں تھیں اور وہ دائرے میں ایسے چل رہے تھے کہ ٹوگزا آدمی درمیان میں آٹھ نمبر بناتا آگے بڑھتا اور باقی تمام بالشتیے اس آٹھ کے گرد واٹرپول کی طرح گول گول چکر لگاتے آتے اس ٹوگزے کو میں ان دنوں بھی ہی دیکھ تھا جب میں موت سے ہمکنار تھی اس وقت مجھے یقین تھا کہ اب وہ میرے خیر مقدم کے لیے آیا ہے مشعلوں کی روشنیاں کبھی تابناک ہو جاتیں کبھی بھک سے جل کر واپس مشعلوں میں گھس جاتیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے بالشتیے ساری مشعلیں چاٹ جاتے، اب وہ تمام کے تمام خود مشعلوں کی طرح بھڑک رہے تھے لیکن ختم نہ ہوتے تھے کبھی کبھی جگنو سا بجھ جاتے لیکن پھر لحظہ دو لحظہ بعد ان کا دائرہ بھڑک اٹھتا ٹوگزے کو ابتدا نہ ان کی فکر تھی نہ آگاہی وہ آٹھ کا ہندسہ بناتا دائرے میں آگے بڑھتا آرہا تھا۔

اپنی طرف اسے بڑھتے دیکھ کر میں پسینے میں شرابور ہو گیا میں اٹھ کر بھاگنا چاہا۔

لیکن اس کی نظروں میں ایک مقناطیسی کشش تھی اس نے مجھے ایسے باندھ رکھا تھا
جیسے سانپ کو بین مسحور کر لیتی ہے۔ اس کا سارا تن سفید چادر میں چھپا ہوا تھا یہ چادر
نہ سلی ہوئی تھی نہ کھلی نہ جبے کی شکل کی تھی نہ تہمد جیسی بس ایک لبادہ تھا جیسے روئی
میں نگندے ڈال کر پہنی ہوئی ہے وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھا لیکن ہم دونوں میں
عجیب طور پر بغیر بولے گفتگو جاری ہو گئی۔

"تم مجھ سے موت کے متعلق پوچھنا چاہتے ہو؟"

"ہاں ہاں میں جاننا چاہتا ہوں انسان کہاں سے آیا ہے اور کہاں
چلا جائے گا وہ جہاں سے آیا ہے کیا وہیں لوٹے گا کہیں اور یہ
سارا وقفہ یہ ساری دیوانگی اس سے چھٹکارا کیا موت سے پہلے نہیں ہو
سکتا؟ کیا آزاد ہونے کے لیے صرف اس سوئی کے ناکے سے گزرنا ہو گا؟"

وہ خاموش تھا اور میری طرف سرچ لائٹ جیسی نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"بتاؤ تم بتا سکتے ہو ؟ کیا موت کی آرزو نے انسان کو دیوانہ بنا رکھا ہے
کیا ہر انسان شروع دن سے صرف موت کی آرزو کرتا ہے بولو بتاؤ کیا
نسل انسانی صرف تصور موت کے ہاتھوں پاگل ہوتی ہے؟ بتاؤ ناں۔"

اس کی نظروں میں جلا دینے اور بھسم کرنے کی قوت تھی۔

میں دیر تک سوال کرتا رہا وہ دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا صرف اس کے ارد گرد
بالیشے روشنی کے گولے بناتے رہے۔

"بتاؤ بتاؤ موت کیا ہے؟ یہ اسرار یہ بھید کیا ہے فنا کا ذائقہ کیا ہے؟ مر کر
آدمی پر کیا بیت جاتی ہے؟"

اس نے تین مرتبہ بغیر پلکوں کے پپوٹے جھپکائے اور بغیر آواز کے گویا ہوا۔ سن!
جب انسان مرتا ہے تو دو آدمی مردے کے پاس آتے ہیں۔ غالباً ان ہی کو منکر نکیر کہا
جاتا ہے ان دونوں کا مقصد تمہیں الجھانا ہوتا ہے ایک آدمی جھوٹا ہوتا ہے اور

ایک سچا جھوٹے کا مقصد یہ ہے کہ تمہیں اس فریب میں مبتلا رکھے کہ تم زندہ ہو۔ اور ابھی تمہاری روح واپس جسد خاکی میں چلی جائے گی سچے آدمی کو یہ مشکل درپیش ہوتی ہے کہ کس طرح آپ کو یہ یقین دلائے کہ آپ مر چکے ہیں اور اب آپ کی روح جسد خاکی میں کبھی نہ جا سکے گی۔ اس مرحلے میں تین دن لگتے ہیں۔"

"پھر ... پھر؟ پھر؟"

"بڑی رد و کد کے بعد انسان بالآخر سچے آدمی کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے اور سمجھ جاتا ہے کہ وہ مر گیا ہے اب جھوٹا ساتھی رخصت ہو جاتا ہے اور سچا آدمی کئی سائز کے نیم شفاف ڈبے لے کر پہنچتا ہے۔ یہ ڈبے بڑے ریفریجریٹر کے کھوکھے سے لے کر دوائی کے کیپسول جتنے ہوتے ہیں ان سب کا رنگ ہلکا گلابی ہوتا ہے اب سچا آدمی مرے ہوئے آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان ڈبوں میں سے کسی کو منتخب کرے جس قدر بڑی روح ہو گی اسی جتنا بڑا ڈبہ تلاش کرنا پڑتا ہے کئی بار مرنے والا چھوٹا ہوتا ہے لیکن بڑے کھوکھے میں جا بیٹھتا ہے اور سچے آدمی کو منتوں سے منانا پڑتا ہے کہ وہ یہ کھوکھا چھوڑ دے۔ درست ڈبے کے انتخاب اور اس میں بند ہونے میں قریباً چالیس دن لگ جاتے ہیں لیکن ایک بار جب روح ڈبے میں بند ہو جاتی ہے تو پھر سچا آدمی جلدی سے ڈبہ لے کر رخصت ہو جاتا ہے۔"

"کہاں ... کہاں؟"

وہ خاموش رہا اس کی تکلی سے شعاعیں نکل رہی تھی۔

"دریائے نیستان پر۔ اس دریا میں سچا آدمی وہ سارے ڈبے پھینک دیتا ہے جن میں روحیں مقید ہوتی ہیں۔ بھولے ہوئے تمام ڈبے اپنے اپنے بوجھ سے دریا کی تہہ میں اترنے لگتے ہیں اور ڈبوں میں روحیں بند روحیں باہر نکلنے کے لیے جدوجہد کرتی ہیں یہ ڈبے عجیب طرح سے بند ہوتے ہیں نہ کہیں زپ نہ بٹن نہ کنڈا۔ صرف کسی ایک جنگی مناسب بوجھ پڑ جاتا ہے تو ڈبہ خود بخود کھل جاتا ہے کئی

لوگ سالوں میں قرنوں میں صدیوں میں یہ ڈبہ نہیں کھول سکتے کئی پہلے غوطے میں کچھ ایسے اطمینان سے بوجھ ڈالتے ہیں کہ کھٹاک سے ڈبے کا منہ کھل جاتا ہے اور روح تیر کر باہر نکلتی ہے۔ اور کوئی بھی سطح کو کاٹ کر باہر نکل جاتی ہے۔ ان کے لیے نئی زندگی ہوتی ہے۔"

"کچھ ایسے بدنصیب بھی ہوں گے جو جو باہر نہیں نکل سکتے وہ لوگ وہ روحیں؟"

"ایسے بدنصیب نیچے سطح پر جا پہنچتے ہیں یہ روحوں کا قبرستان ہے یہ روحیں قیامت تک وہیں رہیں گی۔ روز جزا تک یہ وہیں بند سیپیوں کی طرح منتظر رہیں گی کوشش کرتی رہیں گی لیکن باہر نہ نکل سکیں گی۔"

پتہ نہیں کیا بات ہوئی کہ میں کافور کے درخت تلے سے اٹھی اور بھاگنے لگا۔ گول دائروں میں کبھی گراؤنڈ کے اندر کبھی سڑکوں پر کبھی درختوں کے گرد کہتے ہیں کہ جب گدھ کی موت آتی ہے تو وہ مردار سے بھی منہ پھیر لیتا ہے پھر وہ ایک ٹانگ پر دور دور زیر بنجر علاقوں میں یوں بھاگتا ہے جیسے صدیوں کا پیاسا ہو مردار جانور کا تعفن اس کے نتھنوں میں ہوا کے جھونکے کے ساتھ آتا رہتا ہے لیکن اس تعفن سے اشتہا بڑھنے کے بجائے اسے متلی ہونے لگتی ہے اس کے جسم میں مردار کھانے کے خلاف احتجاج ہونے لگتا ہے ایسے میں وہ گم ہیضے کا شکار ہو جاتا ہے اشتہا عروج کو پہنچ جاتی ہے لیکن جبڑے نہیں کھلتے معدہ کچھ قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے وہ بنجر زمین پر پڑے ہوئے مردار لاشوں کو دیکھ کر بھاگتا ہے اور آخر کو خاردار جھاڑیوں الجھ کر دم توڑ دیتا ہے مرے ہوئے گدھ کے لاشے کو ٹھکانے لگانے فطرت کے خاکروب نہیں آتے۔ اس لاشے کو سورج کی کرنیں ریت کے سوکھے انبار، خشک پتے بارش اور ہوا کے تھپیڑے توڑ پھوڑ کر پھر مٹی کا حصہ بنا دیتے ہیں۔

کہتے ہیں ایک مٹی میں جو بھی بیج ڈالو کبھی بارآور نہیں ہوتا کبھی زمین

سے سر نکال ہی نہیں سکتا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں ہسپتال میں تھا!

کچھ دیر تک میں اپنے اردگرد کا صحیح جائزہ نہ لے سکا دھوپ بہت تھی، حول نیا تھا میرے بازو میں گلوکوز کی ڈرپ لگی تھی اور سامنے کرسی پر روشن بیٹھی تھی روشن سے کوئی یقینی تعارف نہ تھا شاید میں اسے پہچان ہی نہ سکتا اگر اس کے ساتھ دائیں بائیں بھائی مختار کے دونوں بچے کھڑے نہ ہوتے۔ بھابھی صولت میرے پائنتی بیٹھی تھیں اور منہ میں کچھ پڑھ رہی تھیں۔

"اب طبیعت کیسی ہے" روشن نے سوال کرتے ہی نظریں جھکا لیں۔

"باتیں نہ کرو" بھابھی صولت نے خفگی کے ساتھ کہا "پتہ نہیں ڈاکٹر نے منع کیا ہے اسے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔"

"چچا جی آپ جناح باغ کیوں گئے تھے؟" مسعود نے پوچھا۔

"آپ چڑیا گھر گئے تھے نا چاچا جی نیا زیبرا دیکھنے؟" فرید نے سوال کیا۔

"چپ کرو اور باہر چلے جاؤ" بھائی مختار نے جھڑکا۔

"آپ بیہوش کیوں پڑے تھے جناح باغ میں چاچا جی" مسعود نے پھر پوچھا

"چھو نکلو یہاں سے جاؤ" بھابھی صولت نے بچوں کو پانچ روپے کا نوٹ پکڑا کر کہا "باہر جا کر آئس کریم کھاؤ۔"

میں نے آنکھیں بند کر لیں دن کی روشنی ہسپتال کا کمرہ، کمبل، ڈرپ، روشن کا چہرہ سب میرے لیے بے حقیقت چیزیں تھیں میں ابھی تک تو گزرے کے ساتھ تھا اور میرے نتھنوں میں کافور کی خوشبو تھی۔ ڈاکٹر کے آنے تک میں دم سادھے آنکھیں

بند کیے بیٹھے رہا روشن اور بھابی صولت سے کوئی بات کرنے کو نہ تھی۔

''وہ کہاں ہے ؟ وہ ''میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا۔

بلڈ پریشر کا آلہ میرے بازو پر فٹ کرتے ہوئے ڈاکٹر نے تعجب سے میری جانب دیکھا اور بولا وہ کون حضرت! یہاں تو ہم سب ہیں آپ کی خدمت کے لیے۔

''وہ لوگڑے کا آدمی جو مشعل لے کر چلتا تھا جو جس نے مجھ سے باتیں کی تھیں

ڈاکٹر بے معزز تھکا ہوا، عینکو، ذہنی شخصیت کا آدمی تھا ڈاکٹری اس کا صرف پیشہ تھا وہ بناوٹی بے تکلفی اور خوش دلی سے بولا ''حضور آپ تو پانچ دن سے بے ہوش پڑے ہیں خدا کا شکر کریں جان بچ گئی ورنہ بہت کچھ ہو سکتا تھا۔''

میں نے آنکھیں بند کر لیں مجھے معلوم تھا کہ وہ میری باتیں سمجھ نہیں سکتا۔

پھر بھابی صولت اور ڈاکٹر کھسر پھسر کرنے لگے۔

''بے ہوش ہو گیا ہے پھر ؟ ''

''بس آرام کی ضرورت ہے ہم Tranqulizers دے رہے ہیں''

''ابھی تو ٹھیک تھے'' روشن کی آواز آئی

''بس جی بارڈر لائن کیفیت ہوتی ہے کبھی مریض ہمارے پاس واپس آجاتا ہے کبھی ادھر چلا جاتا ہے اب نارمل لوگوں میں''

''آپ ان کی مدد نہیں کر سکتے ؟ '' روشن نے سوال کیا۔

''کر رہے ہیں بی بی ہم سب کچھ کر رہے ہیں لیکن ایسا کیس ہمارا نہیں ہوتا۔ انہیں کسی سائیکو تھراپسٹ کی ضرورت ہے سردست جو کچھ بھی ممکن ہے کر رہے ہیں''

اس کے بعد کسی نے میرے بازو میں انجکشن لگایا بھابی صولت کے رونے کی

آواز آئی اور رفتہ رفتہ مجھے یوں لگا جیسے میں کھسک رہا ہوں چارپائی سے بستر سے

میرا سر بوجھل تھا میں بازو اٹھا کر ناک کھجلانا چاہتا تھا آنکھیں کھول کر دیکھنے کی

آرزو تھی۔لیکن نہ میری آنکھیں کھلتی تھیں نہ بازو اٹھتا تھا۔

"یہ یہ ٹھیک تو ہو جائیں گے " روشن کی آواز تھی اور اسی آواز کے ساتھ

میں دوبارہ نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

ہسپتال سے واپسی پر سب سے پہلے میں نے اپنے سر کے سارے بال منڈا

دیئے سر منڈوانے سے میں نے وہ ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ اور بڑھا لیا جو روشن اور میرے

پلنگ کے درمیان تھا میں ابھی تک چھٹی پر تھا لیکن اب ریڈیو سٹیشن سے کبھی کبھی کوئی

واقف میری طبیعت کا پوچھنے آ جاتا۔مجھے معلوم ہے کہ میرے تعلق ریڈیو پر کیسی

باتیں ہوتی ہوں گی۔کچھ آرٹسٹ اور افسر مل کر مجھے دیوانہ سمجھتے ہوں گے شروع سے

نیچے بھی صولت اور بھائی مختار بھی مجھے دیکھ کر شرمندہ ہو جاتے ان کی شکلیں

دیکھ کر مجھے لگتا جیسے وہ مجھے نہیں اپنے آپ کو قصوروار سمجھتے تھے ادھر روشن کی عجیب

مصیبت تھی وہ دن بدن پیلی ہوتی چلی جا رہی تھی پہلے اس کی رنگت زرد ساٹن جیسی تھی

اب وہ پیلے کھدر جیسی نظر آتی۔میرا سارا کام وہ کرتی اس کی ضروریات کا میں خیال

رکھتا اس کے باوجود ہم دونوں میں کم ہی بات ہوتی۔کمرے میں ترتیب آ گئی تھی۔یا

تو میرے آنے سے پہلے وہ سو جاتی لیکن اگر وہ جاگتی نظر آتی تو میں نیچے چلا جاتا اور

بے مصرف سڑکوں پر گھومتا رہتا۔یہ عجیب دن تھے جیسے پانی کی سطح پر ہولے ہولے

کائی جمتی چلی جائے میرے اندر بھی ہر خواہش آہستہ آہستہ شٹر بند ہو رہی تھی اور میں

عجیب طرح سے آزاد ہوتا چلا جا رہا تھا موت سے اس قدر گہرا رابطہ قائم کرنے کی وجہ

سے زندگی یکدم بے معنی ہو گئی تھی میں دوکانوں کے سامنے کھڑا سوچتا رہتا

لوگ یہ سارا سامان کیوں خریدتے ہیں کیمرے کپڑے قالین، برتن

گیس کا سامان فریج کاریں سارے بازاروں میں بے ہودہ سامان دیکھ کر میں جان بچا کر کسی فلم ہاؤس کے سامنے جا کھڑا ہو جاتا فلموں کے پوسٹر اب جاذب نظر نہ رہے تھے میں کوشش کرتا کہ ان فلموں میں مجھے دلچسپی پیدا ہو جائے لیکن جن وجوہات کی بنا پر فلمیں دیکھی جاتی ہیں وہ باقی نہ رہی تھیں۔

باغوں میں سڑکوں پر سب جگہ مجھے بے مصرف لوگ نظر آتے۔

یہ وہ دور تھا جب میں مکمل آزادی یا تمامتر فنا کے بالکل مقابل تھا۔

گھر پر میرا کوئی کام نہ تھا۔ روشن مجھے دبی زبان میں آرام کرنے کو کہتی۔ لیکن مجھے گھر سے وحشت ہوتی تھی۔ باہر چلا جاتا تو بھی کوئی کام میرے کا لے کا نہ تھا۔ میں فٹ بال کی طرح کبھی اس کورٹ میں کبھی اس کورٹ میں بھٹکتا رہتا ایک صبح مجھے روشن نے کہا "اگر آپ چاہیں تو میں ہو جی چلی جاؤں اماں کے پاس"

"تمہاری مرضی ہے۔"

"آپ بتائیں۔؟"

"میں کیا بتاؤں اگر تم کو یہاں آرام ہے تو یہاں رہو ورنہ وہاں چلی جاؤ۔"

وہ رونے لگی۔

"آرام تو مجھے یہاں زیادہ ہے لیکن میری وجہ سے آپ کو آرام نہیں ہے۔"

میں اس کے مقابل پلنگ پر بیٹھ گیا "دیکھو روشن تمہاری وجہ سے مجھے کوئی تکلیف نہیں اس وجہ سے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

ہم دونوں چپ ہو گئے۔

"اس کا کیا جواب آیا ہے؟۔"

روشن اٹھی اور نے سوٹ کیس کی جیب میں سے ہوائی ٹکٹ والا لفافہ نکال لائی۔

یہ خط اس کا تھا۔روشن کے انچارج کا۔

"کیا لکھا ہے؟"

"آپ پڑھ لیں۔"

میں نے بڑی دیر میں خط پڑھا پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں میں جالے سے آ رہے تھے تحریر معمولی تھی۔ پتنگ فروش کے بیٹے کی سیدھی سادی تحریر۔لیکن تحریر میں حدت خلوص محبت سب کچھ تھا اس نے اصرار سے لکھا تھا کہ جتنی جلدی میں اسے آزاد کر دوں گا۔ وہ آجائے گا اور پھر دونوں واپس جا سکیں گے۔

"تم اسے لکھو کہ تم آزاد ہو اور ہم اس کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"سب کچھ جلدی ہونا چاہیے میں میری حالت زیادہ انتظار نہیں کر سکتی۔

"

"یہ تو نختار پر منحصر ہے جتنی جلدی وہ آجائے گا معاملہ طے ہو جائے گا۔"

وہ چپ ہو گئی بڑی دیر چپ رہی۔

"میں جی پھر بھی جاؤں سوچی دروازے۔"

"جیسا تمہارا جی چاہتا ہے روشن میں تمہاری زندگی میں کسی قسم کے فیصلے نہیں کرنا چاہتا۔"

وہ اٹھی اور میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اس کے عورت پن کی خوشبو میرے اس قدر قریب تھی کہ میں اس خوشبو کی وجہ سے ہی اپنے فیصلے بدل سکتا تھا۔

"آپ قانونی طور پر میرے شوہر ہیں آپ کا حق ہے میرے فیصلے بدلنے کا۔"

میں اٹھ کر سدخوں والی کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔پھر میں زور سے کھانسا اور تھوک دور پھینک کر عجیب لذت محسوس کی۔

"دیکھو اگر تمہارے خط آسانی سے سوچی دروازے آسکتے ہیں تو وہی جگہ اچھی ہے ورنہ "

"میں پھوپھی جان کے جا سکتی ہوں گلبرگ میں وہ   وہ ماڈرن ہیں اور افتخار کو پسند کرتی ہیں۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

شام کو میں روشن کو لے کر پھوپھی جان کے گھر پہنچا وہاں روشن اور میرے لیے ڈبل بیڈ والا کمرہ مخصوص تھا اس ڈبل بیڈ کو دیکھ کر میں بدکے ہوئے گھوڑے کی طرح باہر کو بھاگا۔ میں روشن سے مل کر بھی نہ آیا۔ بلکہ پھوپھی جان پینٹری میں ٹرے سجاتی رہ گئیں اور میں باہر نکل گیا۔ عین کوٹھی کے باہر جس وقت میں موٹر سائیکل موڑنے کی کوشش میں تھا ایک لمبی سفید کار رکی اور ہارن بجا۔ گو میں حاضر نہیں تھا۔ پھر بھی وہیل پر دونوں ہاتھ زور رکھنے والا مجھے جانا پہچانا نظر آیا۔

"سہیل!.... سر"

پروفیسر نے دروازہ کھولا میں نے موٹر سائیکل چھوڑی اور پھر ہم دونوں شدت سے بغل گیر ہو گئے۔

سہیل نے فرنچ کٹ داڑھی اور موٹے شیشوں کی ڈگ عینک پہن رکھی تھی اس کے جسم پر سرخ چیک کی قمیض تھی جس کی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی تھیں اور قمیض کے تین بٹن کھلے تھے اس کی جینز موری بند تھی اور کلائی پر ڈھیل گھڑی تھی۔ جس کا سیکنڈ کا پھول ہر سیکنڈ کے بعد بدلتا جاتا تھا وہ سارا کا سارا آفٹر شیو لوشن سے مہکا ہوا تھا۔

"یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے کوجیک؟" اس نے امریکہ کے مشہور گنجے ایکٹر کے نام سے مجھے پکارا۔

"بس ایسے ہی؟.... سر۔"

یہاں کہاں پھر رہے ہو میری چچی کے گھر۔؟

"اپنی بیوی جمع کروانے آیا تھا۔"

''تو ہو گیا پڑا ختم ہو گئی تلاش کچھ نہ ملا زندگی میں ؟''

یں نے اپنی موٹر سائیکل وہیں پورچ میں رکھا اور ہم دونوں وارث روڈ چلے گئے بڑی دیر سہیل مجھے امریکہ کے متعلق بتاتا رہا۔

''وہ ملک بھی کھوکھلا ہو گیا ہے انسانوں کی طرح ملک اور قومیں بھی ہمیشہ اپنی کمزوریوں کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی خوبیوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتی ہیں ''ہمیشہ کی طرح وہ بہت چمکدار اور ذہین تھا اس کے چہرے پر تمام تر امریکی چھاپ تھی۔

''کیسے؟ ''

''خوبی وہ چیز ہے جس پر انسان خود اعتماد کرتا ہے جس کی وجہ سے دوسرے لوگ اس کی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ یہ خوبی اس کی اصلی اچھائیوں کو کھانے لگتی ہے اسی خوبی کی وجہ سے اس میں تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ اسی خوبی کے باعث وہ انسانیت سے گرنے لگتا ہے فرد قومیں سب اپنی خوبیوں کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں۔''

ہم دونوں وارث روڈ کی ایک بہت پرانی کوٹھی میں بیٹھے تھے اس کی چھتیں اینٹوں کی تھیں اور باہر دل گیر ورنگ پھرا ہوا تھا گیٹ پر بوگن ویلا کی بیل کاسنی پھولوں سے لدی تھی۔ گھر کے پچھواڑے بے مسلسل کوئی ہلکہ چل رہا تھا جس کی مدھم آواز آئے جا رہی تھی۔ کمرے میں پرانا فرنیچر، بوسیدہ پردے اور کین کا صوفہ تھا ایک قالین جو کبھی ایرانی ہوگا۔ اب فرش سے چپکی ہوئی دری نظر آ رہا تھا کھڑکیوں میں دھول سے اٹے کاغذی پھول تھے۔ سہیل کے خالو کا گھر تھا اور وہ امریکہ سے ایک مہینے کی چھٹی پر صرف رشتہ داروں سے ملنے آیا تھا۔

بہت ٹھہر ٹھہر کر سوچتے ہوئے میں نے پروفیسر سہیل سے اپنے موجودہ حالات کہے وہ چپ رہا۔

''پھر؟ ''

"پھر کیا؟" میں نے جواب دیا

"پھر کیا ارادہ کیا ہے؟"

میں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا اس نے کوئی مشورہ نہ دیا۔

"میں میں سارا وقت سوچتا رہتا ہوں سر کہ انسان کی روح کہاں جاتی ہے؟ موت کیا ہے؟ کیا موت سے ہمکنار ہوئے بغیر آدمی کبھی آزاد ہو سکتا ہے؟ مکمل آزاد ....."

کتل ایک ماڈرن کیپسول سا زرد ولی تھا۔ اس کی آنکھوں میں توجہ کی ایسی شعاعیں تھیں جو ماڈرن تعلیم یافتہ آدمی کا سینہ شق کر کے اس پر اثر انداز ہو سکتی تھیں اور اس کے باوجود پے گریڈ اپنے اپنے مستقبل کے لیے بڑی جدوجہد کرتا رہتا تھا۔

"آپ تو امریکہ سے آرہے ہیں وہ لوگ تو آج کل E.S.P پر بہت ریسرچ کر رہے ہیں آپ کا کیا خیال ہے کیا روح واقعی کوئی چیز ہے؟ کیا کیا انسان واقعی موت کے دروازے سے نکل کر کہیں جاتا ہے کیا مابعد واقعی ہے؟"

"مغرب والے ابھی ابتدائی کوششوں میں ہیں مسمرازم ہپناٹزم اور سپر چوازم جیسی کچھ میں نے وہاں دیکھی ہے یہ ایک طرح سے Conseutration کے کرشمے ہیں تصور اور خیال کی مشق سے بہت کچھ حاصل ہو جاتا ہے لیکن عالم ناسوت سے یہ لوگ آگے نہیں بڑھتے تمہیں اگر شوق ہو تو ایک بزرگ سے ملا دوں گا وہ تصور اسم ذات سے اگلی دنیا کھولتے ہیں جس سے انسان عالم ناسوت سے پرواز کرتا عالم ملکوت جبروت اور لاہوت میں جا داخل ہوتا ہے دراصل عالم ناسوت میں جن رہتے ہیں خبیث روحیں رہتی ہیں اس لیے یہاں بہت خطرات ہوتے ہیں کئی بار شیاطین ہمیں نفس کے رفیق بن جاتے ہیں اور روح آگے نہیں بڑھ سکتی۔"

میں فرنچ کٹ داڑھی والے ماڈرن پروفیسر کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ میری مدد کر سکتے ہیں سر روح کے سفر میں۔"

"میں تو تمہاری مدد نہیں کر سکتا ہاں کسی ایسے شخص کی تلاش کی جا سکتی ہے جو تمہاری اعانت کر سکے یہ جو آسٹرل باڈی کے سفر ہیں اور جادوگروں کی ساحری ہے یہ سب ہمزاد کے کرشمے ہیں ان کا روح کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہمزاد چونکہ ساری عمر انسان کے ساتھ رہتا ہے انسان کی کوئی بات اس سے چھپی نہیں ہوتی جب حاضرات بڑے جاتے ہیں یا روحیں حاضر کی جاتی ہیں تو یہی ہمزاد حاضر ہوتا ہے۔یہی ماضی کے واقعات بیان کرتا ہے۔

میں نے سوالوں کا طومار باندھ دیا۔"

"میں زیادہ نہیں جانتا قیوم میں خود تلاش میں ہوں تمہاری طرح راہرو ہوں دیکھو اگر تمہیں کوئی راستہ مل جائے تو مجھے اطلاع دے دینا مجھے خبر ہوگئی تو میں تمہیں انگلی پکڑ کر لے چلوں گا وہاں بھی بہت چھان بین کی میں نے لیکن کوئی راستہ نہیں ملا وہ لوگ بھی تلاش میں ہیں بہت صوفی سنٹر کھل گئے ہیں کئی بھگتی آشرم ہیں ان گنت ادارے ہیں Protetant,baptist لیکن ابھی کامل یقین کا وقت نہیں آیا نہ یہاں نہ وہاں "

میں بہت پریشان تھا میرے اندر کی آگ اب بہت بھڑک گئی تھی۔

"کسی طرح آپ میری ملاقات کسی روح سے نہیں کرا سکتے میرے ابا کی روح سے میری ماں کی روح وہ وہ وہ مجھے اس کرب سے نجات دلا سکتے ہیں۔"

پتہ نہیں کیوں میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"میں کچھ نہیں جانتا قیوم کچھ تھوڑی سے سوجھ بوجھ آگئی ہے لیکن صرف کتابوں سے مجھے عینی یقین حاصل نہیں۔بس میرے تمام علم کی طرح یہ بھی ایک Academic research ہے لیکن میں تلاش میں ہوں۔"

اس وقت پروفیسر سہیل سے ملنے تین جوان یونیورسٹی سے آگئے انہوں نے ر

تھوڑی سی باتیں کیں پھر تینوں نے سگریٹ بجھا دیے۔ ایک میز پر ایک بڑا شیشہ رکھا گیا۔ درمیان میں گلاس پر کنیل اور وولڑکوں نے انگلیاں رکھ دیں اور کمرے کے پردے برابر کر کے صرف ایک موم بتی روشن کر دی گئی۔

اب روحیں بلانے کا عمل شروع ہوا۔

"کوئی روح جو ادھر سے گزر رہی ہو۔ گلاس میں آ جائے اور گلاس ہلا کر اپنے وجود کا یقین دلائے۔" انگریزی میں کنیل نے کہا۔

ابھی کنیل کا ستدعا کرتے ایک آدھ منٹ ہی گزرا تھا کہ گلاس ادھر ادھر سرکنے لگا۔

"آپ کس کی روح ہیں۔"

"میں رائیو گرینڈ کے کنارے رہنے والا ایک برو جو ہوں۔" روح نے مختلف الفاظ پر ہجے کیے۔

"آپ کو مرے کتنے سال ہوئے ہیں۔"

"جب راپ پورٹ کے قریب اپاشی قبیلے کی جنگ ہوئی تھی تو میں ایک انگریز کی گولی سے مارا گیا تھا۔"

"دنیا کا مستقبل کیسا ہے؟"

"تاریک!....."

"کیوں؟....."

"ہوپی قبیلے کی پیش گوئی کے مطابق شمال مشرق سے آنے والے ایک ایسا کدو ایجاد کریں گے جس میں راکھ ہو گی جب وہ کدو ہوا میں اچھالیں گے تو دنیا نیست و نابود ہو جائے گی۔"

کنیل نے گلاس میز سے اٹھا کر اس میں پھونک ماردی اور پھر ایک نئی روح کو

بلایا۔

''ہم سینٹ فرانسس آف اسسی کو بلانا چاہتے ہیں'' سہیل نے کہا

''کیوں؟'' نئی روح نے سوال کیا۔

''ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہم کیا کریں۔ انسان کی فلاح کس میں ہے۔''

''غریبی، عصمت اور اطاعت میں'' روح نے جواب دیا۔

''ہمیں سینٹ فرانسس بلا دو۔''

''وہ نہیں آ سکتے۔''

''کیوں کیوں؟'' سب چلائے۔

''وہ جس عالم میں ہیں وہاں سے آیا نہیں جاتا۔''

مجھ پر اس مشغلے کا عجیب اثر ہوا۔ میں سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگ گیا۔ اور میرے معدے میں شدید جلن اٹھی۔

''سہیل میرے اباجی کو میرے اباجی کو بلاؤ''

سہیل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میری آنکھوں میں دیکھ کر بولا ''وہ نہیں آ سکتے قیوم میں تمہیں بتا چکا ہوں یہاں صرف عالم ناسوت سے پیغامبر آتے ہیں۔''

نوجوانوں نے شیشہ اور گلاس ایک طرف رکھ دیے اور سگریٹ پینے لگے۔ اب گفتگو امریکہ کی جنسی زندگی کی طرف مڑ گئی۔ ابھی چند لمحے پہلے جو لوگ ارواح سے ناطہ جوڑنے میں مگن تھے بڑے تپاک سے مغرب کی جنسی زندگی کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔ سہیل انہیں گروپ شادیوں کے متعلق کی رنگ سوسائٹی وائف سوپنگ۔ سیکس شاپ اور بلیو فلموں کے متعلق تفصیل سے بتا رہا تھا اس وقت وہ اس قدر چسکے لے کر باتیں کر رہا تھا کہ مجھے شبہ ہوا وہ امریکہ میں سٹڈی ٹور نہیں کر رہا بلکہ امریکہ کی انڈر ورلڈ میں مافیا کا جیتا جاگتا حصہ ہے۔ وہ امریکی لڑکیوں کے متعلق

ایسی نفرمیشن دے رہا تھا جو پلے ہوائے رسالوں میں بھی ملنی مشکل ہے اس کی باتوں میں پوری اشتعال انگیزی تھی اور وہ اس وقت مجھے ایسا شیطان لگ رہا تھا جس کے سر پر چھوٹے چھوٹے خرگوش جیسے کان ہوتے ہیں رات گئے تک وہ تینوں نوجوان بیٹھے رہے پاکستان کی ملکی سیاسی حالات روس اور امریکہ کی خارجی پالیسی خاص کر تھرڈ ورلڈ میں ان کی حیثیت اور خود ساختہ ایمپائیر کے فرائض کی تشریح اسدمی اخوت اور ملت کا مستقبل تعلیمی مسائل ابلاغ کی حالت دریا غیر میں اور مقامی پبلکس میں، لڑکیوں کی آزادی اور پیشہ طلبی ملازمتوں میں گریڈ کی اونچ نیچ مہنگائی موسم فیشن بہت کچھ زیر بحث رہا۔ پروفیسر سہیل بے تکان اور بڑے سلیقے سے بات کرنے کا عادی تھا وہ جب بھی بات کرتا ایسے جیسے لکڑی میں ایک ہی ہتھوڑے سے کیل اندر دھنس جائے، وہ پہلے موضوع کو دوسرے آدمی کے سامنے پھینک دیتا چھوڑنے کے بعد جب موضوع اس تک پہنچتا تو وہ اسے غلیل کے ربڑ کی طرح کھینچ کر تان کر نشانہ باندھتا اس میں دوسرے کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کی اہلیت تھی بلکہ قائل کرنے کا، وہ تھا وہ بحث میں الجھے بغیر گفتگو کو مناظرے کی شکل نہ دیتے ہوئے اپنا مطلب منوانے میں کامیاب ہو جاتا اور یہی اس کی گفتگو کا خوبصورت ڈھنگ تھا جس کی بدولت وہ مختلف محفلوں میں اچانک چمکنے لگتا اور رفتہ رفتہ چھا جاتا رات گئے جب وہ مجھے لے کے باہر نکلا تو پورا چاند چمک رہا تھا۔

"آؤ چلیں۔"

"میں چلا جاؤں گا سر" میں نے اصرار کیا۔

"کیسے جاؤ گے تمہاری موٹر سائیکل تو وہیں رہ گئی۔"

پہلی بار مجھے خیال آیا کہ اپنی موٹر سائیکل کو ساتھ نہ لانا بہت بڑی احمق پن تھا۔

"بیٹھو اور اندر سے اس قدر کس کر مت رہا کرو۔ relax relax رات کے ڈھائی بجے میں پھوپھی کے گھر پہنچا۔ کار جس وقت پھاٹک تک پہنچی دو بڑے بڑے

السیشن کتے اندر سے بھونکتے اور بھاگتے ہوئے آئے اور پھاٹک کے اوپر پاؤں رکھ کر بھونکنے لگے۔ کافی دیر تک اندر سے کوئی نہ آیا۔ ہم دونوں بھی کتوں کی وجہ سے کار کے اندر ہی بیٹھے رہے پھر بوڑھا خانساماں اور روشن برآمدے میں آئے پیچھے پورچ کی دو بتیاں روشن ہوئیں پھر خانساماں اور روشن گھر کے پھاٹک کی طرف آئے خانساماں نے دونوں کتوں کو گلے کے پٹے سے پکڑا اور اندر لے گیا۔ روشن میری طرف بڑھتی آئی میں نے پروفیسر سوہنل سے خدا حافظ کہا اور اندر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

''افسوس میں موٹر سائیکل یہیں چھوڑ گیا ورنہ یہاں نہ آتا۔''

''اچھا ہوا کہ کہ آپ آگئے پھوپھی جان بار بار پوچھ رہی تھیں۔''

''کیا۔؟''

''کچھ نہیں جی بس یہی۔''

ہم دونوں چپ چاپ اندر کی طرف چلے۔

ڈبل بیڈ پر لیٹنے سے پہلے اس نے اونچی آواز میں کہا

''افتخار کا خط ہے آپ دیکھ لیں۔''

میں غسل خانے کے اندر روشن کے برش سے دانت صاف کر رہا تھا۔

''اسے رکھو ''میں نے اندر سے کہا۔

''آپ پڑھ لیں جی۔''

باہر آ کر میں نے سعودی عرب کا نیلا ایروگرام کھولا لکھا تھا۔

ہم دونوں چپ ہو گئے پھر کچھ دیر بعد وہ ڈبل بیڈ کے ایک کنارے اور میں دوسرے کنارے پر لیٹ گئے۔ اب بھی ہم میں دو بازو بھر فاصلہ تھا بتیاں بجھا دی گئیں تو پچھلی کھڑکی سے پوری چاند کی روشنی اندر آنے لگی۔

''آپ کو روشنی بری لگتی ہو تو کھڑکی کے آگے پردہ کر دوں ؟ روشن نے بڑی

دیر کے بعد پوچھا۔"

"نہیں ٹھیک ہے۔"

ہم دونوں ہمیشہ ایک ہی کمرے میں رہے تھے لیکن ہمارے پلنگ ہمیشہ علیحدہ تھے اس ڈبل بیڈ نے دوری اور نزدیکی کا ایک اور بکھیڑا کھڑا کر دیا۔

بڑی دیر بعد میں نے سوال کیا تمہارا پاسپورٹ تیار ہے؟"

"ہاں جی وہ تو وہ تو افتخار نے جانے سے پہلے بنوا دیا تھا۔"

"اچھا۔"

پھر ہم دونوں میں خاموشی چھا گئی۔

"اگر تم کو کوئی خرید و فروخت کرنا ہو تو پیسے مجھ سے لے لینا۔"

"نہیں جی۔"

بڑی دیر تک وہ آنکھیں کھولے چھت کو دیکھتی رہی میں نے کروٹ بدل دی۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں غسل خانے کی بتی جلا لوں۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"ضرور۔"

اس کے بعد میں نے سر کے نیچے سے تکیہ اٹھایا اور اپنے چہرہ پر لے لیا مجھے معلوم نہیں وہ چاندرات میں غسل خانے کی بتی جلا کر جاگتی رہی کہ سو گئی۔

پکی سڑک کے کنارے پروفیسر سہیل نے گاڑی پارک کر دی اور ہم سائیں جی کے ڈیرے کی طرف پیدل چلنے لگے۔ یہ ڈیرہ پکی سڑک سے قریباً پونے دو میل دور تھا راستے میں ایک نہر کئی کھیت کیکر کے درختوں کے جھنڈ پرانے بے آب و بھٹے مٹی کے ٹیلے و رجھاڑیوں آئیں۔ سارا راستہ سائیں جی کے کشف و کرامات کے متعلق بتاتا رہا امریکہ پلٹ سہیل پوری عقیدت سے سائیں جی کا معترف ہو رہا تھا۔

"وہ چاہیں تو موت کا حجاج اٹھا کر تمہیں ادھر کی دنیا کا رخ دکھا سکتے ہیں۔"

”تمہاری پریشانی کا حل کتابوں سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ میں بھی سمجھتا تھا کہ مجھے کتابوں سے کوئی راستہ مل سکتا ہے لیکن جب تک سائیں جی کے ڈیرے پر نہیں پہنچا میری پریشانیوں کا حل نہیں ملا۔“

”تو کیا اب آپ Anxiety سے آزاد ہو چکے ہیں سر؟“

”نہیں ......“

”تو پھر حاصل؟ ......“

”انسان کو دنیا میں ایک سب سے بڑی پریشانی ہے تھیم وہ پائید رہنا چاہتا ہے اور موت کے ہوتے ہوئے وہ کبھی مستقل نہیں ہو سکتا۔ انسان کی ہر پریشانی کا تجزیہ کرو اصل میں پریشانی موت سے پیدا ہوتی ہے آرزو کی موت راحت و خوشی کی مرگ دیکھو تو آدمی ہر وقت مرتا رہتا ہے بدن کی موت تو آخری فل سٹاپ ہے موت کی جھلکیاں چھوٹی موٹی ملاقات تو روز ہوتی ہے موت سے۔“

”مجھے اب یہ سلسلہ نہیں چاہیے پروفیسر سہیل میرا خیال ہے زیادہ سوچ نے میری زندگی میں ہار دو بھر دیا ہے۔“

”سائیں جی سے ملو گے تو پتہ چلے گا موت کچھ نہیں ہے وہ پردہ اٹھا کر دکھا دیں گے کہ کیسے انسان اس جسم کو چھوڑنے کے بعد پھر ابدی زندگی پا لیتا ہے جنت وہ جگہ ہے جہاں خوشیاں کی موت نہیں آرزو کی مرگ نہیں موت نہ ہوتی موت کا شعور نہ ہوتا تو آدمی کبھی غم سے آشنا نہ ہوتا دیوانہ نہ ہوتا!“

”وہ مجھے ابا کی روح سے ملا دیں گے۔“

وہ پتہ نہیں کیوں مجھ سے نظریں چرانے لگا۔

ڈیرے پر مکمل خاموشی تھی کھلا احاطہ تھا جس میں ایک طرف چھوٹی سی کچی مسجد تھی مسجد کے احاطے میں چٹائیوں پر دو سفید ریش بزرگ بیٹھے کھجور کی گٹھلیاں ہاتھوں میں لیے ذکر میں مشغول تھے۔ ایک ہرا جھنڈا سائیں جی کے کوٹھے پر لہرا رہا تھا

سارے میں گرمیوں کی دوپہر چھائی تھی۔ ڈیرے پر کوئی درخت نہ تھا پھر بھی کہیں سے کوئل کی آواز گردو نواح آسمان کو چیر کر پہنچ رہی تھی۔ سائیں جی کے کچے کوٹھے میں ٹھنڈک اور شانتی تھی وہ کھجور صف پر کہنی کے بل نیم دراز تھے اور ان کا ایک مرید کھجور پنکھے سے انہیں جھل دے رہا تھا کمرے میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے چند لمحے تک کچھ نظر نہ آیا۔ سائیں جی کا مشفق چہرہ اور لمبی سفید ریش بہت بعد میں نظر آئی۔

"آؤ بیٹھو بیٹھو آج تو بڑے بڑے لوگ آئے ہیں۔"

سائیں جی آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے، اب کے جسم پر تہمد کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ چھاتی کے سفید بال سینے کو ڈھانپے چمک رہے تھے۔

"جا بھائی ان کے لیے چائے لا۔"

مرید نے پنکھا چھوڑا اور حق سائیں کہہ کر ڈیرے سے نکل گیا پتہ نہیں چائے کہاں پکتی تھی کیونکہ بظاہر نہ کہیں دھواں تھا نہ چولہا۔ مجھے لگا جیسے ڈیرے پر ہمزاد پکی پکائی چیزیں اتارتے ہوں۔

"آرام سے کھلے ہو کر بیٹھیں" سائیں جی نے مجھے کہا اور پھر کتنی ہی دیر اللہ اللہ کرتے رہے۔ گجراتی پیالوں میں گرم گرم چائے آ گئی۔ کچھ عرصہ بعد تندوری روٹیاں مکھن اور مچھلی کا طشت لے کر ایک اور مرید حاضر ہو گیا۔

"لنگر کریں لنگر میں برکت ہوتی ہے۔"

ہم مودب انداز میں کھانا کھانے لگے۔ میں خاموش تھا لیکن ڈاکٹر سہیل سلوک کی مختلف منزلوں پر سائیں جی سے تبادلہ خیال کر رہا تھا گفتگو میں خاص ٹیکنیکل توجیہات کی وجہ سے بات میری سمجھ سے بالا تر تھی۔

"یہ تو آپ کے دوست دعوت الارواح کی مجالس میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔"

"جی میں اپنے باپ کی روح سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"بیٹا اگر یہ فقط تجسس کے لیے ہے تو باز رہو اگر باطنی فتح کی خاطر مطلوب ہے روح کی رویت چاہتے ہو تو ہم راستہ بتا دیں گے۔"

"کیسے؟ حضور کیسے؟ سائیں جی میں بہت بے قرار رہتا ہوں۔"

"خواب میں چاہو تو خواب میں۔ مراقبے میں استغراق میں چاہو تو ویسے عالم بیداری میں روح کو مجسم دیکھنا چاہو تو اس طرح۔"

"کیا روح دوبارہ جسم میں آ سکتی ہے سائیں جی۔"

"روح دوبارہ جسم میں نہیں آتی۔ لیکن جس صورت میں متشکل۔ ہونا چاہے ہو سکتی ہے۔ مد نگہ جنات بھی یہ قدرت رکھتے ہیں لیکن بیٹا یکسوئی شرط ہے۔"

"یکسوئی کی کوشش کروں گا تو سائیں جی" میں ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"ہم تم کو ایک طریقہ بتاتے ہیں اسم ذات کسی کاغذ پر لکھ پر دیوار پر ٹانگ لینا ایسے کہ تمہاری نظریں اس کے متوازی ہوں پھر آرام دہ تکیے سے ٹیک لگا کر اس کو دیکھنا ور پاس انفاس جاری رکھنا روز بلا ناغہ پہلے پانچ منٹ پھر ہر دن کے ساتھ ساتھ ایک منٹ اور ظلمات بشری جب دور ہونے لگیں گے تو خود بخود عالم ملکوت کا راستہ کھلے گا۔"

میں نے اس سے پاس انفاس کا طریقہ سیکھا بڑی دیر تک اس عمل کا تجزیہ ہوتا رہا کہ لا کیسے کہا جائے اور الا اللہ کی ضرب کیسے قلب پر جاری کی جائے۔

کچھ دیر کے بے سائیں جی نے مجھے پاس انفاس کا ورد پریکٹیکل شکل میں کر کے دکھایا۔

"کتنے دن یہ عمل جاری رکھنا ہو گا سائیں جی۔"

سائیں جی ہلکا مسکرائے۔ کڑی دھوپ میں جیسے نیم کی ٹہنی چھو دوں۔

"بیٹا یہ تو سالک کی اپنی لگن پر منحصر ہے کچھ لوگ دنوں کی منزل سالوں میں طے کرتے ہیں کچھ سالوں کو لمحوں میں پار کر جاتے ہیں او نگھنے سونے یا سستی کرنے سے

راستہ کھوٹا ہوتا ہے جب یہ مشق ہو گی تو اندھیرے میں بھی اسم ذات نظر آنے لگے گا۔ اس وقت تم کسی چیز کو بھی متوجہ کر کے اسے اپنی طرف کھینچنے کی قوت اپنے میں پاؤ گے۔"

یکدم روشن کا شرد چہرہ میری نظروں میں گھوم گیا

"جب یکسوئی کا مرحلہ طے ہو گیا تو پھر قوت ارادی کا عمل بتائیں گے۔ جب یکسوئی تصور اور قوت ارادی مضبوط ہو گئے تو پھر لطیفہ خفی کا مقام کھلے گا۔"

"لطیفہ خفی کا مقام؟" "میں نے لجاجت سے سوال کیا۔

"دو ابروؤں کے درمیان لطیفہ خفی کا مقام ہے۔ جس طرح ناسوتی چیزوں کو دیکھنے کے لیے آنکھ کام دیتی ہے جب باطنی آنکھ کھلے گی تو روح ملایکہ اور دیگر باطنی اشیاء خود نبی ﷺ نظر آنے لگیں گی۔"

"کیا میری باطنی آنکھ کھل سکے گی؟۔"

"ہاں بھئی کیوں نہیں بچہ جو دیکھتا ہے سمجھتا ہے؟ ارد گرد کے لوگ بتاتے ہیں یہ گھوڑا ہے یہ بلی ہے ایسے ہی ہر آدمی اپنی باطنی آنکھ سے کچھ نہ کچھ کبھی نہ کبھی دیکھتا ہے لیکن سمجھ نہیں سکتا۔ رہنمائی شرط ہے جب یہ مرحلے طے ہو جائیں گے تو ہم تم کو ایسا رو دیتا دیں گے جس سے روح عالم شکل میں آ کر تم سے خود ملے گی ان کی زیارت کے وقت اگر فیض چاہو گے تو کئی منزلیں طے ہو جائیں گی۔ دنیاوی رہنمائی کی آرزو کھو گے تو وہاں اہانت کریں گے۔ لیکن بہتر یہی ہے روحانی فیض حاصل کرو۔"

میں خوفزدہ ہو کر سہیل کی طرف دیکھا "یہ تو بہت لمبا کام ہے سر کون جانے یکسوئی نصیب ہو نہ ہو قوت ارادی مضبوط ہو سکے نہ سکے۔ سائیں جی کوئی چھوٹا راستہ نہیں ہے کوئی شارٹ کٹ۔"

"ہے!۔"

"بتائیے خدا کے لیے بتائیے۔"

"بزدل ہو؟"

"جی کوئی خاص نہیں" شاید ہوں بھی۔"

"اندھیرے سے تو ڈر نہیں لگتا"

"نہیں جی۔"

"شیطانی آوازوں سے تو نہیں گھبراتے؟"

پروفیسر کنول نے میری طرف نظر ڈالی جیسے وہ مجھے روکنا چاہتا تھا۔

"جی نہیں۔"

"تو آؤ میرے ساتھ۔"

ہم دونوں اٹھ کر سائیں جی کے پیچھے پیچھے چلے، وہ ہمیں ڈیرے سے کوئی دو فرلانگ دور لے گئے یہاں مٹی کے اونچے نیچے تودے اور بکائن کی جھاڑیاں تھیں۔ ان ہی ٹیلوں کی رات میں ایک پکی قبر بنی تھی۔ جب ہم قبر کے قریب پہنچے تو نظر آیا کہ قبر کے اندر جانے والی سیڑھیاں صاف نظر آ رہی ہیں جس وقت سائیں جی قبر میں داخل ہوئے اس لمحے پروفیسر کنول نے خوف سے میری جانب دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن میں دور تک فیصلہ کر چکا تھا اس لیے آہستہ آہستہ سائیں جی کے پیچھے پیچھے اترنے لگا آٹھ سات سیڑھیاں اتر کر ہم قبر کے اندر پہنچے تو گھپ اندھیرا تھا نم مٹی کی خوشبو آ رہی تھی اور باہر کی نسبت اندر ٹھنڈک تھی۔

سائیں جی نے اندر جا کر ماچس جلائی اندھی کھوہ میں لپی بڑی نفاست سے کی ہوئی تھی اور ایک طاقچے میں قرآن کریم ریشمی کپڑے میں ملفوف دھرا تھا سائیں جی نے موم بتی روشن کر کے طاقچے میں رکھ دی کیونکہ قبر کے اندر کھڑے ہونے کی جگہ نہ تھی اس لیے ہم کمریں جھکا کر ایستادہ تھے۔

"بیٹھ جاؤ۔"

ہم دونوں بچے ہوئے فرش پر سائیں جی کے پاس بیٹھ گئے۔

''یہ ہماری قبر ہے یہاں ہر رات ہم قرآن کریم کی تلاوت کرنے کے لیے آتے ہیں اور اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں حاضری دیتے ہیں۔''

آپ کے پیر و مرشد بھی یہاں آتے ہیں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ان کے وصال کو چالیس سال ہو چکے ہیں لیکن یہاں وہ باقاعدگی کے ساتھ ہمیں ہدایت دینے آتے ہیں۔''

''سائیں جی آپ کو یہاں ڈر نہیں لگتا '' پروفیسر سہیل نے سوال کیا۔

''جس بشر کے ساتھ ظلمات بشری ہو اسے ڈر لگتا ہے جس اس جہالت سے نکل جاتا ہے وہ نور ہدایت سے منور رہتا ہے خوف اور بزدلی اسے چھو نہیں سکتی۔''

قبر کی چھت سے نامعلوم سی مٹی چھن چھن کر گر رہی تھی۔

''برخوردار اگر تم کو اپنے والد کی روح سے ملنا ہو تو یہاں مل سکتے ہو۔''

''جانے دو یار '' آہستہ سے سہیل نے کہا۔

''ہاں میں تیار ہوں۔''

''پہلے چار ہفتے تم میرے ساتھ یہاں آؤ گے۔ پھر ایک جمعرات ہم باہر ہوں گے تم اندر ہو گے۔ تم کو اپنے والد کی روح ملنے آئے گی یاد رکھو روح گزند نہیں پہنچاتی۔ لیکن اس کی ہیبت بہت ہوتی ہے ہم باہر ہوں گے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔''

''ٹھیک ہے سائیں جی میں تیار ہوں '' میں نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔

''تم کو اپنے والد کی قبر کا نقشہ یاد ہے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔

چندرا کا سارا گاؤں میری نظروں میں گھوم گیا۔ کلر کھائی زمینیں، دو منزلہ چھوٹا سا اینٹ کی حویلی اماں کا کھلا صحن جس کے ایک طرف دیمک زدہ تخت پوش پڑا تھا۔ اوپر چڑھنے والی گول سیڑھیاں اور چوتھی سیڑھی کی ٹوٹی ہوئی اینٹ مٹی کے ساتھ

بوڑھے گدھ جیسا میرا باپ مجھے تو یہ معلوم نہ تھا کہ ابا زندہ تھا کہ مر گیا؟ اس کی قبر کہیں تھی بھی کہ نہیں؟

"سائیں جی مجھے اپنے والد کی قبر کا نقشہ یاد نہیں"

سائیں جی نے دونوں ابرو اٹھا کر پوچھا "بیٹا پھر زیارت کیسے کرو گے باپ کی قبر کوئی تو یہاں بیٹھ کر یاد کرنا ہو گا۔"

تکمیل نے مجھے کہنی مار کر کہا "کس بکھیڑے میں پڑ گئے ہو چلو"

"بیٹا ملاقات صرف اسی کی ہو سکتی ہے جس کی قبر کا نقشہ ذہن میں ہو۔"

یکدم سیمی میری نظروں میں گھوم گئی پتہ نہیں اتنی دیر میں نے باپ کی رٹ کیوں لگا رکھی تھی؟ مجھے سیمی سے ملنے کی آرزو تھی میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ دنیا کے جھنجھٹ سے نکل کر کیا اب وہ شانتی سے ہے کہ اب بھی اس کی روح لندن کی سڑکوں پر آفتاب کے تعاقب میں بھٹکتی ہے؟ کبھی اسے میرا خیال بھی آیا ہے کہ مرنے کے بعد فروعی تعلقات یاد نہیں رہتے۔؟

"کسی لڑکی کے بارے میں سوچ رہے ہو برخوردار۔؟"

میں نے گھبرا کر سائیں جی کی طرف دیکھا۔

"جی میں اس سے ملنا چاہتا ہوں لیکن مجھے معلوم نہیں وہ کہاں دفن ہے؟"

"ہم تمہیں بتا چکے ہیں قبر کے تصور کے بغیر یہ عمل بیکار ہو گا۔"

افضل؟

افضل کہاں دفن تھی کیا وہ میانی صاحب کے نشیبی علاقے میں دفن تھی کیا راوی کے آس پاس اس کا استھانہ تھا۔

میری ماں؟

ماں کی قبر کا نقشہ بھی مجھے یاد نہ تھا پتہ نہیں اس کی قبر کو کلر چاٹ گیا یا شاید وہ ماں تو تھے بہت کے پتلوں کی طرح مٹی پر بے آسرا ہی پڑی ہو کہیں؟

"سائیں جی کیا سسی مجھے مل سکتی ہے۔"

پروفیسر سہیل نے مجھے کہنی مار کر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"مل تو سکتی ہے بیٹا لیکن اس کی قبر کا تصور تو لانا پڑے گا ذہن میں۔"

میں نے سر جھکالیا آخری بار جب میں نے اسے چھوڑا تو وہ ہسپتال کے لال کمبل میں لپٹی ہوئی تھی۔

"اچھا سائیں جی اجازت دیں؟"

پروفیسر سہیل اٹھ کھڑا ہوا اور ہم دونوں قبر سے باہر نکلنے لگے۔

"اچھا بیٹا تم کل آنا ہم تمہارے لیے کچھ سوچیں گے۔"

واپسی پر پروفیسر سہیل نے کار بہت تیز چلائی اور کئی جگہوں پر بریکیں لگائیں۔ وہ بہت مضطرب تھا، وارث روڈ کی کوٹھی میں داخل ہونے کے بجائے اس نے گیٹ کے سامنے کار پارک کر لی پارکنگ لائٹز کی وجہ سے سڑک پر ہلکا سا چانن ہو گیا۔ پھر اچانک ایک بوسیدہ عمارت کے پیچھے سے پورا چاند رسی ٹاپتا سامنے آ گیا ہمیں دیکھتے ہی اس نے اپنی رسی دائرے کی شکل میں اپنے گرد پھیلائی اور ساکت ہو گیا۔

"یہ تم بار بار سسی سے ملنے کی آرزو کیوں کر رہے تھے؟"

میرے پاس اس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔

"میں تمہیں بہت لیکچر دیتا رہا ہوں لیکن ابھی تک بہت احمق ہو سٹوڈنٹ سائیں جی برگزیدہ ہستی ہیں کشف و کرامات سے آگے نکلے ہوئے ہیں ایسے بزرگان دین سے سسی ویسی کا ذکر نہیں کرتے۔"

پھر ان سسیوں کا ذکر کن سے کرتے ہیں سر؟ کن سے۔

"مجھ جیسے فری سٹائل پروفیسر سے جو تمہیں دنیا کے علم کے مطابق ایسی باتوں کا حل بتائیں۔"

"پھر بتائیں حل۔؟"

وہ سر کھجانے لگا "گو میں خود بھی الجھا ہوں اس بیبی کے ٹاپک میں لیکن مجھے غلط راستے ملتے رہے ہیں تم میں وہ صلاحیت نہیں ہے۔"

مجھے کوثر یاد آگئی اسی نے مجھے بتایا تھا کہ پروفیسر سہیل بھی بیبی کا گرفتہ رہ چکا ہے۔

"یار یہ لڑکیاں بڑی لعنتی چیز ہیں پتہ نہیں چلتا کہ کہاں اتر چکی ہیں تمہارے اندر خاص کر بیبی شاہ تو بہت ہی دور تک اترنے والی تھی نا؟"

"تھی جی بہت"

"بیچارے پروفیسر بھی کیا کریں وہ بھی جب کہ وہ عمر میں اپنے طالب علموں سے کچھ ہی سال بڑے ہوں۔"

میں حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

"پروفیسر کی شان یہ ہے کہ باپ بن کر رہے گرو بن کر رہے اور لڑکی یہ چاہتی ہے کہ پروفیسر سر پر راکھ ڈال کر پیچھے پیچھے چلے لعنت ہے اس مخلوط تعلیم پر!"

"سہیل اور میں بہت دیر کار میں بیٹھے باتیں کرتے رہے امریکہ سے واپسی پر وہ میرا پروفیسر نہیں رہا تھا دوست بن گیا تھا۔ ایک طرح سے دوست تو وہ شروع دن سے تھا لیکن اب وہ مراتب کا لحاظ بھی جاتا رہا تھا۔ جب ہم دونوں نے تیسری ڈبیہ سگریٹ کی شروع کی تو سہیل بولا یار لڑکی آخر چیز کیا ہے کچھ سمجھنے نہیں دیتی۔ کہیں جینے نہیں دیتی۔ ہمیشہ ہر سوال کے سامنے اور ہر جواب کے پیچھے کھڑی ہوتی ہے۔"

میں حیرانی سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔ فرنچ کٹ داڑھی اور سرخ چیک کی بش شرٹ میں یہ نوجوان مجھے کچھ اجنبی سا لگا کبھی اس نے کسی ٹاپک پر ہار نہیں مانی تھی۔

"آج تک ہمیشہ تم نے اپنی مشکلات کا مجھ سے ذکر کیا ہے آج میں تمہیں اپنے اندر کی زندگی کے متعلق کچھ بتاؤں گا۔"

بڑے تعجب کی بات تھی کہ ابھی تک میں نے کبھی ڈاکٹر سہیل کی زندگی میں دلچسپی نہ لی تھی۔ وہ میرے لیے فقط علم کا Bionic Man تھا بغیر جذبات کے علم اگلنے والا۔

"جب تم لوگ کالج میں داخل ہوئے ہو... اس وقت میں اونچی اڑانوں میں تھا سٹاف روم میں میری باتیں سن کر Extension سے چھٹے ہوئے پروفیسر دنگ رہ جاتے میں علم کے بل بوتے پر ایک بڑا حسین وجمیل فرعون بن گیا تھا اندر سے مجھے کسی کی پروا نہ تھی۔"

"اب ہے سر؟"

"ہاں ہے... اپنی تھیوری کی... یاد ہے رزق حرام کی تھیوری۔"

"خدا کے لیے اسے دوبارہ نہ دوہرانے لگ پڑیں۔"

"نہیں اس کی چنداں ضرورت نہیں میں اپنی کتاب چھاپنے کے لیے امریکہ کے ایک پبلشر سے بات کر رہا ہوں رزق حرام کی تھیوری پر تم سے بات ہوگی لیکن بزبان انگریزی ہوگی۔"

"پھر سر جب ہم داخل ہوئے تب؟"

چاند کی عادت ہے جب بھی راز و نیاز کی باتیں ہو رہی ہوں وہ کسی نہ کسی درخت کی اوٹ سے نکل آتا ہے۔ اور کسی بچھا چھانٹی کی طرح ساری باتیں چوری چوری سنتا رہتا ہے اس وقت بھی پورا چاند وارث روڈ پر نہ جانے کیوں اتلا ہو گیا تھا اور ایک کوٹھی کی تیسری منزل سے پورا لگا ہوا ہماری باتیں سنے جا رہا تھا۔ ایسی لڑکی کی طرح جو اپنے باپ کی موجودگی میں اپنے منگیتر کی رنگین Slides نہیں دیکھ سکتی اور آدھا دروازہ کھول کر اندھیرے میں اپنے چندرماں کو دیوار کی سطح سے شیدا دیکھتی ہے۔

"اتنے سارے علم کے باوجود اتنی بے اعتنائی دکھانے پر بھی وہ یسیٰ شاہ میرے دل میں گھستی چلی گئی میرے دل میں اگر علم کا تکبر اتنا نہ ہوتا تو شاید میں اسے لے اڑتا لیکن علم خود ایک حجاب ہے میرا خیال تھا کہ وہ میرے سامنے زانو ٹیک دے گی لیکن ابھی میں اپنے علم کو آگ نہیں لگا سکا تھا کہ آفتاب درمیان میں کود آیا۔ اس کے پاس وہ سب کچھ تھا جو کوئی عورت پسند کرتی ہے تھا نا "

"تھا سر " میں ہکا بکا اسے دیکھ رہا تھا۔

"تم سب حیران تھے کہ کہ یسیٰ شاہ اچانک کالج کیوں چھوڑ گئی اور آفتاب نے اس سے شادی کیوں کر کی یہ بات تمہارے لیے معمہ تھی ؟"

"اب بھی ہے۔"

"وجہ میں تھا میں برا آدمی نہیں ہوں۔ devil نہیں ہوں مائی ڈیر سٹوڈنٹ لیکن اتنے سارے علم کے باوجود میں اپنے Emotions پر قابو نہ پا سکا ان دنوں میں اس قدر شدید حسد کا شکار ہو گیا کہ تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے آفتاب مجھ سے بہت متاثر تھا میں طالب علموں کو متاثر کیے بغیر اپنی نوکری کو حلال ہی نہیں سمجھتا۔"

"مجھے یاد ہے سر وہ سارا وقت آپ کی مالا جپتا تھا۔"

"جیسے تم مجھ سے متاثر ہو سہیل نے دھواں چھوڑ کر کہا لیکن تم دونوں مجھ سے نہیں میرے علم سے متاثر تھے۔"

"بس دو شام میں آفتاب نے میرے ساتھ ہوٹل میں گزاریں اور پھر اسے یسیٰ سے محبت ہو رہی ہو گی لیکن وہ یسیٰ سے شادی پر رضامند نہ رہا میں نے اسے بدل کر دیا یسیٰ سے۔"

"آپ نے آپ وجہ تھے " مجھے وہ ساری باتیں یاد آ رہی تھیں جو شادی کے دن آفتاب نے مجھ سے تالاب کنارے کی تھیں وہ ساری گفتگو پروفیسر سہیل

سے ... تھی

''ہاں میں ہی وجہ بنا میں سبھی میری طرف رجوع میں مائل تھی
لیکن آفتاب کو میں نے یقین دلا دیا کہ وہ کسی ایک مرد کے ساتھ خوش نہیں رہ سکے گی
سبھی میں محبت تو تھی وفا نہیں تھی۔''

''یہ آپ نے کیا کیا؟ وہ تو سر سے پاؤں تک وفا تھی سر اس نے تو
آفتاب کے لیے جان دے دی۔''

کنول نے بالوں میں ہاتھ پھیر کر کہا ''ہاں یہ میں نے کیا کیا قیوم بہت
دیر میں اس guilt میں مبتلا رہا لیکن اب نہیں بہت سے راستے کھلے ہیں مجھ پر
اس احساس جرم کا دروازہ کھلنے کی وجہ سے بہت کچھ عطا کیا ہے مجھے اس
guilt نے۔ اب میں علم کا تعاقب حلم اور انکساری سے کرتا ہوں پہلے میں اسے تلوار
کی طرح استعمال کرتا تھا۔ میں کھاتے پیتے گھرانے کا فرد تھا مجھے طبقاتی احساس
کمتری نہ تھا چہرہ مہرہ بھی قابل قبول تھا اس لیے یہ احساس کمتری پیدا نہ ہو سکا
شکر ہے جوانی میں guilt کا زہر رگوں میں اتر گیا ورنہ اپنے عہد کا پورا شیطان
ہوتا مجھے بھی اس guilt نے بڑی مار دی ہے۔''

ہم دونوں چپ ہو گئے بہت دیر چپ رہے۔

''

پتہ نہیں آفتاب کا کیا حال ہے؟ وہ کہاں پہنچا ہے اگر کبھی وہ تمہیں مل جائے تو مجھے
امریکہ خط ضرور لکھنا میں چاہتا ہوں کہ وہ خوش رہے جاتے علم کی وجہ سے ہم تو خوش نہیں رہ
سکے۔''

''کب جا رہے ہیں آپ واپس؟''

''پرسوں ایک مہینے کی تو چھٹی تھی۔''

''اتنی جلدی۔''

اس نے میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر کہا "یار وقت کی حیثیت کیا ہے؟ نہ گزرنا چاہے تو گزارا نہیں جا سکتا گزرنا چاہے تو یوں جاتا ہے یوں۔"

میں آخری بار ان کا چہرہ دیکھا اور بولا "کیا آپ کو علم نہ تھا کہ آپ دو زندگیوں سے کھیل رہے ہیں؟ اتنے سارے فلسفے اتنے سارے علم کے باوجود۔"

"ہاں اتنے سارے علم کے باوجود میں اپنے فعل پر قادر نہ تھا یہ علم کا سب سے بڑا المیہ ہے میرا نہیں"

میں کار سے اترا تو اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ قوم ہاتھ نہیں ملاؤ دے آخری بار؟"

میں گرم جوشی سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "سر سر سر مائی ڈارلنگ سر۔"

"یقین مانا اس گناہ کے علاوہ میری سلیٹ بالکل پاک ہے اور اب مجھے اس گناہ پر افسوس بھی نہیں شاخیں جب تک کاٹی نہ جائیں درخت تن آور نہیں ہوتا ..."

ہم دونوں دیر تک ہاتھ ملائے ٹھہرے رہے پھر اس نے پورے زور سے Accelerator کو دبایا اور چاندنی رات میں گرد اڑاتا وارث روڈ سے باہر نکل گیا۔ اس وقت گاڑی تیز چلانے کے علاوہ اس کے پاس کوئی اور چارہ نہ تھا!

جس وقت میں روشن کی پھوپھی کے گھر سے نکلا روشن میرے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔

"پھر جی؟"

"تم فکر نہ کرو میں خود افتخار کو لینے ایئرپورٹ جاؤں گا۔"

''اچھا جی۔''

میں کئی دنوں بعد روشن سے ملنے پھوپھی کے گھر گیا تھا۔

وہ میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی اور میں پیچھے دیکھے بغیر اینگل آئرن کے سفید پلنگ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

''میں سوچتی تھی جی کہ ... کہ میں بھی چلتی ائرپورٹ آپ افتخار کو کیسے پہچان سکیں گے۔''

یکدم مجھے خیال آیا کہ واقعی میں افتخار کو کیسے پہچان سکوں گا؟

''آپ تکلیف نہ کریں میں پھوپھی جان کی کار میں وہاں پہنچ جاؤں گی وقت پر۔''

افتخار اپنے گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر پندرہ دنوں کی چھٹی پر آ رہا تھا خطوں میں تی بات طے پا گئی تھی کہ وہ اچانک آئے گا اور کراچی سے ہمیں ٹیلیکس دے کر مطلع کر دے گا۔ اس کے بعد کچھ قانونی کام تھے۔ یعنی افتخار کا روشن کے ساتھ نکاح اور میرا روشن کو طلاق دینا یہ سارے کام نپٹانے کے بعد افتخار کو اپنے گھر موچی دروازے چلے جانا تھا مجھے اپنے گھر ساندہ کلاں میں اور افتخار کی روانگی تک روشن کو وہیں پھوپھی کے گھر ٹھہرنا تھا۔ ساری سکیم میں گھر کی پھوپھی شامل تھی لیکن بار بار اس کا تقاضا ہوتا کہ کہیں بات نکل نہ جائے وہ روشن کی مدد کرنے کو تیار تھی بلکہ مغربی فلمیں دیکھ دیکھ کر اسے حالات میں بڑا مزا اور excitement کا موقع مل رہا تھا لیکن وہ موچی دروازے والے رشتے داروں سے ڈرتی بھی تھی۔ اس لیے تمام معاملے کو چوری چھپے نپٹانے کے در پے تھی۔

جس وقت افتخار کو لینے ایئرپورٹ پہنچا کراچی جانے والی سواریاں انکوائری سے لے کر اندر جانے والے چھوٹے دروازے تک بھری پڑی تھیں گوٹے کے ہار پہنے ہوئے پردیسی اور ان کی برقعہ پوش دار عورتیں ... کراچی سے آنے والی سواریوں کو

خوش آمدید کہنے اور ساتھ لے جانے والے لوگ گرمی کے باوجود سمر سوٹ پہنے ہوئے بزنس مین فیشن ایبل لڑکیاں اور قیمتی بکس اٹھائے ہوئے عورتیں بیوروکریٹ اور ان کے سمسونائیٹ کے بیگ شلوار قمیض کے عوامی لباس میں نوجوانوں کا سرپھرا ایک طبقہ یونیفارم میں ناک پھیرنے والی عورتیں سیکوریٹی کے افسر، سفید وردیوں والے پائیلٹ ہری شلوار آتشی گلابی قمیض اور پرنٹ کے دوپٹوں میں ترتی ہوئی ایئر ہوسٹسیں، ایئرپورٹ دیکھنے کا شوق رکھنے والے بچے نمائشی جسم دکھانے والی دبلی پتلی لڑکیاں سب جگہ لوگ ہی لوگ تھے۔

ایئر ہوسٹس لڑکیاں ان شہروں کے متعلق سوچتی نظر آتی تھیں جہاں سے وہ ابھی آئی تھیں اور جہاں کے لیے انہیں ابھی روانہ ہونا تھا بیوروکریٹ حسب عادت بار بار گھڑی دیکھ کر سامان کے tags کے متعلق سوچ رہے تھے فائلیں، گھریلو الجھنیں سفر کا شیڈول ان کے ذہن اور چہرے پر سوار تھا پائیلٹ سفید موروں کی طرح تر اہٹ سے چل رہے تھے انہیں اپنی اہمیت کا احساس تھا کہ ان کے بغیر کوئی جہاز کہیں جانے کا اہل نہیں عورتوں کو گرمی لگ رہی تھی میک اپ کی تہہ تلے برقعوں کے اندر ہیٹ والی شلواروں میں پیڈ والی باڈسوں کے اندر مردوں کو تھری پیس سوٹوں کی وجہ سے گرمی لگ رہی تھی پھنسی ہوئی ٹائی اور لاسٹک والے انڈرویئر کی وجہ سے کوٹ کی بغلوں کے نیچے اور کلائی پر بندھی ہوئی سٹین لیس سٹیل کی گھڑی تلے پسینہ آرہا تھا سب جگہ لوگ تھے۔ ہر انسان کے ساتھ کچھ وقتی کچھ طبقاتی کچھ اس کی عمر کے حساب سے جکڑنے والے مسائل تھے کوئی آدمی آزاد نہ تھا۔

ان ہی میں ایک روشن بھی تھی جس جنگلے کے پار مسافروں کے سوائے اور کوئی نہیں جاتا وہاں روشن بھی تھی جنگلے پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اس نے بڑھے ہوئے پیٹ کو چھپانے کے لیے ڈانسے کی سفید چادر ایسے اوڑھ رکھی تھی کہ پیٹ اور بھی نمایاں ہو گیا تھا چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ زرد تھا اور اب دونوں گالوں پر چھائیاں دھبوں کی

صورت نظر آتی تھیں۔

''میں نے پتہ کر لیا ہے فلائیٹ وقت پر آ رہی ہے۔'' میں نے روشن کے قریب آ کر کہا۔

وہ چپ رہی۔

''مبارک ہو۔''

اس نے نظریں جھکا لیں۔

''اب کیا ہوگا۔''

کچھ دیر کے بعد اس نے بغیر نگاہیں اٹھائے کہا۔

''تم باہر چل کر ہوائی جہاز اترتے دیکھنا چاہتی ہو۔''

''نہیں جی باہر بہت گرمی ہے '' اس نے رومال سے اپنے ہونٹوں کے بالائی والا حصہ کو پونچھا۔

''اچھا تو یہیں انتظار کر لیں ''

اس وقت اناؤنسمنٹ ہوئی کہ کراچی سے آنے والا ڈی سی ٹن لینڈ کر گیا ہے ہم دونوں عمارت سے باہر نکلنے لگے۔

''اب کیا ہوگا جی؟ '' اس نے میری طرف دیکھے بغیر پھر کہا۔

میں نے سگریٹ سلگایا لمبا کش لیا اور کہا ''تمہارا نکاح ہوگا اور کیا ہوگا۔''

''ہاں جی وہ تو ٹھیک ہے پر ''

ہم دونوں آہستہ آہستہ بیرونی راستے کی طرف چلنے لگے۔ وہ بار بار چہرہ پونچھ رہی تھی۔

''آپ کئی دن سے آئے نہیں ؟'' روشن نے سوال کیا۔

''صبح میں ریڈیو سٹیشن چلا جاتا ہوں اور شام کو '' میں چپ ہو گیا۔

''اور شام کو؟''

"شام کو سائیں جی کی طرف۔"

میں نے روشنکو یہ بتانا مناسب نہ سمجھا کہ میں ہر روز باقاعدگی کے ساتھ سائیں جی کے پاس جاتا ہوں پھر سائیں جی مجھے ساتھ لیکر ٹیلوں کی اوٹ میں چھپے جاتے ہیں وہاں سائیں جی کی قبر میں بیٹھ کر ہم دونوں گھنٹہ بھر پاس انفاس کرتے رہتے ہیں۔ پھر عشاء کی نماز کے بعد سائیں جی قبر میں بیٹھ کر تلاوت شروع کر دیتے ہیں اس وقت میں ان کے پاس نہیں ہوتا۔ لیکن قبر کے دہانے پر بیٹھ پر رہتا ہوں مجھے آخری سیڑھی پر بیٹھ کر خالی الذہن ہونے کی پریکٹس کرنی پڑتی ہے تہجد کے وقت تک مجھے جنگل کی طرف سے لاکھوں آوازیں آتی ہیں پھر فجر کے بعد اتنی خاموشی ہونے لگتی ہے کہ اپنے دل کی دھڑکن بھی گھڑی کی ٹک ٹک جیسی سنائی دیتی ہے سارے مسام کھڑے رہتے ہیں نتھنوں میں کئی قسم کی خوشبو آتی ہے اور لگتا ہے کہ عین گدی کے پیچھے کوئی آہستہ آہستہ اپنے پھڑ پھڑا رہا ہے میں نے ان پروں کا ذکر سائیں جی سے کیا تو وہ بولے "دیکھو بیٹا پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا ورنہ دیوانے ہو جاؤ گے عموماً یہ موت کے پروں کی آواز ہوتی ہے اگر تم موت کے حضور خوف زدہ نہ ہو تو وہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔"

"لیکن سائیں جی پروں کی آواز مجھے ذکر کرنے نہیں دیتی۔"

"تم کو معلوم نہیں اس وقت فرشتے آسمانوں سے اترتے ہیں کچھ فرشتوں کو رزق تقسیم کرنا ہوتا ہے کچھ فرشتے خوشیاں بانٹنے نکلتے ہیں کچھ اسرار و رموز سکھلانے آتے ہیں نسل انسانی کو حکمت الٰہی سے شناسا کرنے بھی کئی یہاں آتے ہیں موت کا فرشتہ اپنی سواریوں کو تکنے کے لیے نکلتا ہے تم کبھی مڑ کر نہیں دیکھنا ورنہ ختم ہو جاؤ گے۔"

"اچھا سائیں جی" ان باتوں کا ملاقاتوں کا ذکر روشن سے بالکل بیکار ہے وہ مجھ سے ایک قدم پیچھے چل رہی تھی۔

ہم دونوں ادھر آ گئے جہاں ٹیکسی سٹینڈ ہے اور کراچی آنے والی سواریاں اترتی

ہیں چونکہ ڈی سی ٹن آیا تھا اس لیے سواریاں میلے کی طرح اتریں بہت انتظار کے بعد سامان پہنچا اور لوگ لدے پھندے رخصت ہونے لگے۔ دوبئی مسقط کویت اور سعودی عرب سے آنے والے ماڈ لوگوں کا عجیب عالم تھا ان کے ہاتھوں میں ریڈیو ٹیپ ریکارڈر گلے میں کیمرے جسم پر فرنگی جیکٹیں، بازوؤں سے لٹکتی ترمیس اور خوبصورت کمبل کلائی پر کئی کئی گھڑیاں تھیں وہ باہر کے ملکوں میں کام کرنے کی وجہ سے خود اعتمادی کا ڈھیر نظر آتے تھے اور انہیں اپنے رشتہ دار خوشامدیوں کی طرح آگے بڑھ بڑھ کر سلام کر رہے تھے۔

بہت بعد میں افتخار آیا۔ وہ بھی جلد پلٹ لوگوں کی طرح سامان سے لدا ہوا تھا۔ جب وہ میرے قریب پہنچا تو میں نے اس کے ہاتھ سے تھرموس پکڑی اور کیمرہ اس نے روشن کے گلے میں لٹکا دیا وہ بہت خوش تھا۔

"آپ نے بہت تکلیف کی میں خود پہنچ جاتا۔"

"کوئی بات نہیں بس۔"

روشن اور میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے اور وہ ہم دونوں سے کچھ ہٹ کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا جس وقت میں ٹیکسی والے سے جھگڑا کرنے لگا تو افتخار نے فوراً مدافعت کی "کتنے پیسے مانگ رہا ہے۔؟"

"یہ ساتھ گلبرگ ہے اور یہ بیس روپے مانگ رہا ہے۔"

"کوئی بات نہیں سر کل چھ سات ریال کی تو بات ہے چلیں۔"

میں شرمندہ ہو گیا۔ ہم تینوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے وہ میرے اور روشن کے قانونی رشتے کو مدنظر رکھ کر آگے بیٹھا سارے راستے ایک بار بھی اس نے روشن کی طرف نہیں دیکھا۔ بلکہ پیچھے منہ کر کے صرف مجھ سے باتیں کرتا رہا۔

"ٹیپ ریکارڈ میں اپنے چھوٹے بھائی کے لیے لایا ہوں اس نے مجھے کئی خط لکھے تھے یہ دیکھیے بالکل Latest فیشن ہے Stero ہے میں نے کہا ایک بور لے

جانا ہے اچھے لے جانا چاہیئے قیمت کی میں نے کبھی پروا نہیں کی یہاں تھرموس کی کیا قیمت ہے۔"

میں نے اندازے سے تھرموس کی قیمت بتائی۔

"مجھے تو اسی ریل میں ملی یہ دیکھئے ایسے پانی نکلتا ہے" اس کے کہنے پر میں نے تھرموس کی مکینیکل ٹونٹی دبا کر دیکھی۔

"پہلے میں یوشیکا کا کیمرہ لانے لگا تھا۔ پھر خیال آیا پولورائیڈ ٹھیک ہے فٹ تصویر کھینچو فٹ تیار ہو جائے۔ آپ ایسے ہی رہیں میں آپ کو دکھاتا ہوں ابھی۔"

اس نے روشن کے گلے سے کیمرہ اتار کر چلتی گاڑی میں تصویر کھینچی۔ تصویر کیمرہ سے نکلتے ہی تیار تھی آہستہ آہستہ اس کے رنگ گہرے ہونے لگے۔ پھر اس نے وہ تصویر مجھے پکڑا دی۔

شادی کے بعد روشن کے ساتھ یہ میری پہلی فوٹو تھی۔

تصویر میں روشن گھبرائی ہوئی نظر آتی تھی۔

"کمال ہے" میں نے حیرت سے کہا "ابھی تصویر کھینچی اور فوراً کیمرے میں ہی Develop بھی ہو گئی۔"

"اب تو جی جدے سارے لوگ Instant کیمرہ خریدتے ہیں یہاں پر اس کا نگیٹو مل جائے گا۔"

"معلوم کرنا پڑے گا شاید ملتا ہو شاید نہ ملتا ہو" میں نے بے جہت سے کہا۔

گھر پہنچ کر ہم دونوں سعودی عرب کی دولت، بیرونی ممالک سے اس کے سیاسی تعلقات، پاکستان کی اور جدہ کی قیمتوں کا موازنہ مغربی کلچر کا اسلامی ممالک میں امتزاج اسلامی قدروں کی بے حرمتی اسرائیل کی ویسٹ بنک کے معاملے میں ڈھٹائی اور پی ایل او کی باتیں دیر تک کرتے رہے۔ پھوپھی جان خصوصاً گھبرگئی

خاتون تھیں اور جتنی ان پڑھ تھیں محض اپنی دولت کی وجہ سے گفتگو میں شریک رہیں روشن سارا وقت خاموش تھی۔

شام کی چائے کے بعد میں نے اجازت چاہی تو سب چپ ہو گئے۔

"پھر اب؟" نوجوان پلی پلائی پھوپھی نے سوال کیا۔

روشن نے لحظہ بھر کو نگاہیں اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

"اب تو مجھے ذوق صاحب سے بات کرنا پڑے گی" پھوپھی بولی۔

"تو ابھی تک آپ نے ان سے بات نہیں کی" افتخار نے خوفزدہ ہو کر سوال کیا۔

"نہیں کی تو ہے کی تو ہے لیکن اب پوری طرح arrangemant کرنی پڑے گی ناں؟"

"اگر کسی نے مجھے ایئر پورٹ پر دیکھ لیا تو قیامت آجائے گی" افتخار نے ناک میں انگلی پھیر کر کہا۔

"نہیں کل ہی سب کچھ ہو جانا چاہیے پھوپھی نے اپنے سونے کے چوڑے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا کیوں قیوم؟"

"جیسے آپ کہیں۔"

میں کئی دنوں سے جانتا تھا کہ افتخار روشن کو لے جانے کے لیے آرہا ہے لیکن پھر بھی مجھے محسوس ہوا کہ سب کچھ بہت آناً فاناً ہو رہا ہے۔

"آپ کسی وکیل سے مل کر طلاق کے قانونی کاغذ تیار کروالیں۔ ایک دو دن میں۔"

یکدم روشن کا چہرہ پہلے سے زیادہ پیلا ہو گیا اور اس کی چھائیاں نمایاں ہو کر چہرے پر پھیل گئیں۔

"دیکھئے ناں قیوم صاحب یہ بہت بڑا قدم اٹھا رہی ہے روشن ہمارے

خاندان میں پہلے ایسے کبھی نہیں ہوا اگر موچی دروازے یہ خبر پہنچ گئی تو کہرام مچ جائے گا روشن کی ماں تو زہر کھا لے گی۔"

"اس وقت میں روشن کا ضامن ہوں میرا خیال ہے کوئی اور صورت ممکن نہیں"

"پھر بھی بھائی مختار بات نہ نکلے" اس نے افتخار کو مخاطب کر کے کہا۔

"دیکھیئے میں تو آپ کے پاس ہوں آپ چاہے زنجیے پاؤں میں ڈال کر مجھے باندھ رکھیں باقی قیوم صاحب مالک ہیں یہ اگر کسی سے بات کرنا چاہیں تو میں انہیں مجبور نہیں کر سکتا۔"

"آپ ان کی طرف سے بے فکر رہیں" پہلی بار روشن نے جواب دیا۔

جب نکاح کی تفصیلات طے پا گئیں تو یکدم روشن کی پھوپھی بولیں لیکن روشن ایک الجھن میری بھی ہے میں نے تمہاری دل و جان سے مدد کی ہے تم تو جدہ میں آرام کرو گی عیش کرو گی گھر والوں سے مجھے ہی بھگتنا پڑے گا تمہارے بعد۔

روشن کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ پھیکا پڑتا جا رہا تھا۔

"آپ فرمائیں آپ کی کیا الجھن ہے آپ کی الجھن کو بھی ہم خلاص کریں گے۔" افتخار نے کہا۔

"بس جس وقت نکاح ہو جائے افتخار اپنے گھر چلا جائے اور روشن قیوم کے ساتھ چلی جائے کسی کو علم نہ ہو کہ نکاح میرے گھر میں ہوا ہے" پھوپھی نے چہرے کو کاغذی رومال سے پونچھ کر کہا۔

"لیکن کبھی نہ کبھی تو یہ بھید کھلے گا" افتخار بولا۔

"ہاں کبھی نہ کبھی تو ٹھیک ہے لیکن جب تک روشن پاکستان میں ہے یہ بات نہیں کھلنی چاہیے۔"

"میں قیوم صاحب کے ساتھ چلی جاؤں گی" روشن نے مری ہوئی آواز میں کہا "کیوں قیوم صاحب؟"

"ٹھیک ہے ...... بالکل۔"

"خلاص خلاص اب کل تک یہ ٹاپک بند" افتخار نے خوش دلی سے کہا۔

ساتھ ہی اس نے اپنی کلائی سے بندھی ہوئی چھ گھڑیوں میں سے ایک گھڑی اتار کر میری طرف بڑھائی "قیوم صاحب یہ گھڑی باندھ لیں Digital گھڑی ہے سر بالکل نیو ڈیزائن کی۔"

"مجھے گھڑی کی ضرورت نہیں یہ دیکھئے یہ بندھی ہوئی ہے شکریہ"

میں کچھ دیر اس کے پاس بیٹھ کر جدہ ایئر پورٹ کی باتیں سنتا رہا اور پھر رخصت ہو گیا۔

سائیں جی اس روز ڈیرے پر موجود نہیں تھے۔ میں بھی جانتا تھا کہ مغرب کے بعد وہ کہاں ہوتے ہیں کئی دن سے میں ٹوٹا ٹوٹا بکھرا ہوا ان کے پاس پہنچتا قبر میں بیٹھ کر پاس انفاس کے وقت مجھ سے کئی غلطیاں ہو جاتیں لیکن سائیں جی جھڑکنے والے آدمی نہ تھے وہ مجھے ساید مابعد کا سچا مالک سمجھ کر میری رہبری کر رہے تھے لیکن میں تمام تر موت کے شکنجے میں تھا میرے تمام خواب جاگتے کی سوچیں میرے خیالی خواب موت کے متعلق ہوتے کبھی کبھیں موت سے اس درجہ خائف ہو جاتا کہ بیٹھے بیٹھے میرا سارا وجود پسینے میں بھیگ جاتا اور میری پتلیاں خوف سے گھومنے لگتیں میں نے ریڈیو سٹیشن پر اچانک استعفے داخل کرا دیا تھا۔ اب مجھ سے موٹر سائیکل نہ چلتی تھی مجھے لگتا تھا کہ اگلے موڑ پر اچانک میں کسی بس ٹیکسی یا کار سے بھڑ جاؤں گا روشن کو داق بیٹے کے بعد بھی اس کا تمام سامان میرے گھر میں موجود تھا

بھائی مختار اور صولت بھی کچھ نہ جانتے تھے روشن کے گھر والوں کو معلوم نہ تھا کہ ان کی بیٹی کو طلاق ہو گئی ہے

اس روز سائیں جی کے پاس پہنچتے پہنچتے میرا سانس اکھڑا ہوا تھا۔

''آجاؤ اندر'' قبر میں سے آواز آئی۔

سیڑھیوں کے باہر جوتیاں اتار کر میں اندر چلا گیا اگربتی کی خوشبو آ رہی تھی۔ ایک اور بار ریش بزرگ سائیں کے پاس بیٹھے تسبیح پھیر رہے تھے اس نورانی بزرگ نے ہاتھ کے شارے سے مجھے بیٹھنے کو کہا۔

آج سائیں جی جسم اور روح کے اعتبار سے بہت چھوٹے لگ رہے تھے۔

موت سے بہت ڈرتے ہو؟ نئے باریش بزرگ نے سوال کیا۔

میں نے ثبات میں سر ہلایا۔

''فنا کے بغیر بقا کے آرزومند ہو؟''

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

''موت انسان کی محسن ہے نہ تو اس زندگی کو کتنی پائیداری ہوتی جس میں حزن و ملال کے سوا کچھ نہیں'' نورانی بزرگ بولے

''جی....''

سفید ریش والے بزرگ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''ہمارے ساتھ چلو گے؟''

میں نے اپنے سائیں جی کی طرف دیکھا وہ آنکھیں بند کیے بیٹھے تھے۔

''کہاں جی؟'' میں نے سوال کیا۔

''کہاں پوچھنے والا تیرا نہیں ہوتا باہر چل کر بیٹھو''

''جاؤ'' سائیں جی نے آہستہ آہستہ سے کہا اور پھر آنکھیں بند کر لیں۔

میں عشاء کی نماز تک باہر بیٹھا رہا لیکن قبر کے اندر سے کوئی آواز نہ آئی پھر جنگل

کی طرف سے گیدڑوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔اور جب آسمان پر تیز ی ہوئی
تو قبر سے آواز آئی۔

"یہاں آؤ۔"

میں ڈرتا اندر چلا گیا۔

سائیں جی اکیلے بیٹھے تھے قبر میں سوندھی مٹی کی خوشبو تھی اور اکلوتی موم بتی میں
سائیں جی کے تین سائے دیوار پر پڑ رہے تھے۔

"بیٹھو"

میں دوزانو بیٹھ گیا۔

"آج تم نے بہت بڑا موقع گنوا دیا پیر و مرشد کے ساتھ چلے جاتے تو عاقبت
سنور جاتی۔"

"میں ڈر گیا تھا۔"

"ٹھیک ہے اب اگلی جمعرات کو یہیں اس لڑکی کا دیدار ہو گا جس کا تم نے
ذکر کیا ہے اگر چوک گئے تو ساری عمر کے لیے مجذوب ہو جاؤں گے حواس قائم رکھے تو
اس سے فیض حاصل ہو گا تیار ہو "

"جی تیار ہوں۔"

"دیکھو عرفان اور دیوانگی میں بس ایک حواس کا فرق ہوتا ہے حواس قائم
رہیں تو عرفان نہ رہیں تو دیوانگی تیار ہو۔"

"جی تیار ہوں۔"

نکاح بہت خاموشی کے ساتھ ہوا اس کے بعد افتخار اپنے گھر موچی چلا گیا۔اور
روشن میرے ساتھ ساندہ کلاں آ گئی۔وہ اور میں سارا رستہ خاموش رہے۔گھر پہنچتے
ہی اسے قے شروع ہو گئی بار بار وہ غسل خانے جاتی اور واپس آ کر نڈھال لیٹ

جاتی۔ میں بھی صولت کو اس کی حالت کی متعلق کچھ بتانا چاہتا تھا۔ میں روشن کو بتائے بغیر ڈاکٹر سے دوا لینے چلا گیا۔

پھر ہم دونوں فروعی کے علاوہ کوئی بات نہ ہوئی۔ کچھ ویزے اور پاسپورٹ کی باتیں سامان چھوڑنے اور رکھنے کے امور کچھ بدنامی کے خدشات کبھی کبھی ماں باپ اور پاکستان چھوڑنے کا غم زیرہ ذکر رہا۔ لیکن قفل دونوں طرف سخت لگا تھا۔ دوسرے دن مغرب کے وقت روشن کو افتخار کے ساتھ جدہ روانہ ہونا تھا اپنے گھر والوں سے افتخار نے جدہ واپس جانے کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میرے گھر میں سوائے میرے اس حقیقت سے کوئی آگاہ نہیں تھا۔

یہ روشن کی میرے گھر میں آخری رات تھی ہم دونوں کے پلنگوں میں ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ تھا لیکن وہ اور میں دم سادھے چپ لیٹے تھے پتہ نہیں کیا سوچتے ہوئے مجھے نیند آ گئی پھر مجھے ایسے لگا جیسے کسی نے میرے بازو پر برف کی قاش رکھ دی۔ میں نے آنکھیں کھولیں روشن میرے پلنگ پر بیٹھی تھی اس کا بھاری پیٹ اس کی گود میں تھا اور ٹھنڈی انگلیاں میرے بازو پر تھیں۔

''کیا بات ہے روشن؟''

''میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی شاید کل وقت نہ ملے۔''

آنسو اس کی آنکھوں سے بلا تکان گر رہے تھے۔

''آپ بڑے اچھے آدمی ہیں اگر آپ میرے بچے کو قبول کر لیتے تو میں یہاں سے کبھی نہ جاتی۔''

زندگی میں پہلی بار ایک ٹھنڈا جھونکا میرے بند دل میں گھس آیا۔

''تم تم یہاں رہنا چاہتی ہو میرے پاس۔''

''آپ کے مجھ پر اتنے احسانات ہیں۔ آپ نے مجھے سب کچھ دیا اور پلٹ کر کچھ بھی نہیں مانگا ؟''

"صرف احسانات؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

یکدم اس کی آنکھوں کے جھر نے بند ہوئے۔

"اگر اگر میں تم کو نہ جانے دوں روشن تو تو افتخار کو بھلا سکو گی؟"

اس نے نظریں جھکا لیں "جی نہیں یہ ممکن نہیں۔"

میں نے آخری بار کسی کو زخم عطا کرنے کی کوشش کی اور نا کام رہا۔

"پھر یہاں رہنے کا فائدہ؟ حاصل یہاں رہنے سے۔"

"آپ مجھ سے ناراض ہیں؟ دیکھنا دیکھیے ناں میں یہاں رہ سکتی ہوں ساری عمر آپ کے پاس لیکن افتخار کو نہیں بھلا سکتی حالانکہ وہ آپ کی جوتیوں جیسا بھی نہیں۔"

میں نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی گندے نالے کی متعفن ہوا کے کی طرح میرے جبڑے پر پڑی ور گزر گئی۔

"سوچ لو یہ باتیں فضول ہیں ایسی باتوں سے کچھ حاصل نہ ہو گا۔"

کچھ سڑکیں جب شہر سے باہر نکلتی ہیں تو کافی فاصلے تک پکی اور مضبوط نظر آتی ہیں۔ پھر ان کے کنارے بھرے بھرے ہونے لگتے ہیں جا بجا گڑھے نظر آتے ہیں اور پکی سڑک کچے راستے بدل جاتی ہے ایسا راستہ جو بارش میں کیچڑ اور دلدل میں بدل جاتا ہے کچھ دور جا کر یہ کچا راستہ جھاڑیوں میں کھیتوں کے دہانے پر ختم ہو جاتا ہے یہ سڑکیں کسی گھر کسی شہر کسی محلے کو نہیں جاتیں بس یوں ہی شہر چھوڑ کر دم سا چھوڑ دیتی ہیں۔

میں بھی ایک ایسی ہی سڑک تھا۔ شادی سے نکل کر نہ جانے مجھے کہاں جانا تھا؟ اس وقت مجھے روشن میں سیمی، عابدہ، احمل اور جانے کون کون نظر آ رہا تھا سامنے بیٹھی ہوئی گابھن عورت سے میری کوئی جان پہچان نہ تھی ساری عمر میں نے عورتوں کے ادھ کھلے دروازوں سے اندر جھانکنے کی کوشش کی لیکن اندر والوں نے کبھی بھی دروازے

کر نہ بڑا یا۔

''آپ کیا سوچتے ہوں گے۔'' روشن بالآخر بولی۔

''میں کچھ نہیں سوچتا روشن کبھی کبھی صرف اتنا کہ کاش تم نے مجھے ایک رات دھوکے میں رہنے دیا ہوتا کاش صرف ایک رات کے لیے کسی کا جسم کسی کا دل ایک وقت میں میرا ہوتا۔''

''آپ رو رہے ہیں جی؟۔''

روشن نے اپنا دوپٹہ اٹھا کر میری گال سے لگا دیا۔

''میں کیا کرتی جی میرا دل کا ہے۔ میرا جسم میں اس کی روح چل رہی ہے میں آپ سے کیسے جھوٹ بولتی۔''

مجھے افضل نے یہ نہیں بتایا تھا کہ باکرہ لڑکی ذہنی قلبی طور پر باعصمت ہی نہیں ہوتی۔ سچی بھی ہوتی ہے کاش اس نے صرف ایک رات کے لیے مجھے جھوٹ کی زندگی بسر کرنے دی ہوتی۔

''میں آپ جیسے اچھے انسان کو کیسے اتنا بڑا فریب دے سکتی تھی؟ ''

وہ چپ ہو کر اپنے پلنگ پر جا بیٹھی۔

میں نے تکیے پر سر ڈال دیا لیکن نہ میں ساری رات سویا نہ اس نے آنکھ بند کی چونکہ ہم میں قانوناً اور شرعاً کوئی رشتہ باقی نہ رہا تھا۔ اس لیے ہم انسانی کشش کے تحت ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے تھے۔ جیسے کسی جہاز کے باقی جو زیرو ہونے کے بعد کسی جزیرے میں رہنے لگیں اور نسل قوم مذہب کی تمام زنجیریں ٹوٹ کر انہیں نئے رشتوں میں پرونے لگیں۔

میں نے اسے آہستہ آہستہ اپنے گاؤں کے متعلق بتایا کیسے چندرا کی آبادی کلر کے ہاتھوں بے آباد ہوئی کیتوں کھلیانوں کی سفیدی کیسے ہریاول چاٹ گئی۔ اور ڈھور ڈنگر انسان سب چندرا چھوڑ کر چلے گئے پھر میں اسے عزیز گاتن کے متعلق

اس کی ماں کی زندگی کے متعلق ایسی تفصیل سے باتیں سنانے لگا کہ میں خود حیران رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے وہ تفصیلات معلوم ہیں۔

"تمہارا کیا خیال ہے روشن کیا بددعا سے بستیاں اجڑ جاتی ہیں۔"

"ہاں جی اجڑ جاتی ہیں۔"

پہلی بار روشن سے بات کرنا بہت آسان تھا وہ پہلو کے بل کہنی ٹیک کر اپنے پلنگ پر لیٹی ہوئی تھی اور اس کا پیٹ تہہ کیے ہوئے تکیے کی طرح اس کے سینے کی طرف چڑھا ہوا تھا۔

"میں ایک دفعہ سکول سے لوٹی تو میری باجی ایک خط پڑھ رہی تھیں۔ میں نے خط کے متعلق پوچھا تو انہوں نے مجھے نہ بتایا بلکہ خط چھپا دیا کبھی کبھی کتنا تجسس پیدا ہو جاتا ہے انسان میں بھلا مجھے کیا ملنا تھا خط سے لیکن آخر میں نے خط تلاش کیا اور پڑھا وہ خط میرے خالو کا تھا۔ وہ خط ایسا تھا جو انہیں باجی کو لکھنا نہیں چاہیے تھا مجھے خط پڑھنے کے بعد اسے وہیں چھپانا چاہیے تھا باجی جانتی اس کا کام جانتا لیکن میں نے خط پکڑ کر امی کو دے دیا امی نے ابو کو بتایا ابو نے خالو کو حسب کیا باجی بے چاری کا کوئی قصور نہیں تھا۔ پھر بھی وہ دھری گئی دیکھتے دیکھتے اس کا نکاح کر دیا گیا۔ جس روز وہ رخصت ہوئی ہے مجھے کبھی وہ دن نہیں بھولتا باجی میرے کمرے میں آئی اور بولی کاش کبھی تیرے ساتھ بھی ایسا ہو تو بھی شادی کہیں کرنا چاہے ہو کہیں جائے میں نے ڈرتے ڈرتے کہا تو کیا آپ خالو جان سے شادی کرنا چاہتی تھیں؟"

"خالو جان گئے بھاڑ میں مجھے ان سے کیا لینا ہے؟ جہاں بھی میں چاہتی تھی وہاں تو تو نے نہیں ہونے دی ناں کم بخت! اللہ تجھے بدلہ دے"

"آپ کا کیا خیال ہے دولہن کی بددعا زیادہ لگتی ہے کہ کنواری کی؟"

ہم دونوں کافی دیر تک ایسے ہی سوال ایک دوسرے سے پوچھتے رہے پھر میں

نے اسے پٹی ماں کی موت کے متعلق بتایا بھی کا سرا واقعہ سنایا، احتل کے قتل کی داستان سنائی لیکن ابا کے متعلق میرے منہ سے ایک لفظ نہ نکلا میں اپنے بابو گدھ کی یادوں کو کسی کے ساتھ بانٹ نہیں سکتا تھا مجھے لگتا کہ اس کی گمشدگی یا موت میری اپنی گمشدگی ہے میں اس کے ساتھ ہی کہیں کھو گیا تھا کہیں ختم ہو گیا تھا۔

آخری بار جب میں نے ابا کو دیکھا وہ تیسری منزل پر اس ممٹی کے پاس کھڑا تھا جس میں سے کبھی دھواں نکلا کرتا تھا۔

کیا وہ عشق لا حاصل سے دیوانہ ہوا؟ کیا وہ چاچا غلام کے ساتھ مل کر رزق حرام کھانے کا مرتکب ہوا؟ کیا اسے موت کے انتظار نے پاگل کیا؟

ائیر پورٹ پر افتخار موجود تھا روشن کا سوٹ کیس اٹھائے ہم دونوں اس کے پاس پہنچے۔ اس وقت اس نے سادہ شلوار قمیص پہن رکھی تھی اور اس کے جسم پر کوئی سامان نہ تھا اناؤنسمنٹ سے پہلے ہی وہ دونوں اندر چلے جانا چاہتے تھے۔ کیونکہ کسی نہ کسی وقت کے مل کانے کا خطرہ تھا۔

جنگلے کے پاس پہنچ کر افتخار نے سادگی اور خلوص سے ہاتھ ملایا اور بولا

"آپ نے میری بہت مدد کی ہے سر میں آپ کا شکر گزار ہوں کوئی اور ہوتا تو ....."

وہ چپ ہو گیا سعودی عرب کی کمائیاں جدے کے بازار پردیس کی ایک اور Frequency کی اندگی اس کے دل کو مکمل طور پر مجبور نہ کر سکی تھی۔

""اگر آپ عمرہ کرنا چاہیں تو جی خام کے پاس رہیں ڈیڑھ گھنٹے کا تو راستہ ہے جدہ سے بڑی اچھی ائیر کنڈیشنڈ بس چلتی ہے الشرکیہ العربیہ المتقل راستے میں صرف ایک بار رکتی ہے میں ٹکٹ بھیج دوں گا آپ ٹکٹ کی فکر نہ کریں آپ بس آنے کا ارادہ کریں۔"

روشن چپ تھی اس کا چہرہ آج سوجا ہوا تھا اور چھائیاں گہری لگ رہی تھیں

''انشاءاللہ '' بہت آہستہ روشن بولی۔

''انشاءاللہ '' میں نے اس سے بھی آہستہ کہا۔

''میں تو مہینے میں ایک دو عمرے کر ڈالتا ہوں آپ ضرور آئیں یہ میرا ایڈریس ہے آپ صرف مجھے لکھ دیں کب آنا چاہتے ہیں ٹکٹ پہنچ جائے گی۔ میرے پاس دو کمروں کا گھر ہے غسل خانہ سادی زندگی ہے آپ enjoy کریں گے۔''

''اچھا۔''

اندر جانے سے پہلے افتخار نے مجھے جھپی ڈالی اور میرے کندھے کو چوم کر بولا'' مجھے بڑا افسوس ہے سر لیکن ''

اس کی سوئی سوئی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ روشن کا بیگ اٹھا کر جلدی سے جنگلے کے اس پار چلا گیا۔

روشن کھڑی رہی کچھ لمحے کچھ سیکنڈ متذبذب حیران دکھ میں بھیگی ہوئی۔

ہمیں معلوم نہ تھا کہ ہمیں کیسے ایک دوسرے کو الوداع کہنی چاہئیے پھر وہ اندر کی طرف مڑی اور پلٹی یکدم ہم دونوں بغل گیر ہو گئے اس کا پیٹ درمیان میں حائل نہ ہو سکا۔ میں نے اپنے ہونٹ اس کے سر پر پیوست کر دیے اور اس کے آنسو میری قمیض میں جذب ہونے لگے۔

یہ کل دس بارہ سیکنڈ کا واقعہ ہوگا۔ لیکن اس کے جسم کا قرب عرصہ تک میرے ساتھ رہا میرے ہونٹ اس کے سر کو کتنی ہی دیر چومتے رہے شاید میں بھی ہوائی جہاز کی سیڑھیوں پر اس کے ساتھ تھا۔

پھر اس نے آخری بار ہاتھ ہلایا ہوائی جہاز کے پیٹ میں گھس گئی۔ اس کے بعد افتخار نے اپنی اور اس کی سیٹ تلاش کی ہو گی اسے کھڑکی کی جانب بٹھایا ہوگا۔ اس

کے پیٹ کا خیال کر کے بلٹ باندھی ہوگی۔ شاید اس کی کھڑکی سے جنگلے کے ساتھ کھڑے ہوگوں کا ہجوم بھی نظر آ رہا ہوگا۔ لیکن اب افتخار کا بالوں بھرا بازو ایئر ہوسٹس کی اناؤنسمینٹ کے بعد آخری سگریٹ بجھاتے ہوئے اسے چھو رہا ہوگا۔ پلین کے اندر سندھی فوک میوزک سنتے ہوئے تمام مسافر ہوا کے بے بنائے ہوئے Setducts کر رہے ہوں گے۔ افتخار نے بھی ہوا کا رخ روشن کی طرف کر دیا ہوگا۔

ٹھنڈی ہوا افتخار کی منزل ہمیشہ ٹھنڈی ہوا کا تازہ جھونکا ایک نئی منزل کی ایئر ٹکٹ زخم کتنی جلدی مندمل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ اور پھر یہ تو کوئی زخم نہ تھا!

ایئر پورٹ سے مجھے سیدھے سائیں جی طرف جانا تھا طے تھا کہ اس جمعرات کو میں سیمی سے ملوں گا سائیں جی دو دن پہلے سارا معاملہ طے کر چکے تھے ورنہ وہ مجھ سے ملنے پر رضامند تھی مجھے اس سے ملنے پر صرف ایک سوال پوچھنا تھا اس سوال کو میں کئی طور پر ذہن میں ترتیب دے چکا تھا "سیمی! اب تو تم مجھے اور آفتاب کو بہتر طور پر جانتی ہو بتاؤ اگر اب تمہیں ہم دونوں میں سے کسی کو پسند کرنا ہو تو کسے منتخب کرو گی؟"

جس وقت میں سائیں جی کے ڈیرے کی طرف جا رہا تھا اندر ہی اندر میں سیمی کے جواب سے خوفزدہ تھا کیا وہ اسی طرح نیلی جینز پہن کر بازو پر کینوس کا تھیلا لٹکائے آئے گی؟ کیا اب اس کا جواب وہی ہوگا جو زندگی میں تھا کبھی کبھی مجھے خیال آتا کہ شاید مصری عورتوں کے احرام کی طرح وہ ایک سفید لبادے میں ہوگی سر سے پاؤں تک ڈھکی ہوئی اور چپ شاید وہ میرے سوال کا جواب دینا پسند نہ کرے؟

سائیں جی کے ڈیرے پر مکمل خاموشی تھی اندر باہر کوئی نہ تھا صرف مغرب کی نماز کے بعد کا اندھیرا ساری جگہ چھایا تھا ڈیرے سے پار سائیں جی کی قبر اب مجھے بڑا

رہی تھی میں آہستہ آہستہ ادھر چلنے لگا ایک بات بار بار دل میں آ رہی تھی جسے میں دبانا چاہتا تھا۔ اگر کسی نے وہی جواب دیا جو وہ زندگی بھر دیتی آئی تھی پھر؟

جس وقت میں سائیں جی کی قبر سے کچھ فرلانگ دور پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ اس طرف سے کچھ لوگ آ رہے ہیں یہ لوگ ٹکڑیوں میں چپ چاپ میرے پاس سے گزرتے گئے میں نے کسی کو سلام نہ کیا، نہ ہی کوئی مجھ سے مخاطب ہوا ندھیرے میں کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ یہ سب کون ہیں سائیں جی کی قبر سے کوئی ادھا فرلانگ ادھر بالکل خاموشی چھا گئی یہ جگہ ہمیشہ سے ایسی تھی لیکن تب مجھے اس خاموشی سے خوف آنے لگا اونچے اونچے ٹیلے پرانے زمانے کے ایسے جانوروں سے مشابہ نظر آئے جواب صفحہ ہستی پر موجود نہیں ہیں۔

جس وقت میں قبر کے پاس پہنچا تو ایک کتے نے آسمان کی طرف منہ اٹھا کر کہیں دور بین کیا۔

قبر کے اندر کو دھنسی ہوئی تھی اور نیچے اترنے والی سیڑھیاں غائب تھیں قبر کے اوپر تازہ مٹی کا ڈھیر تھا میں نے قبر کے چاروں طرف گھوم کر دیکھا۔ اندر جانے کے تمام راستے مسدود تھے اور قبر ایسے لگتی تھی جیسے ابھی ابھی بنائی گئی ہو۔ پھر قریب ہی سے کہیں سسکیوں کی آواز آنے لگی۔ میں نے غور سے دیکھا ایک جھاڑی کے پاس سائیں جی کا خاص مرید منہ پر ہاتھ رکھے رونے کی آواز روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یہ .... یہ قبر کو کیا ہوا اللہ دتے؟ " میں نے پاس جا کر پوچھا۔

"بند ہو گئی "

"کیسے کیسے؟ "

"سائیں جی کل شام اندر عصر کی نماز پڑھ رہے تھے .... قبر دھنس گئی .... ہم نے ہم نے اسے کھولا نہیں غائبانہ نماز جنازہ پڑھا دی یہی حکم تھا سائیں جی کا ایسے ہی فرما دیا تھا پیر مرشد نے .... انہیں تو وصال ہو گیا .... لیکن ہم کہاں

جائیں ہم کہاں جائیں سائیں جی کہاں جی کہاں۔"

مرید دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔

مجھے یوں لگا تازہ قبر کی مٹی ایک بار پھر اندر کی طرف دھنسنے لگی۔

"دیکھو قبر دھنس رہی ہے دھنس رہی ہے قبر"

مرید نے چیخ ماری اور ڈیرے کے طرف بھاگنے لگا۔

میں چپ چاپ جھونپڑی کے پاس بیٹھا رہا قبر آہستہ آہستہ ہونے لگی پھر مٹی اندر کی طرف دھنسنے لگی اور تھوڑی دیر بعد جہاں پہلے قبر تھی وہاں ایک گڑھا پڑ گیا میں کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا۔ اتنے میں اسمان پر ایک کالی گدھ تاروں بھرے اسمان پر لمبے لمبے چکر لگانے لگی آہستہ آہستہ پہلے وہ دائروں میں اڑتی رہی پھر اس نے آٹھ کے ہندسے جیسی اڑانیں اختیار کر لیں اندھیرا بہت ہو چکا تھا لیکن کالی گدھ صاف نظر آرہی تھی دھنسی ہوئی قبر سے نگاہیں اٹھا کر میں نے غور سے اس کو دیکھنا شروع کیا۔

دور دور تک پھیلا ہوا تاروں بھرا آسمان اور ایک کالی گدھ جو پرواز میں نیچے اتر رہی تھی آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں فاسفورس جل رہی تھی دو ننھے ننھے بلب بغیر پر پھڑ پھڑائے چہرہ نیچے کیے کالی گدھ دھنسی ہوئی قبر کی طرح اتر رہی تھی انچ انچ ملی میٹر آہستہ آہستہ۔

میں شہر کے مشہور رسکائی ٹرسٹ کے کلنک سے باہر نکل رہا تھا کہ مجھے آفتاب سڑک پر نظر آیا وہ بھی سیاہ کار سے اتر رہا تھا ہم دونوں بے ساختگی سے بغلگیر ہوئے اور درخت کے نیچے کھڑا ہو کر باتیں کرنے لگے۔ پھر یکدم جیسے آفتاب کو کچھ یاد آ گیا۔ وہ بھاگ کر کار تک گیا پچھلا دروازہ کھول کر اس نے ایک دس سال کے بچے کو باہر نکالا بچہ سہما ہوا اور کمزور تھا اس کا سر باقی دھڑ سے اور آنکھیں چہرے سے بہت بڑی

تھیں آفتاب نے اسے بازو سے پکڑ کر سڑک کراس کرائی اور پھر مجھ سے مخاطب ہو

کر بولا ''میں ذرا اسے ویٹنگ روم میں بٹھا آؤں تم مت جانا پلیز۔''

جب آفتاب واپس لوٹا تو اس کا چہرہ پہلے سے بھی پریشان تھا۔

''کیا تم مستقل طور پر پاکستان آ گئے ہو؟'' میں نے سوال کیا۔

''وہاں بیوی Hsndicaped بچے کے ساتھ گزارا مشکل تھا۔''

''کیا مطلب؟''

اس کے بیٹے میں کچھ ایسی بات تھی جسے دیکھ کر میں پہلے سے ہی گھبرا گیا تھا۔

''میرا بیٹا افراہیم ذہنی طور پر کچھ نارمل نہیں ہے وہاں لندن میں میڈیکل

سہولتیں تو بہت تھیں لیکن وہاں کی تعلیم کلچر رنگ و نسل کا امتیاز وہاں اتنی

ساری Adjustment ایبنارمل بچہ کیسے کر سکتا ہے۔''

''ہو کیا ہے بچے کو؟''

''اسے خواب آتے ہیں یہ عجیب عجیب خواب دیکھتا ہے پہلے یہ موٹا تازہ

تھا پھر ان خوابوں کی وجہ سے اس کا وزن گھٹنے لگا آدھا آدھا گھنٹہ ایک ہی

پوزیشن میں بیٹھا رہتا ہے ڈاکٹر کہتے تھے کہ یہ Catatonic حالت ہے۔''

آفتاب کی آواز اور آنکھوں میں آنسو تھے۔

''افراہیم کہتا ہے کہ اس نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا ہے وہ اپنے آپ کو

دنیا کا نجات دہندہ سمجھتا ہے کبھی کبھی وہ فرفر عربی بولنے لگتا ہے کبھی

عبرانی میں باتیں کرتا ہے میں اس کے خوابوں سے تنگ آ گیا ہوں قیوم

وہ کہتا ہے کوئی فرشتہ اسے پھل کھلانے آتا ہے۔''

تھکنے کے ساتھ آفتاب نے یوں ٹیک لگا لی جیسے جسم کا بوجھ اس کے لیے اٹھانا

ناممکن ہو۔

''یہ سب کس چیز کی سزا ہے؟ کیا مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے کیا میرے

باپ دادا کے گناہوں نے اسے گھیرے میں لے لیا ہے۔"

کیا واقعی باپ دادا کے گناہ Gene mutation کی صورت میں افراہیم پر اثر انداز ہوئے تھے کیا اس کے آبا اجداد نے کیا آفتاب نے کبھی رزق حرام سے اپنے Genes کی ساخت کو اس حد تک متاثر کر دیا تھا کہ آنے والی نسلوں میں دیوانہ پن ظاہر ہونے لگا تھا؟

چھوٹا سا افراہیم دیوانگی کو ورثے میں لایا تھا؟

وہ عشق لاحاصل کے نتیجے کے طور پر تو دیوانہ نہ ہوا تھا؟

جستجو کے انبار بھی اس کی دیوانگی کا باعث نہ تھے۔

پھر پھر؟

کیا موت کا خوف چھوٹے سے بچے کو ہو سکتا ہے؟

ہم دونوں خاموش کھڑے رہے۔

"یہ کس بات کی سزا ہے قیوم بتاؤ۔ تم ہماری جماعت میں سب سے ذہین تھے بتاؤ یہ کس جرم کی سزا مل رہی ہے مجھے؟"

ہم دونوں پھر خاموش ہو گئے۔

"تمہارا کیا خیال ہے کیا بددعا میں اتنا اثر ہے......" آفتاب نے مجھ سے سوال کیا۔

"نہیں یہی ایسی نہیں تھی——" میں نے اسے تسلی دی

اس وقت وہ زرد رو لڑکا کلینک سے باہر نکلا اور برآمدے کے ستون سے لگ کر کھڑا ہو کر آسمان کو تکنے لگا اس کا چہرہ آنکھوں کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا اور سر جسم کے تناسب سے بہت بڑا تھا وہ چھوٹا سا لڑکا عجیب طور پر یہی سے مشابہ تھا......

"اب یہ اسی طرح کھڑا رہے گا آدھا گھنٹہ پونا گھنٹہ سارا دن۔"

میں نے آفتاب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر آہستہ سے کہا...... "آفتاب جو لوگ

اپنے اپ کو نارمل سمجھتے ہیں انہیں دیوانگی سے بہت ڈر لگتا ہے...... میں بھی نارمل ہونے کی کوشش کر رہا ہوں کیونکہ اس جسم کے ساتھ مادی زندگی بسر کرنے کا یہی آسان طریقہ ہے...... اسی لیے یہاں آتا ہوں کلنک پر...... لیکن دیوانگی نے انسانیت کو سب کچھ عطا کیا ہے۔۔۔ ہر دیوانے آدمی نے...... دیوانگی کی ایک اور رجہت ہے...... صرف ہم کو اس کا ادراک نہیں ہے...... جس طرح جسم کی بیماری سے ہم خوفزدہ ہوتے ہیں تو ہسپتال کو دوڑتے ہیں ڈاکٹروں کی طرف بھاگتے ہیں...... روح جب لنگڑی لولی ہوتی ہے تو ہم ایسے ہی خوف زدہ ہوتے ہیں حالانکہ جب روح روح Boundry کراس کر جاتی ہے تو انسانیت کے لیے یہی دیوانہ پن رحمت بن جاتی ہے...... میں اس سارے دائرے پر گھوم چکا ہوں...... یقین مانو آفتاب...... ہر دیوانگی پاگل پن نہیں ہوتی نہیں ہوتی...... نہیں ہو تیمر دیوانہ آدمی تنگ انسان نہیں ہوتا۔"

"تھینک یو تھینک یو...... تھینک یو۔"

"جس طرح بیماری موت کی وادی میں اترتی ہے...... جسم ریخنت کا شکار ہو کہ اسرار کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے ایسے ہی دیوانگی۔۔۔ انتہا کی ہو تو رعفان کی سرحدوں کو چھونے لگتی ہے پھر مادہ شکل میں بیکار ہو جاتا ہے...... تم اعتبار کرو تمہارا افراہیم پاگل نہیں یہ ہے ایک اور سمت میں دیکھ سکتا ہے اس کی وہ کھڑکیاں کھل رہی ہیں...... جو عام صحت مکند نارمل آدمی میں بند ہوتی ہیں...... یہ دونوں ابروؤں کے درمیان میں سے دیکھ سکتا ہے تم اسے عرب کے صحراؤں میں لے جاؤ...... وہاں اس کے لیے بہت کچھ ہے...... اسے شیر سے مشابہ جبل النور کے سامنے لے جانا...... یہ تمہیں اس پہاڑ کو دیکھتے ہی وہ سب کچھ بتا دے گا...... جو کوئی ماہر نفسیات آج تک نہیں بتا سکا...... جو کوئی سائنس دان سوچ بھی نہیں سکا...... چاہو تو اسے رفتہ رفتہ سیڑھی سے اتار کر عام پاگل خانے میں۔۔۔ ان پاگلوں کے ساتھ بند کر دینا جو مادی دنیا پر بوجھ ہیں

ہو سکے تو اسے ...... اسے وہاں لے جانا جہاں لو ہے کے ہم شکل پہاڑ ہیں سارے میں عصر کے وقت گلابی ہوا چلتی ہے ...... خدا کے لیے یقین کرو جسم کی بیماری دو قسم کی ہوتی ہے ایک بیماری وہ ہے جو ...... جسم کو لاغر نحیف کرتی ہے دوسری بیماری سے شفایاب ہونے پر انسان دوگنا تندرست ہوتا ہے اور دیر تک تندرست رہتا ہے جیسے جسم میں تازہ خون شامل ہو گیا ہو ...... دیوانہ پن بھی دو طور کا ہے یک پاگل پن کی وہ قسم ہے جس سے روح قلب دماغ سب کمزور ہوتے ہیں ...... دوسرا دیوانہ پن وہ ہے ...... جس سے روح میں توانائی آتی ہے وہ ایک ہی جست میں کئی کئی منزلیں پار کرتی ہے ...... خدا کے لیے مجھ پر یقین کرو ...... تمہارے بیٹے کا دیوانہ دوسری قسم ہے ...... میرا ایمان ہے۔"

اس وقت افراہیم ہم دونوں کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد تھا آفتاب نے میرا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے کہا ...... "اسے دورہ پڑنے والا ہے میں جانتا ہوں۔"

"وہ دیکھیے ابو وہ دیکھیے آپ کو گنبد نظر نہیں آتا ...... آنٹی اقبال نے جو ساڑھی امی کو دی تھی اس کا رنگ کا ...... Greenish blue ...... ابو آپ کو نظر نہیں آتا وہ گنبد ...... اس کے Done کے نیچے چودہ طاق ایک طرف ...... اور ...... وہ دیکھیے ابو کبوتر اڑ رہے ہیں مدینے کی سڑکوں پر لوگ بھاگ رہے ہیں اس گنبد کی طرف ...... روسی امریکی ...... افریقی ...... اذان ہو رہی ہے ابو ...... آپ کو لوگ بھاگتے ہوئے نظر نہیں آتے؟ کیا آپ واقعی اذان کی آواز نہیں سن سکتے ...... وہ دیکھیے ...... چار موذن ایک وقت میں اذان دے رہے ہیں ...... آپ نہیں سن سکتے کیا؟"

"یہ بچہ مدینے شریف گیا ہے؟"

آفتاب نے نفی میں سر ہلایا۔

"ہم لندن سے سیدھے یہاں آ رہے ہیں۔"

”وہ دیکھئے ابو وہ......ابو......دیکھیے کون اتر رہا ہے چاند سے؟“ ہم دونوں نے چاند کی طرف دیکھا عصر کے وقت کا پھیکا چاند آسمان پر گم سم بیٹھا تھا جیسے افراہیم نے اس کا کوئی بہت بڑا بھید فاش کر دیا ہو۔

اس وقت کنک کی عمارت کے پیچھے سے اذان کی آواز فیڈ ان ہونے لگی آفتاب نے جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھوں پر دھر لیا افراہیم کچھ دیر کانپتا رہا اور پھر منہ کے بل سجدے میں گر گیا۔

افراہیم خوابوں کی آخری سیڑھی پر سربسجود تھا۔

میں پاگل پن کی پہلی اور اسفل ترین سیڑھی پر مجبوب کھڑا تھا۔

اور ہم دونوں کے درمیان انسان کا مسئلہ ارتقاء کھنچی کمان کی مانند تنا ہوا تھا انسان کو ایب نارمل سے سوپر نارمل تک پہنچنے کے لیے جانے ابھی کس کس منزل سے گزرنا ہے؟

---------- ختم شد ----------